خلاصہ

ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی کا عرفانی ادب

مقالہ برای پی۔ ایچ۔ ڈی

استاد رہنما
پروفیسر سیّد نبی ہادی
سابق صدر شعبۂ فارسی

مقالہ نگار
افتخار النبی احمد مدنی
ریسرچ اسکالر

شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۹۸۷ء

خلاصہ

ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی کا فارسی ادب

یہ مقالہ مقدمہ کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں محمد بن سام غوری کے داخلہ کے ساتھ ساتھ صوفیای کرام کا بھی ایک گروہ داخل ہوا اور ان صوفیای کرام نے یہاں پہونچکر دین اسلام کی توسیع و اشاعت کی ذمہ داری انجام دی اور یہاں کے باشندوں کو اسلام کے قریب لانے کا ذریعہ بنے یہ ضرور ہے کہ اس موقع پر صوفیای کرام کے ساتھ ساتھ علماء دین نے بھی اس کام میں انکا ہاتھ بٹایا۔ اسکے باوجود صوفیای کرام نے یا انکے معتقدین میں سے کسی نے اس بات کا دعوی یا اظہار نہیں کیا کہ جس سے یہ اندازہ ہو کہ انہوں نے اسلام کی توسیع و اشاعت کے سلسلے میں جدو جہد کی ہے۔ اسکے برعکس ترک حملہ آوروں نے یہاں آکر سیاسی اقتدار تو ضرور حاصل کیا لیکن اس دور کے مورخین کا یہ نظریہ کہ "اسلام بھی ان ہی حملہ آوروں کے ذریعہ ہندوستان میں پھیلا" حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ ترک حملہ آوروں کا بنیادی مقصد ہندوستان میں فرمانروائی، ملک گیری اور جہانبانی تھا۔ انہوں نے مسلم رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے اپنے نام کے ساتھ ایسے القابات استعمال کئے جن سے

یہ تاثر پیدا ہوا کہ وہ غازیانِ اسلام ہیں اور فتوحات کا سلسلہ دراز کرنے سے انکا مقصد اسلام کی توسیع و اشاعت ہے۔ صوفیائے کرام کا مقصد ہندوستان میں غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی ایک یادگار شکل پیش کرنا تھا وہ اپنی سادگی خاکساری اور دردمندی کے ذریعہ عوام سے ایک گہرا تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔ انکا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنی سادگی انکساری اور نیازمندی سے ہندوستان میں بشردوستی کا پیغام عام کریں تاکہ غیر مسلموں کے دل میں اسلام اور مسلمانوں سے جو نفرت کا جذبہ ہے وہ ختم ہو جائے اور وہ اسلام کے قریب آسکیں یہی وجہ ہے کہ انکی خانقاہوں کے دروازے ہندو مسلمان، جوگی، قلندر، امیر و غریب بےکس و مظلوم انسانوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہتے۔ انکے نزدیک خدمت خلق کو عبادت کا درجہ حاصل تھا اور وہ اسلام کے پیش کئے ہوئے نظریہ "وحدتِ انسانی مساوات" پر عمل پیرا رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ انکی خانقاہوں میں پہونچکر مظلوم و بےکس انسان اپنے درد کی دوا پاتے۔

تھیسس کے پہلے باب یعنی "تیرھویں صدی عیسوی کا معاشرتی ماحول اور تاریخی ماخذ" میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں بارھویں صدی عیسوی کے اختتام تک اہم امور یہ تھی کہ وسط ایشیا کے مسلمان ترک ایک سیاسی طاقت بنکر ہندوستان میں داخل ہو رہے تھے۔ ترک زندہ دل آزاد طبع کے مالک تھے انکے اندر بہادری اور شجاعت کا جوہر بھی موجود تھا۔ انہوں نے

اپنی ان دونوں صفات کو جس انداز سے سیاسی میدان میں استعمال کیا اور جو سیاسی
مقاصد حاصل کئے ان کے مختصر ذکر کے بعد ترکوں کے تہذیبی اکتساب اور ذہنی کارناموں پر توجہ
دی گئی ہے۔ ترکوں نے اپنی کوشش سے فارسی زبان کو ایک عالمی زبان بنا دیا اور اس کا
دامن بحر روم سے لے کر بحر الکاہل تک پھیلا دیا۔ دنیا کی دو [illegible] تہذیب کے
خادم کی حیثیت سے بھی ایک بڑی جگہ دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ترک ایرانی تہذیب اور تمام
ترقی یافتہ اداروں کو اپنے ساتھ لیکر داخل ہوئے تھے۔ اس ذکر کے بعد ہندوستان کی اسلامی
سلطنت پر روشنی ڈالنے والی سب سے ابتدائی کتابوں اور اہم ماخذوں کا ذکر ترتیب کے
ساتھ کیا گیا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر تاریخی کتابیں سیاسی امور اور جنگ و جدال
کے معاملات اور فتوحات و فرمانروائی پر زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ دوسرے ماخذوں کی غیر موجودگی
میں ان ہی کتابوں کے مطالعہ سے معاشرتی سرگرمیوں کے جو اشارے ملتے ہیں انکا ذکر کیا گیا ہے۔

باب دوم "تیرھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا اور ایران کی صورتحال اور
ہندوستان پر اسکے اثرات" پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ تیرھویں صدی
عیسوی کے ہندوستانی صوفیوں کا براہ راست رابطہ وسط ایشیا اور عالم اسلام کے دوسرے
مقامات کے صوفیوں سے قائم تھا۔ بدقسمتی سے یہی دور وحشی تاتاریوں کے حملے کا ہے جس نے

پورے عالم اسلام کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ بغداد جو اسلامی تہذیب کا مرکز تھا
وہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا۔ اس تباہی کے نتیجے میں یا دیگر اسباب کی بنا پر جو خالص
اجتماعی یا فکری نوعیت کے ہو سکتے ہیں اسلامی دنیا کے وہ عرفانی سلسلے ختم ہوگئے یا کمزور
پڑ گئے جو قبل سے سرگرم عمل تھے اور جن کا ذکر صاحب کشف المحجوب نے کیا ہے۔ تاتاریوں
کے حملے سے طریقت کے جو بڑے بڑے مراکز متاثر ہوئے انکا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے پھر
ان سلسلوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی تنظیم تیرھویں صدی عیسوی یا اس سے کچھ عرصہ قبل ہوئی
اور جنکے مشائخ ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی یا اسکے آغاز سے کچھ عرصہ بعد تشریف لائے اور
جنکے اثرات آج تک برقرار ہیں۔

باب سوم "تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام" میں ان صوفیائے کرام
کا تعارف کرایا گیا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے بیشتر صوفیائے کرام ہندوستان سے باہر طریقت
کے اہم مراکز کے تربیت یافتہ تھے۔ طوالت سے بچنے کے لئے یہ احتیاط کیا گیا ہے کہ سلسلہ
تحقیق ان ہی بزرگوں تک محدود رکھا جائے جو اس صدی کے اواخر میں وفات پا گئے
اور اس صدی کی نامور ہستیوں میں شمار کئے گئے حتی کہ آج تک انکی شہرت برقرار ہے۔ انکی
زندگی اسلامی تعلیمات کا ایک اثر انگیز نمونہ تھی وہ نہایت سادگی، انکساری اور
افلاس کی زندگی گذارتے تھے اور ترک دنیا کے مقصد سے کبھی دور نہ جاتے تھے

انکو خلق خدا سے محبت تھی اور وہ سب انسانوں کے ساتھ [illegible] انکسار اور دردمندی سے پیش آتے تھے ان بزرگوں سے منسوب کرامات اور خوارق عادات کی جو داستانیں آج مشہور ہیں وہ حقیقت میں بیشتر بعد کے عقیدتمندوں کی من گھڑت ہیں زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ عقیدتمندوں نے بہت ساری جھوٹی داستانیں ان بزرگوں سے منسوب کر دیں۔

باب چہارم "تیرھویں صدی عیسوی کی عرفانی تالیفات" کے نقد و تبصرہ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں تقریباً تیس کتابیں اور رسالے ہمارے مطالعہ کا موضوع ہیں جو ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں مختلف ناموں سے موجود ہیں صوفیوں کی تالیفات کو اس باب میں دو زمروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی اصلی تالیفات اور جعلی تالیفات۔ اصلی تالیفات کی تعداد جو واقعی اس دور کے صوفیای کرام کی کوششوں کا نتیجہ ہے کچھ زیادہ نہیں ہے جعلی تالیفات ایسی کتابوں پر مشتمل ہیں جنکو تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیای کرام سے منسوب کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ بعد میں لکھی گئی ہیں ایسی تالیفات کی تعداد خاصی ہے۔ نیز اس باب میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ کیا عوامل اور محرکات تھے جنکی بناء پر بے شمار جعلی تالیفات وجود میں آئیں اور صوفیای کرام کے ناموں سے منسوب ہو کر پڑھی جانے لگیں البتہ اسکا اثر یہ ہوا کہ صوفیوں کے بارے میں عوامی عقائد اور نظریات میں فرق آگیا بیشتر تالیفات میں صوفیای کرام کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جو حقیقت سے مشابہت نہ رکھتی تھی۔

افتخار الٰہی احمد بدرانی
علیگڑھ اپریل ۱۹۸۶ء

فہرست مضامین

صفحہ

مقدمہ

باب اوّل

تیرھویں صدی عیسوی کا معاشرتی ماحول اور تاریخی مآخذ ۱۲

باب دوم

تیرھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا اور ایران کی صورتحال اور ہندوستان پر اس کے اثرات ۸۳

باب سوم

تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام ۱۳۲

باب چہارم:

تیرھویں صدی عیسوی کی عرفانی تالیفات

(۱) اصلی تالیفات ۲۶۲

(۲) جعلی تالیفات ۲۸۹

کتابیات ۳۶۹

یہ تحقیقی رسالہ ہندوستان میں عہد سلطنت کے روحانی اور اخلاقی نظام کی اس راہ پر روشنی ڈالنے کے لئے لکھا گیا ہے جسکو بطور مجموعی تصوف کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں تیرھویں صدی عیسوی کا زمانہ ایک غیر معمولی تحوّل اور تغیر کا دور شمار ہوتا ہے محمد غوری اور پرتھوی راج چوہان کی آویزش یعنی مشہور جنگ ترائن ۵۸۸/۱۱۹۲ کو ایک دہائی کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز ہوگیا اور ہندوستان کا سیاسی منظر آنے والی صدیوں کے لئے مکمل طور سے بدل گیا اس بر اعظم میں ترک حملہ آوروں نے سیاسی اقتدار ضرور حاصل کیا مگر ہندوستانی مورخین کا پیش کیا ہوا یہ تصور کہ اسلام بھی ہندوستان میں ان ہی حملہ آوروں کے ذریعہ داخل ہوا واقعیت پر مبنی نہیں ہے ہندوستان میں اسی مرحلہ پر صوفیائے کرام بھی باہر سے داخل ہوئے اور انہوں نے شمالی ہندوستان خصوصاً ملتان، لاہور، اجمیر اور دہلی میں روحانی مراکز قائم کئے ہندوستان میں اسلام کا تعارف کرانے والے اصل میں یہی صوفیائے کرام تھے۔

مورخین کی غلط فہمی، اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو بیجا نہیں ہے، ہوا یہ کہ صوفیائے کرام اور ترک اہل سیف کا داخلہ بالکل ایک ساتھ ہوا۔ ترکوں کی سیاسی

عظمت و شوکت و دبدبہ سلطنت کی داستانیں اس حد تک جاذب نظر بن گئیں اور ان

داستانوں سے عوامی ذہن اس طرح متأثر ہوئے کہ صوفیوں اور درویشوں کی سرگرمی کی طرف

عام نظریں اچھی طرح نہیں جا سکیں ترکوں کا بنیادی مقصد ہندوستان میں فرمانروائی

ملک گیری اور جہانبانی تھا مگر مسلم رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنائے رکھنے کے لئے انہوں

نے اپنے لئے ایسے القاب استعمال کئے جن سے یہ تأثر پیدا ہوا کہ وہ غازیان اسلام ہیں

اور فتوحات کے سلسلہ دراز کو جاری رکھنے سے انکا مقصد اسلام کی تبلیغ و توسیع ہے ان

القاب نے ترکوں کے عسکری حوصلے اور ہوس پر پردہ ڈال دیا۔ دوسری بات یہ کہ تاریخی

ماخذوں کے مطالعہ سے صریحی طور پر واضح ہوتا ہے کہ مورخین خالص سیاسی نکتہ نظر سے

تاریخ لکھ رہے تھے ترکوں کے ہندوستان میں ورود کے بعد سب سے پہلا مورخ حسن نظامی نیشاپوری

ہے جس کی کتاب تاج المآثر کا لہجہ کتاب کے ہر صفحہ پر فتح کی مسرت اور سیاسی

کامیابی کی آفریں سے گونجتا ہے اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں اس سوال کا جواب نہیں

ملتا کہ معاشرہ میں کیا خاموش تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں حسن نظامی کا بار بار اس بات

پر زور دینا کہ غازیوں نے کفار کے بت خانے ٹھنڈے کر دئیے ہیں اور ہر جگہ اذان کی آواز

سنائی دیتی ہے اور اسلام کا جھنڈا بلند ہو گیا ہے سراسر مبالغہ پر مبنی ہے اور اگر یہ

کہا جائے کہ مورخ کا اس قسم کا کوئی جملہ بھی لاف و گزاف سے پاک نہیں ہے تو

بیجا نہ ہوگا حسن نظامی نیشاپوری کے بعد دوسرے مورخین کے اسلوب میں اس قدر بلند آہنگ
دعوؤں کا طومار تو نہیں ہے اور بعد کے مورخین کا لہجہ سنجیدگی سے زیادہ قریب ہوتا ہوا نظر
آتا ہے البتہ یہ رجحان بیشتر واضح ہے کہ وہ سیاسی تاریخ لکھ رہے ہیں اور انکی نظر امور
سیاست سے ہٹ کر معاشرہ کے تعمیری اور پرامن عوامل کی طرف بہت کم جاتی ہے تیسری
بات جو زیادہ عبرت انگیز ہے وہ یہ کہ صوفیای کرام کے عقیدتمندوں نے ایک ایسے ادب کی تخلیق
کی اور ایسی کتابوں کا ذخیرہ لگادیا کہ ان کتابوں نے صوفیای کرام کی اصلی تصویروں کو خاصا
مسخ کر دیا انکی سرگرمیاں صحیح پس منظر میں سامنے نہیں آئیں اور انکا طریقۂ کار جس میں
انتہائی وسیع القلبی اور بشردوستی کو نہایت گہرا دخل تھا روشن ہوکر سامنے نہ آسکا زیر نظر مقالے
میں علحدہ ابواب کے اندر ان تینوں عوامل کو زیر بحث لایا گیا ہے

اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں جیسے ہی تصوف کی تحریک رونما ہوتی
ہے اسی زمانے سے طریقت اور شریعت کا فرق بھی رونما ہوکر سامنے آجاتا ہے عہد اوائل
کے بہت سے صوفیای کرام مثلاً حسین ابن منصور حلاج (۳۰۹ھ/۹۲۱ء) کی زندگی اس بات
پر دلالت کرتی ہے کہ اسلامی شریعت اور طریقت متوازی راہ پر چلنے کے باوجود ایسے
مرحلوں سے دوچار ہوتی رہی ہے جہاں پر اتحاد کی راہیں برقرار نہیں رہ سکیں اور
دونوں کے راستے جدا ہوگئے[1] ہندوستان میں صوفیای کرام کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں

۱ء ~~مقدمہ تاریخ ... ص ۲~~ ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران ج ۱ ص ۲۵۵

نے حتی المقدور شریعت اور طریقت کو ٹکرانے سے بچایا اور جب بھی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو انہوں نے نہایت دانشمندی کے ساتھ اتحاد و مفاہمت کے عمل کو برقرار رکھا

ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی میں تصوف کے دو سلسلوں کا اثر و نفوذ پھیلتا ہوا نظر آتا ہے یہ چشتی اور سہروردی سلسلے ہیں ان دو کے علاوہ باقی سلسلوں کی نشو و نما ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی کے بعد ہوتی ہے ان دونوں سلسلوں کے اکابرین کی شخصیت کا مطالعہ تحقیق کے طالب العلموں کے لئے ہمیشہ سے دلکشی کا باعث رہا ہے اور آئندہ بھی جستجو کی دعوت دیتا رہیگا۔ صوفیای کرام کے کارنامے نہ صرف ادب اور تاریخ کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں بلکہ فلسفہ اور عمرانیات کے میدانوں سے دلچسپی رکھنے والے دانشمند بھی انکی سرگرمیوں کے اثرات سے صرف نظر نہیں کر سکتے مجموعی طور سے صوفیای کرام کے کردار پر متعدد سمتوں سے روشنی ڈالی جا سکتی ہے یہ مقالہ اسی نوعیت کی ادنی سی کاوش ہے۔

ہندوستان میں عہد قدیم سے ایک عقیدہ بہ عنوان ویدانت مقبول و متعارف تھا اس عقیدہ میں توحید کا تصور صراحت کے ساتھ موجود ہے ہندو دانشمند جو ویدانت کے فلسفے سے واقف تھے خصوصًا وہ اہل ریاضت جو اس عقیدے کی عملًا مشق اور پیروی کرتے تھے انکے لئے ابتدائی مسلمان صوفیوں کی زندگی اور تعلیمات کا مشاہدہ یقینًا خاص دلچسپی کا باعث تھا صوفیوں نے ہندوستان میں وارد ہوکر معاشرتی سطح پر ہمواری اور

فکری آہنگی کا ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ترک حملہ آوروں کی بالادستی نے حاکم و محکوم کے
درمیان جو طبقاتی فرق اور ایک طرح کی جذباتی منافرت کا ماحول پیدا کردیا تھا صوفیوں کی
موجودگی نے یقیناً اس ماحول کو بدلا اور اطمینان کی بات ہے کہ صوفیائے کرام کی کوششیں بڑی
حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔[1] خواجہ معین الدین چشتی اور انکے خلفاء وحدت الوجود کی اصلیت
اور غایت سے خوب واقف تھے مگر انکے یہاں اس عقیدے پر زور نہیں ملتا البتہ اسلام نے
جو وسیع تر انسانی مساوات کا تصور پیش کیا ہے اسکو سامنے رکھ کر چشتی صوفی غیرمسلموں
سے خصوصاً غریب اور پس ماندہ طبقہ کے غیر مسلم عوام سے نہایت شفقت اور رواداری
کا سلوک کرتے تھے۔ انکی خانقاہوں میں بغیر امتیاز مذہب و ملت تمام لوگوں کا داخلہ
عام تھا[2] اور وہ خلق خدا کو ودیعت الٰہی سمجھنے کی ہمیشہ تاکید کرتے تھے۔ ہندو جوگیوں
اور برہمنوں سے دوستی محبت اور اعتماد کی فضا میں تبادلہ خیال کرنا انکو اپنی
خانقاہوں میں بلانا اور اگر کوئی آزاد جوگی سیاحت کرتا ہوا خانقاہ میں آ نکلا تو
اسکا استقبال کرنا صوفیوں کی عام اور معروف روایت تھی وہ قصے جن میں صوفیوں
کو جوگیوں کے ساتھ مناظرہ اور مناقشہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے ایسی کتابوں میں
نظر آتے ہیں جنکی صداقت واضح طور سے محل نظر ہے۔ صوفیوں کے اخلاق اور انکی
انکساری سے یہ بات سراسر بعید ہے کہ وہ ہندو جوگیوں کو دیکھ کر ان سے ... بیزار

1. life and time of Shaikh Fariduddin Ganj Shakar P 105 2. Sufis of Bijapur P 155-156

اور بر افروختہ ہوتے تھے یا انکے مسلک کو اپنی تنقید، تردید اور اعتراض کا ہدف بناتے

تھے۔ انکی وسیع القلبی اور اخلاق کی بلندی کا تقاضا یہ تھا کہ جہاں اختلاف بھی ہوتا تھا وہ اس

سے صرف نظر کرنا ضروری سمجھتے تھے اور اختلافی امور پر خاموش ہوجاتے تھے صوفیوں نے اسلام

کی نہایت ہی دلکش اور پروقار تصویر پیش کی ہے اور اسلام کی آبرو غیر مسلموں کے نظر میں

بلند کرنے کا نہایت کامیاب تجربہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

زیر نظر مقالہ مجموعی طور سے چار ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ان تاریخی

ماخذوں کی جانچ کی گئی ہے جنکے وسیلے سے ہندوستان کی معاشرتی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ اکثر تاریخی آثار سیاسی امور اور جنگ و جدال کے معاملات

و فتوحات اور فرمانروائی کے موضوعات پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ البتہ دوسرے ماخذوں کی

سراسر غیر موجودگی میں ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ان ہی کتابوں کو دقت نظر

سے پڑھیں اور معاشرتی سرگرمیوں کے ضمنی اشارے جہاں بھی نظر آتے ہیں ان سے استفادہ

کریں پہلے باب میں ان کتابوں کے تعارف کی ذمہ داری انجام دی گئی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کے ہندوستانی صوفیوں کا براہ راست رابطہ وسط ایشیا

اور عالم اسلام کے دوسرے مقامات کی خانقاہوں سے اور وہاں کے روحانی بزرگوں

سے مسلسل قائم تھا۔ بدقسمتی سے یہی دور وحشی تاتاریوں کے حملے کا ہے جنہوں نے

پورے عالم اسلام کو نیست و نابود کرکے رکھ دیا۔ تاتاریوں کا ہلاکت خیز سیلاب تیرھویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کے خاتمہ سے قبل چنگیز خاں کی رہنمائی میں بلند ہوا اور چنگیز خاں کے بعد اسکے بھتیجے ہلاکو خاں کے ذریعہ ترکستان سے بغداد کی طرف برابر بڑھتا رہا یہانتک کہ تیرھویں صدی عیسوی کے نصف اول کے خاتمہ تک بغداد جو اسلامی تہذیب کا مرکز تھا مکمل طور سے تباہ ہوگیا ہندوستان میں تقریبًا اسی زمانے میں صوفیوں کی خانقاہوں کا قیام خلق خدا کے لئے بہت بڑی خیر و برکت کا باعث ہوا اور تاتاریوں کی تباہی سے پناہ لینے کی خاطر بے شمار لوگ ہندوستان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئے یہاں کے صوفیوں کی خانقاہیں مصیبت زدہ مسافروں کے قیام کا بہترین ٹھکانہ ثابت ہوئیں ان خانقاہوں کو باہر سے آئے ہوئے لوگوں نے اپنا ملجا و ماوی سمجھا۔ صوفیائے کرام ان ستم زدہ اور پریشان حال مہاجرین کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرکے حکومت کی دستگاہوں میں جگہ جگہ روزگار کا انتظام کرتے تھے اور ان بزرگوں کی بدولت بے شمار لوگ اپنی زندگی کو از سر نو مرتب کرنے کا موقع پاتے تھے دوسرے باب کی ترتیب میں ان مسائل کو ملحوظ رکھا گیا ہے البتہ ہندوستان سے باہر کی خانقاہوں کے اخلاقی اور روحانی عقائد کا جو اثر یہاں کی نو تشکیل خانقاہوں پر مرتب ہوئے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے ۔

تیسرے باب میں تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام کا تعارف

کرایا گیا ہے۔ اس میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سلسلہ تحقیق صرف ان ہی بزرگوں تک محدود رکھا جائے جو اس صدی کے اواخر تک وفات پاگئے اور اس صدی کی نامور ہستیوں میں شمار کئے گئے۔ حتیٰ کہ انکی شہرت آج تک برقرار اور پائندہ ہے معذرت کے طور پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اگر تیرھویں صدی عیسوی کے ان تمام اکابر صوفیاء کو شامل کرلیا جاتا جنکی وفات اس صدی کے گذرنے کے بعد ہوئی یا جو اگلی صدی میں بھی بقید حیات رہے تو ہماری تحقیق کا دامن بہت وسیع ہوجاتا جس کی گنجائش اصول تحقیق کی بنا پر نہیں تھی عہد اوائل کے ہندوستانی صوفیائے کرام کی سوانح میں جو نکتہ خاص طور سے قابل توجہ ہے وہ یہ کہ انکی زندگی اسلامی تعلیمات کا ایک اثر انگیز نمونہ تھی وہ نہایت سادگی اور افلاس کی حالت میں زندگی گذارتے تھے اور ترک دنیا کے مقصد سے کبھی دور نہ جاتے تھے انکو خلق خدا سے محبت تھی اور وہ سب انسانوں کے ساتھ خلوص انکساری اور دردمندی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان بزرگوں کی بابت جو کرامات اور خوارق عادات کی داستانیں مشہور ہیں وہ دراصل بعد کے عقیدتمندوں کی من گھڑت ہیں اور ایسی کتابوں میں بیشتر نظر آتی ہیں جو جعل سازوں نے اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر لکھ کر عوام میں مشتہر کردی تھیں اصل بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں وارد ہونے والے سب سے پہلے صوفی خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی حیات کے بارے میں کوئی معاصر شہادت موجود نہیں ہے ان سے منسوب جو آثار ہیں وہ سب فرضی ہیں اور انکو خواجہ

سے منسوب کرنا تحقیق کی غلطی ہوگی۔ البتہ خواجہ کی زندگی میں جو تقوی تھا اور جسکا اظہار وہ خلق خدا کے ساتھ معاملات میں کرتے تھے اسکے اثرات اتنے گہرے ہوئے کہ خواجہ کی سیرت کے بارے میں لوگوں کے سینوں میں یادوں کا ذخیرہ موجود رہا اور وہ یادیں روایات کی شکل اختیار کرکے بعد کی نسلوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں۔ خواجہ کی شخصیت کو دلکش اور لافانی بنانے میں انکی انسان دوستی کا بڑا دخل تھا البتہ یہ قصہ کہ اجمیر کا راجہ رائے پتھورا کو خواجہ کی موجودگی گراں گذری تھی اور خواجہ نے اسکو بددعا دی تھی یہ سب بے بنیاد اور من گھڑت واقعات معلوم ہوتے ہیں خواجہ اجمیر میں ایک مثالی درویش کی طرح رہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے علاوہ اس باب میں چشتی اور سہروردی سلسلے کے دوسرے اہم عارفوں اور بزرگوں کی سوانح حیات پر توجہ صرف کی گئی ہے۔

چوتھا اور آخری باب جسکو تحقیق کا اصل موضوع سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا تیرھویں صدی عیسوی کے جملہ عرفانی آثار سے متعلق ہے اس میں اصلی تالیفات کی تعداد جو واقعی طور سے اس دور کے صوفیای کرام کی کوشش کا نتیجہ ہے اور انکی تراوش قلم سے وجود میں آئی ہیں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ البتہ ایسی تالیفات کو جنکو تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیوں سے منسوب کیا گیا وہ اگرچہ بعد میں لکھی گئی ہیں اور انکے لکھنے والے بھی سراسر مجہول اور غیر معتبر ہیں مگر ان کتابوں کے نفس مضمون کا جائزہ لینے کی خاطر یہ ناگزیر تھا کہ انکو بھی اس باب کے اندر محیط کر لیا جائے ایسی تالیفات کی تعداد خاصی ہے ہم نے تحقیق

ان تالیفات پر نظر ڈالنا مناسب سمجھا جو بہت زیادہ مشہور بلکہ کہنا چاہئے کہ خانقاہوں میں آج تک متداول ہیں تحقیق کی کوشش کو مزید واضح کرنے کی غرض سے اس باب کو دو ذیلی ابواب میں تقسیم کردیا گیا ہے پہلا ذیلی باب اصلی تالیفات کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے ذیلی باب میں جعلی تالیفات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

مجھے گذشتہ چند برسوں میں اپنی تحقیق کے سلسلے میں اور مآخذوں کی تلاش میں متعدد کتب خانوں میں جانے کا اتفاق ہوا خصوصیت سے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کتب خانہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، شبلی نعمانی لائبریری ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ میں ان تمام لائبریریوں کے ذمہ داروں کا اور خاص طور سے شعبۂ مخطوطات سے متعلق افراد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مآخذوں کی تلاش کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کی۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے شعبہ کے تمام استادوں کا اور اپنے دوستوں بالخصوص مولانا مسعود عالم قاسمی اور مولانا رضی الاسلام ندوی کا ذکر نہ کروں ان ہی لوگوں کی شفقت اور رہنمائی اور تعاون کی بدولت یہ رسالہ آج تکمیل کے مرحلہ تک پہونچ سکا۔ میں اپنے مشفق اور کرم فرما استاد رہنما پروفیسر سید نبی ہادی صاحب سابق صدر شعبہ فارسی کا بے حد شکر گذار ہوں کہ اس مقالے کی تیاری میں ہر ہر قدم پر انکی رہنمائی اور مدد حاصل رہی یقیناً انکے علم اور انکی لیاقت سے استفادہ کرکے میں نے اپنے کام کو خوب سے خوبتر بنانے میں کامیابی حاصل کی

مجھے پروفیسر نبی ہادی اور دوسرے مشفق استادوں کی خدمت میں مسلسل نشست کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ ایک فاضل استاد کی رہنمائی تحقیق کے نوآموز طالب العلم کو کس کس طرح بے شمار زحمتوں سے بچا سکتی ہے یقیناً ان بزرگوں کی بدولت میں جستجو کے بہت سارے دقائق اور عقائق سے بچ گیا جیسا کہ صوفیوں میں مشہور و معمول ہے کہ شیخ کامل کی رہبری برسوں کی راہ کو مہینوں سے طے کر دیتی ہے وہی بات میں اگر اپنے استاد رہنما پروفیسر نبی ہادی اور دیگر مشفق استادوں کے بارے میں کہوں تو مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔

افتخار النبی احمد مدنی

شعبہ فارسی
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
اپریل ۱۹۸۷ء

باب اول

تیرھویں صدی عیسوی کا معاشرتی ماحول اور تاریخی مآخذ

ہندوستان میں بارھویں صدی کے اختتام پر بظاہر صورتحال یہ تھی کہ وسط ایشیا کے مسلمان ترک ایک سیاسی طاقت بنکر ہندوستان میں داخل ہو رہے تھے۔ سلطان محمد غوری اور پرتھوی راج کی آویزش نے (۱۱۹۲ء/ ۵۸۸) پورے شمالی ہندوستان کا نقشہ بدلکر رکھ دیا تھا اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلے سے لگاکر بندھیاچل تک تمام شمالی ہندوستان پر ترکوں کا سیاسی تسلط قائم ہوگیا تھا۔ مورخین کے نزدیک ہندوستان میں ترکوں کا داخلہ اور شہر دہلی کا سلطان کی تخت گاہ بن جانا ایشیا کی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ شمار ہوتا ہے۔ یقیناً اس تاریخی حادثہ نے خود ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر تقریباً نصف اسلامی دنیا میں رہنے والے لوگوں کی قسمت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ عالمی تاریخ کے عظیم حادثات کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک تو انکے اثرات صدیوں تک باقی رہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایسے حادثات پورے پورے براعظموں میں رہنے والی انسانیت کے مقدرات کا فیصلہ کر دیتے ہیں اور بے شمار انسانوں کی زندگیاں ان حادثات سے متاثر ہوتی ہیں یہ قاعدہ کلیہ سامنے رکھ کر ہم دیکھتے ہیں تو ہماری نظر میں جنگ ترائن ۱۱۹۲ء/ ۵۸۸ یعنی سلطان محمد بن سام غوری

کی فتح تاریخ عالم کا ایک عظیم سانحہ قرار پائی ہے اس وقت ترک ایک نیا ارادہ

اور نئی فکر لیکر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے یعنی وہ اس ملک کے مستقل حکمراں بنکر

رہینگے اور اپنے مفتوحہ علاقے پر اپنے تسلط کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دینگے البتہ جہانتک

مسلمانوں کے ہندوستان میں موجود ہونے کا تعلق تھا مذکورہ بالا واقعہ کوئی نئی چیز نہ

تھا مسلمان ہندوستان کے بعض شہروں میں بہت پہلے سے موجود تھے اور سب سے پہلے

محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کے ساحل پر آکر اترے (۹۳-۹۵ھ/۷۱۲-۱۳ء)

اور پورے سندھ کے متعدد مقامات پر پھیل گئے بلکہ اگر صاحب چچ نامہ کی روایت پر

اعتبار کیا جائے تو پنجاب کے کچھ حصے اور جموں اور کشمیر کی پہاڑیوں تک مسلمانوں

کا اثر و نفوذ پھیل چکا تھا۔ اسکے فوراً بعد بیرون ہند اسلامی تاریخ میں واقع

ہونے والے انقلاب کا اثر ہندوستان میں آباد مسلمانوں کی حالت پر بھی پڑا اور

انکی زندگیاں بھی باہر کے نشیب و فراز سے متاثر ہوئیں۔ البتہ ایک بات ضرور یاد

رکھنی چاہئے کہ اسلامی دنیا کی تاریخ میں بعض فکری اور مابعدالطبیعاتی تحریکیں بھی

وجود میں آنا شروع ہوگئی تھیں یہ عمل بنی امیہ کی حکومت کے اختتام (۱۳۲ھ/۷۵۰ء)

اور بنی عباس کی خلافت کے آغاز سے شروع ہوگیا تھا۔ یہ ایک علحدہ بات ہے کہ

ان فکری تحریکوں کی سطح کے نیچے پیچیدہ قسم کے سیاسی عوامل کام کر رہے تھے ۔ فی الحال ہم صرف ان تحریکوں کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں جن کے اثرات کی پرچھائیں ہندوستان تک میں محسوس ہوئی ۔ اسلامی معاشرہ کے جسد سالم میں سب سے پہلا اختلاف خارجیوں کی صورت میں نمایاں ہوا چونکہ خارجی فرقہ کے لوگ مشرقی اسلامی دنیا میں تشدد کا شکار تھے اور انکے لئے خاص انکے وطن میں زمین تنگ ہو چکی تھی اس لئے بنی امیہ کی حکومت کا خاتمہ ہونے کے بہت بعد تک خوارجی فرقہ کے مسلمانوں کی نو آبادیاں سندھ اور مغربی پنجاب کے بہت سے شہروں میں باقی رہیں۔ جب پوری اسلامی دنیا میں خارجی تحریک خود بخود کمزور ہو گئی تو ہندوستان میں بھی خارجیوں کی نو آبادیوں کے نشانات آہستہ آہستہ مدھم پڑتے چلے گئے ۔ اسلامی تاریخ کی چند صدیاں اور گذر گئیں اور بنی عباس کی مرکزی طاقت میں ضعف کے آثار نمودار ہونے لگے اس وقت عالم اسلام کے نصف یعنی مشرقی حصے میں سلجوقی ترک ایک طاقت بنکر ابھرے ۔ سلجوقیوں کے زمانے میں اسلامی معاشرے کو ایک دوسری اختلافی تحریک کا سامنا درپیش آیا یہ اسماعیلیہ کی تحریک تھی جسے قرمطی بھی کہتے ہیں جب مرکزی ایشیا اور خراسان میں اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے تشدد کا دباؤ

محسوس کیا تو انہوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو صدیوں پہلے خوارج اختیار کر چکے تھے
ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ اور پنجاب میں اسماعیلیوں نے اپنے اقتدار کے چھوٹے چھوٹے علاقے
مرکزی ریاستوں کی صورت میں قائم کر لئے تھے اور اپنا اصلی وطن ترک کر کے شمالی ھندوستان
کے علاقوں میں دور تک پھیل گئے جہاں وہ سواد اعظم کے تشدد اور دباؤ کے خوف سے
بے پروا آزادی اور عزت کی زندگی بسر کرتے تھے سب سے پہلا اسماعیلی داعی(۲۷۰ھ/۸۸۳ء)
میں سندھ میں آیا اور یہاں اپنے سیاسی اور مذہبی خیالات کی اشاعت میں مشغول
ہو گیا پھر دوسرے لوگ آتے رہے اور ان لوگوں نے ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں ملتان پر قبضہ کر لیا
اس طرح ہندوستان صدیوں پہلے سے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ یہ تو ان مسلمانوں
کی بات ہے جو اپنی سرزمین میں برپا فرقہ وارانہ اختلافات سے تنگ آ کر ہندوستان
کی حدود میں داخل ہوئے اور یہاں بس کر سکون و آرام کی زندگی کا مزہ چکھا۔ انکے
علاوہ دوسرے شہر بھی مسلمانوں سے بالکل خالی نہ تھے بلکہ وسط ایشیا کے مسلمان تاجر
ایک بڑی تعداد میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں آمد و رفت رکھتے تھے اصلی صورتحال
یہ تھی کہ اکثر و بیشتر شہروں میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں یا یوں سمجھئے
کہ خیمے لگے ہوئے نظر آتے تھے۔ سلطان محمد بن سام غوری اور اس سے قبل سلطان محمود غزنوی

کے درمیان کم وبیش ہونے دو سو برس کا فاصلہ ہے اس درمیانی عرصے میں بہت سی شہادتوں

سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی موجودگی ہندوستان میں اس عنوان اور ڈھب کے ساتھ

نظر آتی ہے جسکا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا یعنی محمد بن سام غوری کے داخلے کے

وقت ہندوستانیوں کے لئے مسلمان اجنبی نہیں رہ گئے تھے ہندوستان کے لوگ

مسلمانوں سے انکے دین اور عقائد سے انکے آداب و اطوار سے اور انکے قومی مزاج

سے ایک خاصی حد تک واقف ہوچکے تھے اور انکو بہت کچھ جان گئے تھے ۔

محمد بن سام غوری اور انکے ہمراہ آنے والے لوگوں کا ایک

مخصوص قومی مزاج تھا وہ لوگ ترک نسل سے تعلق رکھتے تھے اسلامی تاریخ میں سب سے

پہلا عربوں نے اسلامی حدود کو وسعت دینے کا کام انجام دیا عربوں کے بعد رہنمائی اور

قیادت ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی مگر ایرانیوں نے اسلام کی خدمت کے لئے تلوار نہیں

اٹھائی بلکہ انہوں نے دماغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دی ایرانیوں کے بعد

تیسرے درجہ میں ترک آتے ہیں ترکوں کو اسلام کے خادم کی حیثیت سے بہت بڑی

منزلت اور عزت حاصل ہے انکا اصلی وطن وسط ایشیا ہے وہ اپنے اصلی حالت

میں وسط ایشیا کے نہایت وسیع و عریض میدانوں اور قدرتی سبزہ زاروں میں

خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے گھوڑوں پر سواری کرنا اور گھوڑوں کے گلے لئے ہوئے نئی
چراگاہوں کی تلاش میں آزاد گھومنا شکار کے گوشت پر گزر کرنا انکا مشغلہ اور معمول
تھا۔ فطری طور سے وہ بہترین شہسوار اور تیر انداز ہوتے تھے۔ وسط ایشیا کے میدانوں
کی آب و ہوا کم اونچائی والے پہاڑ اور شفاف چشموں کے پانی نے انکو طاقتور،
محنت کش، اور جنگجو بنادیا تھا وہ شہر یا گاؤں کی شکل میں مدنی زندگی سے بالکل
نا آشنا تھے انکے قبائل کا یہ دستور تھا کہ موسموں کی تبدیلی کے ساتھ محل و مقام سے
کوچ کر جاتے عام طور سے گرمیوں کا موسم جس مقام پر گزارا جاتا تھا وہاں جاڑوں کے
موسم میں قیام ہرگز نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ترکی زبان میں دو لفظ سب سے
زیادہ اہم ہیں ایک "ایلاق" اور دوسرا "قشلاق" کہلاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام
کو کہتے ہیں جہاں گرمیوں میں قیام کیا جاتا تھا اور آخر الذکر سے جاڑوں کی قیامگاہ مراد ہے

نویں صدی عیسوی شروع ہونے کے وقت بغداد کی خلافت عباسیہ
پر سیاسی انحطاط کی پرچھائی پڑنی شروع ہوئی تو ہمکو اسلامی معاشرے میں ایک بالکل
نئی چیز نظر آتی ہے یہ نئی چیز جسکا رواج پہلے سے چل رہا ہوگا مگر مذکورہ بالا وقت
کی ابتدا سے بہت زیادہ عام اور مانوس منظر کے طور پر نظر آتی ہے یہ غلاموں کا

بالفرض اگر ہم اپنے تصور کا پردہ تیرہویں صدی عیسوی اور اسکے بعد کے مناظر کو

پیش نظر کر کے پیش کرتے ہیں تو ہمکو بغداد سے بخارا اور سمرقند یعنی دور دراز تک ہر شہر میں

غلاموں کے بازار نظر آتے ہیں جہاں نو عمر اور کمسن ترک بچے بکتے ہوئے نظر آتے ہیں

خود غلاموں کے تاجر وسط ایشیا کے خانہ بدوش ترکوں کے قبیلوں سے خرید کر لاتے تھے

انکی خرید و فروخت کا رواج بالکل عام تھا البتہ یہ مسلمانوں کی خوبی رہی ہے کہ غلاموں

سے برادرانہ اپنے گھر میں ان سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتے تھے انکو حقیر نہیں سمجھا

جاتا تھا ان ترک غلاموں کو اکثر و بیشتر تعلیم دی جاتی تھی اور وہ اپنے آقا کے بچوں

کے ہمراہ جوان ہوتے تھے ان میں سے بیشتر غلام وہ ہیں جو بہتر صلاحیت کا

ثبوت دینے کی وجہ سے اپنے آقاؤں کی اولاد کی جگہ انکے وارث قرار پاتے تھے

یہی دیکھ کر مشہور انگریزی مورخ ایڈورڈ گیبن[1] کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ " اسلام میں

آج کا غلام کل وزیر اور سلطان ہو سکتا ہے[2]

ترک بے پناہ توانائی کے مالک تھے ساتھ ہی انکے اندر بہادری اور

شجاعت کا جوہر بھی موجود تھا انہوں نے اپنی ان دونوں صفات کو جس انداز سے سیاسی

۱۔ Edward Gibbon

۲۔ "In Islam a slave of today is grand wazir of tomorrow". Decline and fall of Roman Empire V.

میدان میں استعمال کیا اور جو سیاسی مقاصد حاصل کئے انکا ذکر ہمارے مطالعہ کی حدود
سے باہر ہے۔ البتہ جس مسئلہ کو ہم جستجو کا موضوع بنانا چاہتے ہیں وہ ترکوں کا تہذیبی
اکتساب اور ذوق کی تربیت ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ طبعاً خانہ بدوش تھے اور
دنیا کی تمام ہی عظیم تہذیبوں کے اثرات سے دور ایک ایسے آزاد ماحول میں رہتے تھے
جنکو اسلامی اصطلاح میں وحشی یا جاہلی کہتے ہیں مگر عجیب نکتہ یہ ہے کہ اسلامی دنیا سے
وابستہ ہونے کے بعد اور اسلام قبول کرنے کے نتیجہ میں ترکوں نے غیر معمولی سرعت کے
ساتھ فارسی زبان اور ایرانی تمدن کو اختیار کیا انکے قومی مزاج پر ایرانی تمدن کی
ایسی گہری چھاپ لگی کہ اسکو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے یقیناً یہ ایک بڑی بات ہے کہ وہ
کیسے جو کل تک وحشی تھے وہ دنیا کی انتہائی شائستہ اور شیریں زبان بولنے
والے اور ایک نہایت عظیم الشان تمدن کے نگہبان بن گئے ایرانی زبان اور تہذیب اپنی
وسعت اور گسترش کے لئے ترکوں کی ممنون احسان ہے انہوں نے اپنی کوشش سے فارسی
کو ایک عالمی زبان بنا دیا اور اسکا دامن بحر روم سے لگا کر بحر کاہل تک پھیلا دیا
اسلامی مورخین ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے دانشمند اس عمل کو ترکوں کا عظیم کارنامہ
تسلیم کرتے ہیں، اور جس طرح انکی سیاسی کامیابی کو مانتے ہیں ویسے ہی انکو

تہذیب کے خادم کی حیثیت سے بھی بہت بڑی جگہ دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ترکوں
کا داخلہ اس اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ایرانی تہذیب کے تمام
ترقی یافتہ اداروں کو اپنے ساتھ لیکر داخل ہوئے یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ
ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کا ماحول ان اداروں کی ترقی کے لئے سازگار ثابت
ہوا اور اس ملک کے طول و عرض میں ایسے مراکز قائم ہوگئے جہاں ایرانی
ادب اور شاعری ایرانی موسیقی، ایرانی مصوری اور ایرانی فن تعمیر نے
زبردست ترقی کی ۔

ہمیں محمد بن سام غوری کی کامیابی کے چند دنوں بعد ہی وہ وسیع
دور ابھرتا نظر آنے لگتا ہے جس کے اندر تیرھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی رنگ
برنگی تصویر ابھر کر تیار ہوئی۔ ترک سپاہی تھے انکا مقصد بے تعلقی کے ساتھ ملک گیری
اور کشورکشائی تھا مگر اسکے ساتھ ساتھ وہ تمام دیگر عناصر بھی ہندوستان میں داخل ہوئے جنکا تعلق
اسلام کی روحانی تہذیبی اور جمالیاتی قدروں سے تھا۔ ہماری تحقیق اور جستجو کا موضوع انہیں
نہ ان کی سرگرمیوں اور کارگزاری پر روشنی ڈالنا ہے بلکہ ان عناصر میں سے صرف وہ زمرہ اور طبقہ
اور وہ جماعت ہے جس نے تصوف کی شکل میں اسلام کے روحانی نظام کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ہندوستان کی اسلامی سلطنت پر روشنی ڈالنے والے سب سے ابتدائی

اور اہم ماخذ بہت زیادہ نہیں ہیں مسلمان دانشمندوں کے سامنے محمد بن سام غوری کی آمد

اور اسکے جانشینوں کی ہندوستان پر مستقل تسلط نے ایک نئی صورتحال پیدا کردی تھی وہ یہ

محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے سانحات کو خود انہیں یہیں بیٹھ کر

مشاہدہ کرنا ہے اب وہ کیفیت ختم ہوگئی تھی کہ ہندوستان کی تاریخ کا مشاہدہ باہر

سے کیا جائے اور غزنی یا ہرات یا کسی دوسرے علمی مرکز میں بیٹھ کر ہندوستان کی تاریخ

کا جائزہ لیا جائے۔ صورتحال کا تقاضہ تھا کہ حالات کی رفتار کو نزدیک سے دیکھنا پڑیگا

اور معلومات کو جمع کرنے کے لئے جائے واردات سے نزدیک رہنا پڑیگا اس صورتحال

سے نبٹنے کے لئے ضرورتاً بہت سے دانشمندوں کو مؤرخ کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی اور

تاریخ نگاری کا فریضہ ادا کرنا پڑا ۔

<u>شجرۃ الانساب</u> اسلامی ہندوستان کا سب سے پہلا دانشمند اور فاضل جو تاریخ

کا صحیح مزاج رکھتا تھا اور باقاعدہ مؤرخ نہ ہونے کے باوجود تاریخی شعور اور

تاریخی تربیت پر ممتاز تھا وہ فخر مدبر مبارک شاہ ہے، فخر مدبر کے آثار نظر ڈالنے

سے پہلے اسکی شخصیت کا مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے فخر مدبر کی تحریروں میں

اس بات کا صریحی احساس نظر آتا ہے کہ ترکوں کے داخلے نے ہندوستان کی صورتحال
کو بدل دیا ہے اور تاریخ کا دھارا اپنا رُخ موڑ رہا ہے۔ ہندوستان کے مقامی باشندوں
کو احساس ہونے لگا تھا کہ اب طوفان کی رفتار سے حملہ کرکے مال غنیمت کا انبار باہر
لے جانے کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب ترکوں کو مستقل فرمانروا کی حیثیت سے ہندوستان میں
رہنا ہے اور ترک بھی حکمرانی کی تمام ذمہ داریوں کا احساس کرنے لگے تھے اور حاکم ومحکوم
کا اتحاد جو فرمانروائی کی پہلی شرط ہے انکے ذہن پر اس احساس کا دباؤ ڈال رہا تھا
کہ اب ہندوستان کے لوگ انکے ہاتھوں میں ایک ودیعت الٰہی یعنی مقدس امانت ہیں
حکمرانی کی ضرورت کے پیش نظر باہر سے طرح طرح کی اہلیت رکھنے والے لوگوں کا داخلہ
شروع ہو گیا تھا۔ فرمانروا ہونے کے باوجود ترک ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے
تھے جو انکے آبائی وطن سے بہت دور تھا۔ امن اور قانون کی برقراری اور خود اپنے
تحفظ کا اطمینان انکی نظر میں پہلی ضرورت تھی، اسی احساس نے انکو اور زیادہ جنگجو
بنا دیا تھا۔ فخر مدبر امور مملکت سے سروکار نہ رکھنے کے باوجود ترکوں کی سیاسی
سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔ فخر مدبر لاہور میں رہتا تھا حالانکہ اسکا آبائی گھر
غزنی میں واقع تھا غزنی کا شہر کئی پشتوں سے علم و ادب اور فنون لطیفہ کا
ایک بارونق مرکز تھا فخر مدبر کے پردادا شیخ ابوالفرج کا شمار غزنی کی فاضل

ہستیوں میں کیا جاتا تھا وہ سلطان ابراہیم غزنوی کے دربار کا ایک معزز عہدیدار تھا جو مختلف اوقات میں اکیس[۲۱] عہدوں پر فائز ہوا[ع۱] وہاں انکے علم و تقوی کا بڑا احترام ہوتا تھا انکے زمانے میں غزنویوں کی حکومت میں زوال کے آثار پیدا ہو چکے تھے غزنوی شہزادہ ابراہیم بن مسعود انکی پرہیزگاری سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ لاہور اور غزنین کے بیشتر علماء انکے حلقہ "تلامذہ" میں شامل تھے[ع۲] اس خاندان کی شہرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اسکا شجرہ نسب خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق" تک پہونچتا تھا۔ غزنی اور اس نواح کے عوام انکے صدیقی النسب ہونے کا بھی بڑا لحاظ کرتے تھے۔ فخرالدین کی پردادی کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ ہمیں یہ دلچسپ واقعہ معلوم ہے کہ سلطان بہرام شاہ غزنوی کم و بیش تیس چالیس بیٹیوں کا باپ تھا اس نے اپنی تمام لڑکیوں کی شادیاں اہل علم اور اہل تقوی حضرات سے کی تھیں اسکا خیال تھا کہ بادشاہ کا داماد بننے کا حق اگر کسی کو ہے تو صرف ایسے آدمی کو جو عالم و فاضل ہو۔ سلطان بہرام شاہ کی ایک بیٹی فخر مدبر کے پردادا سے بھی منسوب ہوئی تھی یعنی وہ پدری نسب کے اعتبار سے خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کی اولاد تھا اور مادری رشتہ سے غزنویوں

ع۱ بزم مملوکیہ ص ۲۸

ع۲ تاریخ فخرالدین مبارکشاہ ص ۶۷-۷۰

کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ فخر مدبر کے بزرگوں کے پاس غزنی اور لاہور دونوں شہروں

میں وسیع جائدادیں اور اثاثہ موجود تھا لہذا فخر مدبر کا معمول تھا کہ سال کے کچھ حصے

میں غزنی میں مقیم رہتا تھا اور کچھ لاہور میں گذارتا تھا۔ فخر مدبر کی نظر میں لاہور کی سکونت

اس بات کا صریح اشارہ تھا کہ اسکا اجتماعی پس منظر بدل رہا ہے فطری طور سے آدمی

ایسی ہی کیفیت میں اپنے حسب و نسب کو محفوظ رکھنے کی فکر شروع کرتا ہے غالباً یہی ذہنی

محرکات تھے جنکی بنا، پر فخر مدبر نے اپنے شجرہ نسب کو کتابی شکل میں محفوظ رکھنے کا ارادہ

کیا اور اس نیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کتابوں کی تلاش ترتیب اور جستجو شروع

کردی، آہستہ آہستہ یہ خیال وسعت پاتا گیا اور بنیادی ارادہ یعنی اپنے خاندانی

شجرہ کی تالیف آگے بڑھکر ایک بہت بڑے علمی شاہکار کی صورت اختیار کرگئی۔ مختصر

طور سے یہ اس خیال کی روداد ہے جس کے نتیجہ میں فخر مدبر کی تالیف "شجرۃ الانساب"

وجود میں آئی اور برسوں کی محنت کے بعد ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء میں پایہ تکمیل کو پہونچی۔

فخر مدبر نے اس تالیف سے متعلق تمام روداد مقدمہ میں بیان کی ہے کہ وہ کس طرح

مسلسل محنت اور صبر کے ساتھ اس کام کو مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھاتا رہا۔ اسکی

علمی کاوشوں کا یہ عالم تھا کہ اس کتاب کو لکھنے میں صرف نسب پر ایک ہزار کتابوں

کا مطالعہ کیا۔ ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس زمانے کی روایت کے مطابق کسی مربی نے اس کام کے لئے مؤلف کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور نہ کسی امیر کبیر نے اسکو اس کام کا شوق دلایا تھا البتہ جب اس نے کام مکمل کرلیا تو رسمی طور سے اسکو سلطان قطب الدین ایبک کے نام سے اس وقت جب وہ دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تھا معنون کردیا۔ فخر مدبر کہتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب مجھے سلطان محمد غوری کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا تو میں نے سلطان مرحوم سے اپنے اس کام کا ذکر کیا سلطان بہت خوش ہوا اور مجھ سے اس کتاب کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی میں نے عرض کیا کہ اس کتاب کو وزیر کی معرفت آپکی خدمت میں پیش کرونگا لیکن ایسا اتفاق پیش آیا کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا مجھے کتاب کی نوک پلک درست کرنے میں کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کتاب پر بارہ سال تک محنت کرتا رہا اور اس کتاب میں حوالہ دینے کے لئے تقریباً ایک ہزار کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ میں ایک روز شام کے وقت وزیر کے گھر پہونچا کتاب کا مسودہ میرے ساتھ تھا میں چاہتا تھا کہ وزیر کو سلطان کی خواہش یاد دلاؤں اور عرض کروں کہ کتاب سلطان کی خدمت میں پیش کردی جائے۔ بدقسمتی سے اس دن وزیر نے روزہ رکھا تھا وہ افطار سے قبل روزے کی شدت سے بیحد متاثر نظر آتا تھا اور غصے کے مارے اس قدر آپے

سے باہر تھا کہ اپنے ایک نوکر کو تازیانے سے پیٹ رہا تھا۔ میں اس منظر کو دیکھ کر وزیر سے بالکل بات نہ کرسکا اور خاموشی سے واپس چلا آیا اسکے بعد حالات بہت تیزی سے بدل گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد سلطان محمد غوری کی ناگہانی شہادت واقع ہوئی بعد میں میں نے یہ کتاب سلطان قطب الدین ایبک کو معنون کردی"۔

مسلمانوں میں علوم و فنون کا جو نصاب رائج تھا اس پر فخر مدبر کو کامل عبور حاصل تھا۔ علم الانساب کو اس نظام میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ عرب اسلام سے قبل بھی علم الانساب سے واقف تھے اور اسلام کے بعد یہی شعبہ ترقی کرکے تاریخ کا علم بن گیا دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ اسلام میں علم تاریخ کی پیدائش علم الانساب کے بطن سے ہوئی۔ عرب جاہلی دور میں تمام قبائل کے نسب ناموں کو زبانی یاد رکھتے تھے اسلام کے بعد یہ روایت نہ صرف برقرار رہی بلکہ اور زیادہ مقبول و معروف ہوگئی علم الانساب میں مہارت پیدا کرنا مسلمانوں میں فضیلت کی علامت قرار پائی۔ فخر مدبر جو ایک تربیت یافتہ عالم تھا اپنے کو اس کمال سے کس طرح محروم رکھ سکتا تھا! البتہ اس نے شجرۃ الانساب کے سلسلے میں پہلے سے کوئی خاکہ تیار نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابتدائی مرحلہ میں اسکے ذہن میں یہ خیال تھا کہ یہ کام اس قدر پھیل جائیگا اور اتنا وقت اسکی تکمیل میں لگانا پڑیگا۔

بنیادی طور سے وہ محض اپنا شجرہ تیار کرنا چاہتا تھا اس کا نسب بارھویں پشت میں
حضرت ابو بکر صدیق سے جا کر ملتا تھا مگر جب اس نے اپنے بارہ سلسلوں کی تحقیق کرنے کے بعد
اپنا شجرہ مکمل کر لیا تو اسکے ذہن میں یکایک یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ برکت اور ثواب کی
خاطر اپنے شجرہ میں پیغمبر اسلام صلعم اور انکے دس صحابیوں کا شجرہ بھی اس میں شامل کر دے یعنی
وہ صحابی جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں وہ بتدریج اس مقصد کے تحت آگے بڑھنے لگا اور کچھ
دن بعد سرور کائنات اور انکے دس صحابیوں یعنی عشرہ مبشرہ کا شجرہ مکمل ہو گیا تو پھر عرب
کے جاہلی زمانہ کے قبائلی بادشاہوں اور اور سرداروں کا شجرہ کتاب میں شامل کیا گیا اسکے
بعد ایران کی قدیم تاریخ میں مذکور بادشاہوں کے شجرے کا اضافہ ہوا پھر بنی امیہ اور بنی عباس
کے خلفاء کے شجرے درج کئے گئے اسکے بعد اسلامی تاریخ کے مشہور فقہاء اور محدثین کے شجرے
ڈھونڈے گئے۔ آگے کے ابواب میں عہد احیاء کے بادشاہوں کے شجرے مرتب کئے گئے یعنی
بخارا کے سامانی اور غزنی کے ترک بادشاہوں کے نسب کی تحقیق پیش کی گئی آخر میں ان
تمام بادشاہوں کے شجروں کو ملحوظ رکھا گیا جو مؤلف کے زمانے میں غور، افغانستان اور
خراسان میں حکمرانی کر رہے تھے غرض اس طرح فخر مدبر نے پیغمبر اسلام صلعم کے عہد سے لیکر اپنے
زمانے تک کے ۱۳۶ شجرے قلمبند کر دئے۔

اس کتاب کی وسعت کا اندازہ مذکورہ بالا مندرجات پر نظر ڈالنے سے آسانی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ اتنی زبردست محنت اور عرق ریزی کے باوجود اس کام کو شایان شان شہرت حاصل نہ ہو سکی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں بعض قدرتی قسم کی کوتاہیاں اور قباحتیں شروع سے موجود رہیں نسب نامے کی کتاب میں ایک کے بعد دوسرے آدمی کے ناموں کا ایک سلسلہ لامتناہی دور تک چلا جاتا ہے مثال کے طور پر فلاں بن فلاں بن فلاں مگر ان اشخاص کی سیرت اور اور کارناموں کے بارے میں کوئی تفصیل سامنے نہیں آتی اور نہ سانحات اور واقعات کے باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ علم الانساب کی کتابیں عام مقبولیت سے محروم رہتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ پوری اسلامی تاریخ میں فقط ایک کتاب ہے جو اس موضوع پر سب سے زیادہ مشہور و معروف ہوئی وہ قاضی عبدالکریم سمعانی (وفات ۵۶۲ھ/ ۱۱۶۶) کی عربی تالیف "کتاب الانساب" ہے جس میں اس نے اپنے معاصرین اور متقدمین کا شہروں اور علاقوں کے انتساب سے ذکر کیا ہے اور اس میں ہندوستان کے بھی کئی بزرگوں کے مختصر حالات درج کئے ہیں۔ سمعانی ۱۱۱۲/۵۰۶ میں خراسان کے شہر مرو میں پیدا ہوا تھا یہ شہر ایک زمانے میں ادب اور تہذیب کا مرکز رہ چکا ہے اور اب تاجکستان کے علاقے میں موجودہ افغانستان کے شہر بلخ سے

مزید شمال کی جانب واقع ہے سمعانی کی کتاب جو کتاب الانساب کے نام سے مشہور ہے ضرور
مشہور ہوئی مگر اسکے مقابلے میں فخر مدبر کو علم و فضیلت اور زبردست محنت کے باوجود وہ
مقام حاصل نہ ہو سکا - سمعانی اور فخر مدبر کا مقابلہ کیا جائے تو صریحی طور سے سمعانی کی ذات
زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے اس نے تمام اسلامی دنیا کی سیاحت کی تھی اور بیشتر شہروں میں پہونچکر
وہاں کے مشہور و معروف علماء سے ذاتی طور پر ملاقاتیں کی تھیں اسکے برخلاف فخر مدبر نے اپنی
عمر کا زیادہ عرصہ عیش و آرام کے ساتھ لاہور و غزنی کے شہروں میں گذارا جہاں وہ اپنے زبردست
کتابخانے کے اندر بیٹھ کر رات دن مطالعہ کے شغل میں ڈوبا رہتا۔ فخر مدبر نے شجرۃ الانساب پر
ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے اس مقدمے کو ہم اپنے نکتہ نظر سے پوری کتاب کی جان تصور کرتے
ہیں مقدمہ اس دور کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالتا ہے اس کے ابتدائی حصے میں قطب الدین
ایبک کی ابتدائی زندگی کے حالات اور پھر مختلف ترقیوں کے بعد ۶۰۲/ ۱۲۰۵ میں اسکے تخت
نشین ہونے اور پھر بعد کے کچھ واقعات پر مشتمل ہے - مؤلف نے اس مقدمہ میں بے تکلفی سے اپنی ذات
اور اپنے معاصرین کے احوال کو بیان کیا ہے یہاں پر مؤلف اپنا سیاسی نظریہ بھی پیش کر گیا
ہے۔ وہ ملوکیت کا صریحی طور سے حامی ہے اور اسکو اسلامی عقیدے کے عین مطابق سمجھتا ہے
ملوکیت کے نظام کی حمایت میں اور بادشاہ و رعایا کے روابط اور حقوق و فرائض کے

اثبات میں وہ تقریباً بیس حدیثیں نقل کرتا ہے البتہ یہ اور بات ہے کہ بیشتر حدیثیں ضعیف اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت وہ پختہ عمر کو پہونچ چکا تھا اور اپنے زمانہ کے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ اس نے غزنوی خاندان کے آخری اور کمزور فرمانروا خسرو ملک کو سیاسی منظر کے اوپر سے غائب ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ سلاطین غور خاص طور سے سلطان محمد غوری کا اقتدار اسکی آنکھوں کے سامنے بلند ہوا تھا۔ محمد غوری کی وفات اور قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے درمیان جو حالات پیش آئے تھے اور محمد غوری کی جانشینی کے سلسلے میں قطب الدین ایبک اور ناصرالدین قباچہ کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی ان تمام باتوں کا مولف کو اچھی طرح علم تھا اس اعتبار سے یہ مقدمہ ایک زبردست تاریخی دستاویز ہے انگریز مستشرق اے ڈینی سن راس نے اس مقدمے کو ایک جداگانہ کتابی صورت میں ابھی اس صدی کی دو دہائیاں گزرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں تاریخ فخرالدین شاہ مرو روزی کے نام سے لندن سے شائع کردیا ہے

آداب الحرب والشجاعۃ:۔ فخر مدبر کی دوسری تالیف جو مذکورہ بالا سے بھی زیادہ اہم عالمانہ اور دلچسپ ہے وہ آداب الحرب والشجاعۃ کے نام سے معروف ہے اس کتاب میں بھی مولف ضمناً اور برسبیل تذکرہ بہت سے ایسے سانحات اور ایسی شخصیات کا ذکر

کرتا ہے جنکے بارے میں وہ شاہد عینی تھا۔ آداب الحرب کا موضوع قرون وسطی کے فنون جنگ سے تعلق رکھتا ہے جو یقیناً اس زمانے کے اعتبار سے ایک بلکنا اور نادر موضوع تھا۔ واقعی یہ کتاب ایک اعتبار سے مسلمانوں کی تہذیبی ترقی کا پتہ دیتی ہے یعنی وہ پورے ایشیا اور دنیا کے باقی بر اعظموں پر اپنا سیاسی اقتدار اور تسلط قائم رکھنے کی بھرپور جنگی صلاحیت رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ ہی کسی قوم کی سماجی قوت کو جانچنے کا ایک پیمانہ اور معیار ہوتی ہے واقعہ یہ ہے کہ پوری اسلامی تہذیب کے دور اقتدار میں فن جنگ سے متعلق لکھی جانے والی فارسی زبان میں سب سے پہلی اور آخری کتاب یہی تھی۔ اسلامی تہذیب سے پہلے دنیا کی قدیم تہذیبوں میں بھی اس انداز کی اور اس بڑے پیمانہ پر لکھی جانے والی کسی کتاب کا ثبوت نہیں ملتا۔ فخر مدبر نے یہ کتاب ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء میں مکمل کی یعنی مذکورہ بالا پہلی کتاب شجرۃ الانساب کی تکمیل کے بعد بیس برس مزید اس کتاب کی تالیف پر صرف ہوئے۔ مولف نے یہ کتاب سلطان شمس الدین التمش کو معنون کی[۱] اور سلطان اس کتاب کو دیکھ کر بہت زیادہ خوش ہوا۔ مولف واضح طور سے سیاست اور حکومت کے تعلق کو جانتا ہے اور اس بات سے بھی واقف ہے کہ یہ دونوں

---

[۱] آداب الحرب والشجاعۃ ص ۹

چیزیں گول پہیے کی طرح ایک ہی کیلی پر گھومتی ہیں اور اس کیلی کا نام فوج ہے۔ مؤلف جانتا تھا کہ شمالی ہندوستان میں ایک نئے نظام کی بنیاد پڑ چکی ہے اور وہ نظام ہندوستان کی سرزمین میں اپنی جڑیں استوار کر رہا ہے اسکو مضبوط اور پائدار رکھنا حکمران طبقے کے لئے ایک چیلنج تھا مؤلف کا مسلسل غور وفکر بالآخر اسکو ایک خاص نتیجے تک پہونچاتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ نئے ماحول میں سب سے اہم ذمہ داری فوجی تنظیم پر عائد ہوتی ہے اور فوج جسکا مقصد حرب وضرب میں کامیابی حاصل کرنا ہے وہ جسمانی تربیت کے علاوہ ذہنی تربیت کی بھی محتاج ہے۔ مؤلف بے تکلف اشارہ کرتا ہے کہ وہ یہ کتاب اپنے ہم قوموں کی عسکری تربیت کے لئے لکھ رہا ہے اور اصول جنگ کے متعلق انکی ذہنی سطح کو بلند کرنا چاہتا ہے[۱]۔ وہ اپنی کتاب کو چونتیس ۳۴ ابواب میں تقسیم کرتا ہے اور ہر باب کے تحت ایک علحدہ مسئلہ پر بحث کرتا ہے کتاب کے ابتدائی چھ ۶ باب خالص حکمت عملی پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان سیاسی تدبیرات کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے جنکے بغیر حکومت کی تنظیم ممکن نہیں ہے اور جو اقتدار سیاسی کے لئے ناگزیر وسائل تصور کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے بادشاہ کی ذات سامنے آتی ہے

---

۱ آداب الحرب والشجاعہ ص ۲۱

چونکہ بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ یعنی اقتدار مطلق کا نشان سمجھا جاتا ہے لہذا تفصیل سے بادشاہ کی ذات اور اسکے افعال و کردار کے بارے میں غور کیا گیا ہے۔ مولف کی رائے ہے کہ بادشاہ کی ذات میں تمام دیگر صفات کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت عدل کی صفت کو ہے[1] بادشاہ کو عادل ہونا چاہیئے اور بادشاہ عادل کا وجود رعایا کے لئے اللہ کی رحمت اور برکت ثابت ہوتا ہے۔ سلطان عادل کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے کو مخلوق الہی کا خادم سمجھے اور ہر وقت اللہ سے امداد اور توفیق کا طالب رہے اور اسکو ہر وقت اللہ سے توفیق کی دعاء کرنی چاہیئے[2] دراصل عدل کا تصور خالص اسلامی ہے اور دنیا کے دوسرے عقائد کے مقابلے میں یہ بھی ایک نکتہ ہے جو اسلام کو ان سے ممتاز کرتا ہے۔ البتہ ملوکیت کے قائم ہونے کے بعد مسلمان دانشوروں کے پاس سوائے اسکے اور کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے فرمانرواؤں کو عدل کا مطلب اور معنی سمجھائیں اور اپنی علمی تاویلات کے ذریعہ بہترین قسم کا سیاسی نظام برقرار رکھنے میں مدد کرسکیں۔ فخر مدبر کے نظریات کا ایک پہلو یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اس سے قبل کے اسلامی مفکرین جو امور سیاست پر غور و فکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں مثلاً امام ماوردی (وفات ۴۵۰ھ/۱۰۵۸

---

[1] آداب الحرب والشجاعہ باب دوم

[2] آداب الحرب والشجاعہ ص ۶۴

وہ بیشتر نظریاتی بحث تک محدود رہتے ہیں یعنی اسلام کا پیش کیا ہوا طریقہ حکومت "خلافت راشدہ" انکی نظر میں ایک زندہ اور موجود نظام بنکر سامنے آجاتا ہے ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں نے خلافت راشدہ کو عرصہ دراز ہوا رخصت کردیا اور اب خلافت کی جگہ ملوکیت لے چکی ہے ۔ فخر مدبر ایک حقیقت پسند سیاسی مفکر ہے وہ اس نکتے کو جانتا ہے کہ مسلمان ملوکیت کے محکوم ہیں لہذا موجودہ صورتحال کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ کوشش ملوکیت کی درستی اور اصلاح پر صرف کرنی چاہیئے ۔ وہ بادشاہ کو ایسی تاکیدیں بھی کرتا ہے کہ اگر ان پر خلوص سے عمل درآمد ہو تو ملوکیت کا نظام بھی اس قدر فائدہ مند اور بہتر ثابت ہو سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی ترقی یافتہ سیاسی نظام اسکا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ وہ اپنے نکتۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے اسلامی تاریخ کا دور تک محاسبہ کرتا ہے اور اسلامی تاریخ میں واقع ہونے والے بے شمار سبق آموز قصوں کو ان ابتدائی ابواب میں بیان کرجاتا ہے ۔ اسکی نظر میں نہ صرف اسلامی تاریخ کی عظیم شخصیات ہیں بلکہ وہ قبل اسلام کے ایرانی پہلوانوں کو بھی مثال کے طور پر تکرار کے ساتھ پیش کرتا ہے البتہ اسکا انداز بیان جامعیت کی حدود سے خارج نہیں ہوتا اس طرح وہ اپنے موضوع سے بہت دور بھی نہیں جاتا جو ایک قابل تعریف بات ہے ۔

فخر مدبر اصل موضوع پر پہونچنے سے قبل ایک جداگانہ باب میں خالص
نفس موضوع یعنی جنگ کی نوعیت کی تشریح کرتا ہے وہ نہایت واضح الفاظ میں تنبیہ
کرتا ہے کہ جہانتک ممکن ہو سکے بادشاہ کو یا آج کی اصطلاح میں کہا جائے کہ حکومتوں کو
جنگ سے پرہیز کرنا چاہئے[1] ایک بات تو یہ ہے کہ جنگ میں بے شمار جانیں ضائع ہوتی
ہیں اور بے حساب مال تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ جنگ کا نتیجہ بالکل غیر
یقینی ہوتا ہے متحارب فریقوں میں کوئی یقین کے ساتھ یہ نہیں جانتا کہ فتح آخر میں کس
کی ہوگی[2] یہ اور بات ہے کہ دونوں فریق اپنی فتح کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ
کفر کے بعد خونریزی انسان کی سب سے زیادہ گھناونی اور تکلیف دہ حرکت ہے قیامت
کے دن جب لوگوں کے اعمال نامے کھلیں گے تو سب سے پہلا سوال یہی طے ہوگا کہ زمین
کو اس کس نے اور کہاں کہاں انسانوں کے خون سے رنگین کیا ہے ۔ اللہ کسی ظالم کو نہ بخشیگا
اور انسانوں کی خونریزی کرنے والے دوزخ کے سب سے شدید عذاب میں مبتلا ہونگے[3]
مؤلف جنگ اور خونریزی کی ایسی شدید مذمت کرکے شاید اپنے زمانے کے فرمانرواؤں
یعنی ترکوں کو اصلاح کے راستے پر لانا چاہتا ہے جو فطرتاً خونریز اور جنگجو واقع ہوئے

[1،2] آداب الحرب والشجاعہ ص ۱۶۴

[3] ایضاً ص ۱۶۴

تھے۔ کتاب میں تین ابواب گھوڑوں کے لئے مخصوص ہیں ظاہر ہے گھوڑا جنگ میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے خصوصاً ترک گھوڑے پر سوار ہوکر لڑنے کے عادی تھے اور انکا شمار اب بھی دنیا کے بہترین شہ سواروں میں ہوتا ہے۔ عہد حال کی مشینی ایجاد سے پہلے ساری دنیا میں فوج کے دو حصے ہوتے تھے ایک رسالہ اور دوسرا پیدل کہلاتا تھا جنگ عظیم اول تک جو اس صدی کی دوسری دھائی میں واقع ہوئی اور جسکا محاذ جنگ بیشتر یورپ تھا یہی عسکری نظام رائج رہا ہے یعنی گھوڑے فوج میں استعمال ہوتے رہے ہیں فخر مدبر مذکورہ ابواب میں گھوڑے کی صفات پر بڑی دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے[1]۔ ترکوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد تاریخ کی بہت سی فیصلہ کن لڑائیاں گھوڑوں پر سوار ہوکر لڑی تھیں، انہوں نے یورپ کے صلیبی حملہ آوروں کا سیلاب اپنے برق رفتار گھوڑوں کی مدد سے روکا تھا۔ وہ فطرتاً گھوڑے کو اپنی زندگی کا لازمی جزو سمجھتے تھے اور اس جانور کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح پہچانتے تھے۔ مؤلف واقعی اپنی کتاب میں چند ابواب گھوڑے کے بارے میں لکھ کر ایک بڑا حق ادا کرتا ہے کتاب کے اگلے متعدد ابواب آلات جنگ سے متعلق ہیں اور ان میں تمام آلات مثلاً تلوار، تیر، نیزہ اور خنجر وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ انکی قسمیں اور انکا

---

[1] آداب الحرب والشجاعہ ص۵ باب ہشتم، نہم، دھم

طریقہ استعمال بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے حالانکہ مولف خود کبھی فوجی زندگی کا تجربہ کرنے کے لئے فوج میں داخل نہیں ہوا تھا اور نہ اس نے کبھی سپاہیوں کے ساتھ خیموں میں زندگی گزاری تھی۔ ضمناً وہ یہاں پر محمد غوری کی شجاعت اور تیغ زنی کی زبردست مہارت کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سلطان نے پشاور کے نزدیک تنہا ایک نہیں بلکہ کئی شیروں کا تیر سے شکار کیا[1]

مولف نے جس باب میں تیروں کا ذکر کیا ہے وہاں ایک مزید ار واقعہ بھی لکھا ہے وہ یہ کہ سلطان مودود غزنوی یعنی محمود غزنوی کی نسل کے ایک فرمانروا کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی کمان میں رکھ کر سونے کا تیر چلاتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جو زخمی ہو وہ تیر کے سونے سے اپنا علاج کرائے اور مر جائے تو اسکے کفن دفن کے خرچ کی محتاجی نہ ہو[2]۔ آلات حرب کا ذکر کرنے کے بعد مولف نے بیس باب ایسے لکھے ہیں جنکو کتاب کا لب لباب کہنا چاہئے وہ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں کے طریقہ جنگ کا ذکر کرتا ہے جس سے تاریخ میں مسلمانوں کا مقابلہ ہوتا رہا ہے وہ حملے اور اسکے دفاع کی تمام ترکیبیں تفصیل سے لکھتا ہے اور اس ضمن میں ذرا سی تفصیل بھی اسکی نظر سے اوجھل نہیں ہوتی وہ بتاتا ہے کہ سپاہیوں کی صفوں کو کس طرح میدان جنگ میں مرتب کرنا چاہئے میدان جنگ کا انتخاب، زمین کا اونچا

---

[1] آداب الحرب والشجاعۃ ص ۲۷۳

[2] ایضاً ص ۲۶۸

یا نیچا ہونا کس قدر جنگ کے نتیجے پر اثر انداز ہوتا ہے محاصرہ کیسے کیا جاتا ہے؟ شب خون ہراول کمینگاہ، جاسوسی اور تمام دوسری تدبیریں کیا معنی رکھتی ہیں اور انکے کیا طریقے ہیں؟ مختصر یہ کہ ان تمام مسائل پر لکھتے وقت وہ اپنے عہد کی بہترین تصویر پیش کرجاتا ہے۔ اور ان ابواب کے پڑھنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ترکوں کی عسکری صلاحیت کس پایہ کی تھی اور کیا عوامل تھے جنکی وجہ سے وہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک پر قابض ہوگئے۔ وہ ایک فاتح نسل کے جنگی جوہر کا بہترین نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

آداب الحرب ایسی داستانوں سے بھرپور ہے جو خالص تاریخی نوعیت کی ہیں اور انکو ایک مؤرخ اپنے مآخذ کی حیثیت سے برابر دیکھتا ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان حکایتوں کے بارے میں تنقیدی فیصلہ کریں۔ یقیناً بہت سی حکایتیں نہایت قیمتی دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں اور بہت سے واقعات اسکے قلم سے ایسے بیان ہوگئے ہیں کہ انکا حوالہ کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ وہ ایک بیدار مغز مبصر تھا طبقۂ عمائد سے متعلق ہونے کی بناء پر اسکی رسائی اعلیٰ ترین سطح تک آسانی سے ممکن تھی وہ سلطان محمد غوری، قطب الدین ایبک، اور التتمش تینوں بادشاہوں کو ذاتی طور پر جانتا تھا اور انکے درباروں میں جاتا رہا تھا اسکے علاوہ اسکا مطالعہ اور

اس زمانے میں موجود کتابوں پر اسکی نظر اس قدر زبردست تھی کہ بعد کے دانشمندوں کو
وہ سہولت پھر کبھی نصیب نہ ہو سکی اس نے ایک امیر انسان کی حیثیت سے اپنی بے شمار دولت
کتابیں جمع کرنے پر خرچ کی تھی۔ وہ اپنے زمانے سے قبل کے کتابی ماخذوں میں محفوظ بہت
سے اہم واقعات اور سانحات کی اطلاع رکھتا تھا البتہ ان تمام سہولتوں کے باوجود ایک
بات غیر جانبداری کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ آداب الحرب کی حکایتیں اعتبار اور درستی کے
معاملے میں وہ درجہ نہیں رکھتیں جو مثال کے طور پر نظام الملک کی تالیف سیاست نامہ کی
حکایتوں کو حاصل ہے ہم زیادہ سے زیادہ آداب الحرب کی حکایتوں کو اسکندر
ابن کیکاؤس صاحب قابوس نامہ کی حکایتوں کے برابر قرار دے سکتے ہیں جس قدر قابوس نامے کی
حکایتوں میں اسکے مؤلف نے ذمہ داری سے کام ذرا کم ہی لیا ہے۔ مجموعی طور پر ہم وہی بات
آداب الحرب کی حکایتوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ فخر مدبر کے اسلوب تحریر میں تاریخی رنگ کم اور
داستانی رنگ زیادہ ہے یعنی وہ ہر اس واقعہ کو قصے کی شکل میں لکھ جاتا ہے جو اسکے معاصرین
کی زبانوں پر تھا اور اسکے زمانے میں مشہور تھا۔ آخری فیصلے کے طور پر ہمارا یہ
کہنے کو جی چاہتا ہے کہ بالآخر یہی کیا کم ہے کہ آداب الحرب کی حکایتوں میں اسکے زمانے
کی نہایت روشن تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

چچ نامہ

علی بن حامد کوفی کا چچ نامہ تیرھویں صدی عیسوی کا تاریخی مآخذ

ہیں ہے مگر تیرھویں صدی کے ادبی مآخذوں پر نظر ڈالتے ہوئے اسکا تذکرہ ناگزیر ہے اس لئے

کہ یہ کام تیرھویں صدی عیسوی میں انجام پایا تھا اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اصل عربی تالیف

کے مفقود ہو جانے کی وجہ سے اس ترجمے کو ایک مستقل تالیف کی اہمیت اور منزلت

حاصل ہو گئی ۔

علی بن حامد کوفی جیسا کہ اسکی نسبت سے پتہ چلتا ہے شہر کوفہ کا عرب

باشندہ تھا وہ اپنے وطن سے مہاجرت کرکے سندھ اچ میں آباد ہو گیا یقیناً وہ ایک عالم

و فاضل انسان تھا اور تاریخ کا گہرا شعور رکھتا تھا اسکو سندھ میں سکونت حاصل کرنے کے بعد

یہ محسوس ہوا کہ اب سے تقریباً پانچ صدی پہلے آٹھویں صدی کے اوائل میں یعنی جب اسلام

کی پہلی صدی اختتام کے قریب تھی اور بنی امیہ کی حکومت کا دور تھا تب اسکے آباؤ اجداد

سندھ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور محمد بن قاسم نے اس علاقے پر حکومت

قائم کی تھی لہذا اس تاریخی دور کے مآخذوں کا پتہ لگانا چاہئے ۔ یہ احساس اسکے ذہن

میں کروٹیں لیتا رہا اور اس نے سندھ میں مقیم مختلف علماء اور شرفاء سے ملکر اپنی

جستجو جاری رکھی بالآخر جوئندہ یابندہ کا مقولہ صادق آیا اور اسکو شہر بھکر کے

قاضی شیخ کمال الدین اسماعیل بن علی الثقفی سے ملنے کے بعد اپنا مقصد حاصل ہو گیا۔ قاضی بھکر ان عرب مہاجرین کی نسل سے تعلق رکھتا تھا جو محمد بن قاسم کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور سندھ میں ہی مقیم ہو گئے تھے۔ علی بن حامد کو قاضی کے ذاتی کتب خانے میں ایک ایسی کتاب نظر آئی جس میں محمد بن قاسم کی فوج کشی اور سندھ کے راجہ داہر پر اسکی فتح کا تفصیلی حال لکھا تھا وہ فوراً اس کتاب کا فارسی ترجمہ کرنے میں لگ گیا اس لئے کہ اسکے عہد میں ہندوستان میں فارسی زبان کا نفوذ اور لسانی تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے اسکے معاصرین عربی کے مقابلے میں فارسی سے زیادہ آشنا تھے بلکہ عربی کا رواج اسکے عہد میں نہ ہونے کے برابر تھا قاضی بھکر جو ایک خوشحال انسان تھا اور باہر سے شہر میں آنے والے مسافروں اور سیاحوں کی مہمان نوازی نہایت فیاضی کے ساتھ کرتا تھا۔ علی بن حامد کوفی کے اس ارادہ سے اطلاع پاکر وہ بہت خوش ہوا اور اس دانشمند عرب کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی۔ علی بن حامد کی زندگی اسکے آبائی وطن کوفہ میں عیش اور فارغ البالی کے ماحول میں گذری تھی مگر وہ علمی جستجو اور سنجیدہ مطالعہ کی اہمیت کو جانتا تھا اور علم و فضل کے شغل سے کبھی غافل نہ رہا تھا۔ سندھ کے شہر اچہ میں آکر اسکو ناصرالدین قباچہ کے وزیر عین الملک کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور وہاں کے علمی حلقوں میں اسکے ذہن کو روشنی حاصل کرنے کا موقع ملا جب وہ اچہ سے نکل کر

بھکر میں وارد ہوا تو اسکی عمر اٹھاون برس کی ہوچکی تھی اس نے اس عربی تالیف کے ترجمے کا
کام ۶۱۳/ ۱۲۱۶ میں مکمل کیا اور اس ترجمے کا عنوان چچ نامہ قرار دیکر اسے ناصرالدین قباچہ
کے وزیر عین الملک کے نام معنون کیا۔ اس ترجمے کا نام چچ نامہ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ محمد بن قاسم کو
سندھ کے جس شاہی خاندان سے مقابلہ کرنا پڑا تھا اسکے بانی کا نام راجہ چچ بن سلائج تھا۔ مترجم
کی مادری زبان عربی تھی لیکن اس نے جس سادہ سہل اور سلجھی ہوئی فارسی زبان میں کتاب کا ترجمہ
کیا اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی نثر لکھنے پر اسکی گرفت نہایت مستحکم تھی اور وہ واقعی
طور سے فارسی کا ایک صاحب طرز اہل قلم تھا۔ چچ نامہ ایک اتفاقی عنوان ہے جو عرف عام میں
شہرت پاگیا یہ جواز ضرور ہے جسکا اوپر اشارہ کیا گیا یعنی سندھ کی سلطنت کے بانی کا نام
راجہ چچ تھا مگر بعض محققین کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب کا نام مترجم نے فتح نامہ قرار
دیا ہوگا اس لئے کہ صحیح طور سے یہ کتاب عربوں کے فتح کی تاریخ ہے اور بعد میں غلطی کاتب
کے طور پر فتح نامہ بگڑ کر چچ نامہ ہوگیا۔ اصل عربی کتاب کا نام متعین نہیں کیا جا سکتا اس
لئے کہ وہ بہت جلد مفقود ہوگئی تھی اور اسکا کوئی نسخہ محفوظ نہیں رہ پایا علی بن حامد کوفی
کے ترجمے سے ایک جگہ اشارۃً یہ پتہ چلتا ہے کہ اصل کتاب کا نام منہاج الدین والملک تھا
مگر اسکی وضاحت بہت اچھی طرح نہیں ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ عربی تاریخ کا اصل

---

۱ بزم مملوکیہ ص ۵۸

مورخ یا تو محمد بن قاسم کی مہم اور اسکی مرحلہ بہ مرحلہ جنگی کارروائیوں کا بذات خود شاہد عینی تھا یا اس نے واقعات کا استماع ایسے معتبر راویوں سے کیا تھا جو سندھ کی فتح میں شریک رہے تھے عرب مؤرخین نے واقعات کا ذکر کرتے وقت اسناد اور راویوں کے التزام کو ضروری سمجھا ہے اور اسناد کا سلسلہ یہ واضح کرتا ہے کہ اصل کتاب کی تالیف کے وقت محمد بن قاسم کی فتح کو دو یا زیادہ سے زیادہ تین پشتیں گزری تھیں یعنی نصف صدی یا چھ سات دہائیاں گذری ہونگی۔ چچ نامہ کا عرب مورخ ایک تحریری مأخذ کا حوالہ بھی دیتا ہے یہ ابوالحسن مدائنی کی کتاب ہے مدائنی کی وفات ۲۱۵/ ۸۳۰ میں واقع ہوئی تھی البتہ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ایسی اہم کتاب جو عربوں کے حملۂ سندھ کو تاریخ کی روشنی میں پیش کرتی ہے عرب دنیا میں مشہور و مقبول نہ ہوسکی۔ غالباً اسکے نسخے ہندوستان سے باہر نہیں پہونچے۔ محمد بن قاسم کی جنگی مہم کوئی ایسا معمولی اور سرسری واقعہ نہ تھا کہ عرب دنیا اس سانحے کی تاریخ کو توجہ اور شوق کی نظر سے نہ دیکھتی۔ یہ تاریخ حتمی طور سے انکی نظر سے اوجھل رہی۔ ابن ندیم بغدادی صاحب الفہرست جو اسلامی دنیا میں اس وقت تک موجود تمام ہی کتابوں کا جامع طور سے ذکر کرتا ہے اسکی فہرست میں بھی چچ نامہ کا ذکر نہیں ملتا ابن ندیم نے اپنی عظیم اور قابل تعریف کوشش الفہرست کو ۳۷۷/ ۹۸۷

میں مکمل کیا تھا اس وقت تک چچ نامے کے وجود کا علم ہندوستان کے باہر کے عرب دانشمندوں
کو بالکل نہیں تھا ۔ بعد کے مورخین بھی جو بنی امیہ کی سیاسی فتوحات کا ذکر کرتے ہیں ہندوستان
کے اوپر انکے تسلط کے واقعہ سے بے خبر نہیں ہیں مگر انکے آثار میں چچ نامے کا حوالہ
کہیں نہیں ملتا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کا واحد نسخہ قاضی بھکر مولانا کمال الدین
اسماعیل کے اجداد کے پاس انکے کتاب خانے میں موجود تھا اور وہی نسخہ کئی صدی گزر جانے
کے بعد علی بن حامد کوفی کے ہاتھ لگتا ہے جس نے اس کتاب کو فارسی زبان میں ترجمہ کرکے
آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردیا اس طرح علی بن حامد کوفی کا یہ ترجمہ خود ایک نہایت
اہم تاریخی روداد کی پردہ کشائی کرتا ہے اور التتمش کے عہد کی ایک یادگار علمی کوشش شمار
ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ بادشاہ علی بن حامد کوفی کا حامی نہیں تھا بلکہ مؤلف کی پذیرائی
التتمش کے حریف ناصرالدین قباچہ نے کی تھی اور اسکے علم و دانش کو دیکھ کر اپنے دربار
کے فاضلوں میں داخل کر لیا تھا ۔

چچ نامے کا مطالعہ یقینی طور سے اس حقیقت کو واضح کردیتا ہے کہ
عرب مؤلف کا تاریخی شعور نہایت پختہ اور بیدار تھا۔ وہ اپنی کتاب کی ابتدا میں سندھ
کے حکمراں سلسلے کے حسب ونسب پر نظر ڈالتا ہے جس نے عربوں کے حملے کا مقابلہ کیا۔ تقریباً

آدھی کتاب میں سندھ کے شاہی سلسلے اور اسکے اجتماعی اور سیاسی طریقۂ کار پر بحث کی گئی ہے
راجہ چچ کی ملوکیت۔ بحر عرب کے ساحل سے لگاکر کشمیر کی پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی تھی مورخ نے
بے تکلفی کے ساتھ راجہ چچ کے اقتدار اور اسکے جانشینوں کی عظمت اور شوکت کا اعتراف کیا ہے
البتہ محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا ترجمہ کرتے وقت علی بن حامد کوفی نے ضرور تھوڑی سی آزادی برتی
ہے اسکے قلم سے تاریخ کے وہ مخصوص تصورات بھی جگہ پا گئے ہیں جو خالص اسکے ذہن میں تھے اور
ممکن ہے عرب مورخ کی نظر وہاں تک نہ گئی ہو۔ علی بن حامد کوفی یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اسکی
نسل نے ہندوستان میں جس سیاسی تبدیلی اور انقلاب کا مشاہدہ کیا ہے اسکا سلسلہ پانچ
صدی پہلے کے عرب حملے سے وابستہ ہے عربوں نے ایک ابتدا کی تھی اور ترک اس کوشش
کی انتہا ہیں۔ مترجم نسلاً عرب ضرور تھا مگر وہ محض نسلی جوش میں یہ کام انجام نہیں دے رہا ہے
اسکے نزدیک عربوں کی فتح کا مطالعہ اسکے ہمعصر ترکوں کے لئے ایک عبرت آموز سبق ہے جس سے
ترکوں کو فائدہ حاصل کرنا چاہئے اور اپنے سیاسی تجربات میں اضافہ کرنا چاہئے وہ خالص
یہی سبب سامنے رکھ کر چچ نامے کا ترجمہ کر رہا ہے چچ نامے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ
کتاب عربوں کے علم تاریخ کا ایک ابتدائی نمونہ ہے اور اس کتاب نے ہندوستان کے مسلمان مورخوں
کو تاریخ نگاری کا فن سکھانے میں ضرور مدد کی ہے۔ عہد وسطی کے مسلمان مورخین جنہوں نے بیشتر

فارسی زبان میں لکھا ہے انکی نظر میں چچ نامہ ایک معیاری کتاب اور نمونے کے طور پر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ چچ نامے کی ایک دلچسپ نوعیت یہ ہے کہ مورخ عورتوں کو ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے دکھاتا ہے وہ سندھ کے سیاسی سانحات کو ایک ڈرامہ بناکر پیش کرتا ہے جہاں شخصی سیاست پر عورتیں بار بار نمودار ہوتی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان عورتوں کی شخصیت نہایت اثر انگیز ہے۔ سندھ کی تاریخ کا قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ وہاں کا راجہ رائی ساھسی جو کئی پشتوں سے حکمران تھا اور راجپوت نسل سے تعلق رکھتا تھا اولاد نرینہ سے محروم ہے اسکی ملکہ رانی سوھندلو راجہ کے برہمن وزیر چچ بن سیلائج پر عاشق ہوجاتی ہے اور بوڑھے راجہ کی وفات کے بعد چچ سے شادی کرلیتی ہے بلکہ اپنی ہوشیاری اور تدبر کے ذریعہ چچ کو تخت پر بٹھاتی ہے چچ سے ملکہ کے تین اولادیں ہوتی ہیں جن میں دو لڑکے داھر اور دھرسیہ اور تیسری لڑکی جسکا نام مائین ہے چچ کا عہد حکومت چالیس سال تک برقرار رہتا ہے اسکے بعد برھمنوں کے مشورہ سے داہر اسکا جانشین بنتا ہے۔ چچ اور داہر کے عہد کی تفصیلات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں اسی طرح محمد بن قاسم کے حملے کی روئیداد اس قدر تفصیل سے لکھی گئی ہے کہ یہ تاریخ موضوع کی دلکشی اور انداز بیان کی سادگی کے اعتبار سے ایک انتہائی دلچسپ داستان یا ناول معلوم ہوتی ہے۔

مورخ محمد بن قاسم کی ابتدائی زندگی سے پوری طرح واقف نظر آتا ہے

اسکا حال عبرت اور دلچسپی سے خالی نہیں ہے ۔ اس وقت جبکہ حجاج بن یوسف بنی امیہ
کے خلیفہ ولید کی طرف سے عراق کا والی تھا اور عالم اسلام کے مشرقی علاقے پر حکمرانی کرتا
تھا ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ اسکا نوجوان چچا زاد بھائی محمد بن قاسم جو فقط سترہ
برس کا تھا یکایک اسکے کمرہ میں داخل ہوا جہاں حجاج امور مملکت کی بابت گہرے سوچ
میں ڈوبا ہوا تھا حجاج اپنے اس بھائی سے بڑی محبت کرتا تھا اس نے نظر اٹھاکر پوچھا کہ
کیا چاہتے ہو محمد بن قاسم نے شوخی سے جواب دیا کہ دو خواہشیں ہیں آپکی بیٹی سے شادی
کرونگا اور ایک آزاد ملک پر بادشاہت کرونگا حجاج اس غیر متوقع جواب پر چونک پڑا
اور محمد بن قاسم کے سر پر اپنی چھڑی رسید کی البتہ اسکی پہلی خواہش اسی دن پوری کردی اور اپنی
بیٹی سے اسکا نکاح کر دیا[1] ۔ اسی زمانے میں حجاج کو سندھ کے راجہ کے خلاف ایک بحری
مہم بھیجنے کی فکر تھی اس نے اس مہم کا سپہ سالار اپنے نوجوان بھائی کو مقرر کیا واقعہ
یہ ہے کہ نوعمر بھائی کی دوسری خواہش حجاج نے ایک طریقے سے پوری کردی محمد بن قاسم
کا سفینہ   / ۷۱۱ء میں بندرگاہ دیبل پر آکر لگا اور ساتھ ہی عرب سواروں کی ایک
بڑی جماعت ہرمز اور مکران کے راستہ سے ہوتی ہوئی یعنی ساحل کے ساتھ ساتھ آئی تھی وہ دیبل
کی بندرگاہ پر پہونچکر سمندر کی راہ سے جانے والے سپاہیوں کے ساتھ مل گئی ۔ محمد بن قاسم کو سندھ

---

۱ ۔ چچ نامہ ص ۱۹۰

میں نہایت جانباز اور تجربہ کار فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اسکی فتح یقیناً عربوں کی جنگی مہارت اور انکے تجربے کی برتری کا ثبوت ہے۔ چچ نامے کا مورخ اپنے انداز بیان کی صداقت سے محمد بن قاسم کی ایک نہایت باوقار تصویر یادگار چھوڑ گیا ہے۔ مؤلف جنگ کی تفصیلات بیان کرنے میں خاص مہارت رکھتا ہے محمد بن قاسم کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں مورخ ہر جنگ کا نقشہ نہایت واضح اور مفصل الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ ایک قابل توجہ نکتہ چچ نامے میں یہ ملتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے فتح کے بعد انتظام ملکی نافذ کیا تو سندھ کے ہندو باشندوں سے سلوک اور انکی حیثیت کو متعین کرنے کے بارے میں حجاج سے لکھ کر دریافت کیا حجاج کا جواب یہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو اسلامی ملکوں میں اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے[1] محمد بن قاسم کی یہ پالیسی بعد میں ترک کردی گئی جب ترکوں نے کئی سو برس بعد اقتدار ہاتھ میں لیا تو انہوں نے بھی ہندوؤں کو اہل کتاب کا درجہ نہیں دیا بلکہ انکو کافر سمجھنے کا رجحان ہی غالب رہا اور یہی رجحان پورے اسلامی دور میں برقرار رہتا ہے سوائے اکبر کے مختصر عہد حکومت کے جب ہندوؤں کو اہل کتاب کا درجہ دینے کی تحریک منظم طور سے شروع کی گئی۔ اکبر کے بعد وہی رجحان دوبارہ شروع ہوگیا جسکی بنیاد ترکوں نے ڈالی تھی۔ علی بن حامد کوفی کی یہ کتاب ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک کے نام معنون ہے۔

۱۔ چچ نامہ ص ۲۱۰ - ۲۱۲ محمد بن قاسم یا حجاج بن یوسف کی اس پالیسی پر کچھ علماء کو اختلاف تھا۔ انکا کہنا تھا کہ ہندوؤں سے جزیہ لینا جائز نہیں کیونکہ ان پر کوئی کتاب اتری اور نہ ان میں کوئی پیغمبر آیا ہے

جوامع الحکایات ولوامع الروایات

سدید الدین محمد عوفی نے اپنی ضخیم کتاب "جوامع الحکایات و لوامع الروایات" ۶۲۵ھ/۱۲۲۷ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب بذات خود تاریخ کے زمرہ میں نہیں آتی اور لفظ تاریخ سے جو معنی مراد لئے جاتے ہیں یعنی کسی ایک محدود اور مخصوص دور کا مسلسل واقعاتی جائزہ، وہ معنی اس کتاب پر صادق نہیں آتے البتہ پھر بھی اس کتاب کو اس زمرے سے قطعاً خارج نہیں کیا جاسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کتاب نے مولف کے معاصرین اور بعد کی نسلوں میں تاریخی مذاق پیدا کرنے اور تاریخی شعور جگانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ عوفی غیر معمولی استعداد کا مالک تھا اسکے زمانے تک یعنی حملہ تاتار سے قبل اسلامی تہذیب ترقی کے جس نکتہ عروج تک پہونچ چکی تھی اسکا اندازہ عوفی کی فضیلت سے ہوتا ہے عوفی حقیقی معنوں میں حملہ تاتار سے قبل کثرت سے نظر آنے والے فاضلوں کا ایک نمونہ ہے وہ اپنے دور میں موجود اور مہیا تمام تاریخی نوعیت کی معلومات کو نہایت احتیاط کے ساتھ سمیٹتا ہے اور بے شمار واقعات کو عوام کی معلومات کے دائرے تک منتقل کردیتا ہے اس طرح وہ ایک عام پڑھے لکھے آدمی کو دعوت فکر دیتا ہے اور زبردست قسم کا ذہنی مواد فراہم کردیتا ہے اسکی کتاب سے عام پڑھے لکھے آدمیوں کا ذہن کس قدر روشن ہوگا اسکا اندازہ اس مقبولیت سے ہوتا ہے جو اس کتاب کو صدیوں سے حاصل رہی ہے۔ عوفی بخارا میں پیدا

ہوا تھا اور علم حاصل کرنے کی غرض سے اس نے بڑی دور دراز کے سفر کئے تھے خصوصاً وہ عالم اسلام کے مشرقی حصے کے تقریباً سبھی بڑے شہروں میں سیاحت کی غرض سے گیا تھا بالآخر جب تاتاریوں کا تباہی خیز طوفان شروع ہوا اور اسلامی دنیا کے شہر ویران اور برباد ہونے لگے تو عوفی نے بھی جان کے خوف سے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور ہوتا ہوا سندھ کے شہر اچ میں سلطان ناصر الدین قباچہ کے دربار میں آکر پناہ لی وہ اچ میں ۶۱۷/ ۱۲۲۰ میں پہونچا جب یہاں اسے گوشۂ عافیت نصیب ہوا تو سب سے پہلے اس نے اپنی کتاب لباب الالباب کی تکمیل کی جو فارسی شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے اس کتاب کی تکمیل کے بعد اس نے اپنی توجہ مذکورہ بالا کتاب کی طرف مبذول کی مگر اسی زمانے میں قطب الدین ایبک کی وفات ہوگئی اور جانشینی کا جھگڑا شروع ہوگیا۔ جس میں ناصر الدین قباچہ اور شمس الدین التمش ایک دوسرے کے حریف تھے اتفاقاً یہ دونوں قطب الدین ایبک کے داماد بھی تھے اس سیاسی آویزش کا نتیجہ بالآخر خونریز جنگ کی صورت میں رونما ہوا جس میں ناصر الدین قباچہ شکست کھاکر سیاسی منظر سے غائب ہوگیا اور التمش کو کامیابی حاصل ہوئی۔ التمش ذاتی طور سے اچ پر فوج کشی کرنے پہونچا تھا وہاں اس نے قباچہ کے دربار میں موجود تمام علماء و فضلا کو دعوت دی کہ وہ اسکے ساتھ دہلی چلیں عوفی نے بشمولیت دوسرے اہل فضل کے یہ دعوت قبول کرلی اور دہلی میں آکر مقیم ہوگیا جہاں

اسکو علمی مشاغل کے لئے پوری آسائش اور ضروری سہولیات بادشاہ کی طرف سے مہیا کر دی گئیں۔
وہ دہلی پہونچکر اپنی کتاب جوامع الحکایات کو مکمل کرنے میں لگ گیا اور جب یہ کام پایہ
تکمیل کو پہونچ گیا تو اس نے اپنی اس تالیف کو التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کے نام
معنون کیا۔ کتاب کی صورت یہ ہے کہ اسکو جدید اصطلاحات میں انسائیکلو پیڈیا کہا جائے
تو یہ عنوان بیجا نہ ہوگا مجموعی طور سے جوامع الحکایات کے اندر ایک سو ابواب ہیں اور ہر باب
کے اندر کم وبیش چالیس یا پچاس حکایات ہیں اس طرح مؤلف معلومات عامہ کے عنوان
کے تحت آنے والے ہر موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اور اظہارِ خیال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے وہ
بحث کی ابتدا خدا کی ذات سے کرتا ہے پھر انبیائے کرام اور بادشاہانِ دنیا اور ہر طبقۂ فن
سے تعلق رکھنے والے اہلِ کمال مردوں اور عورتوں کا ذکر تفصیل سے بیان کر دیتا ہے مؤلف کی نظر
اور مطالعہ کی حدود کا اندازہ ان حکایتوں کے تنوع سے بخوبی ہو جاتا ہے اسکی نظر میں قرآن
کریم کی تفسیریں صوفیاء اولیاء اور علماء کے تذکرے فقہاء کی کتابیں اہل قلم کی تاریخیں اور
تقریباً تمام ہی علوم سے متعلق آثار ہیں اور وہ ہر شعبۂ علم کی کتابوں پر پوری گرفت اور عبور
رکھتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اتنے بے شمار ذخیرے سے وہ اپنے کام کی باتیں نہایت
ہوشیاری اور ذہانت کے ساتھ نکال لیتا ہے اور انکو حکایتوں کی شکل میں ترتیب دیتا

چلا جاتا ہے کتاب کی ترتیب کے ضمن میں ایک بات کہنے کی اور رہ گئی وہ یہ کہ پوری کتاب کے سو ابواب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی پہلا حصّہ جو پچیس ابواب پر مشتمل ہے وہ فقط انبیاء، سلاطین اور اہل حکمت کے ذکر جمیل پر مشتمل ہے اس لئے کہ مؤلف کے خیال میں انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود کا دارو مدار ان ہی لوگوں پر ہے اور دنیا و آخرت کی درستی انکے بغیر ممکن نہیں ہے، کتاب کا دوسرا حصہ اور اسکے پچیس ابواب کا موضوع بحث اخلاقی مسائل پر محیط ہے البتہ تیسرے حصہ میں ہم انسانی حرکت و عمل کے تنوع سے متعلق انتہائی دلچسپ حکایتیں پڑھتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس حصّے کے تحت بھی پورے پچیس ابواب ہیں جن میں سے ہر ایک کا عنوان جداگانہ ہے، چوتھے حصے میں متفرق مضامین کو یکجا جمع کردیا گیا ہے اور اس میں جغرافیہ، علم الحساب سفرنامے اور دیگر علوم سے متعلق حکایات کا ایک سلسلۂ لامتناہی چلا گیا ہے۔ غرض کہ جوامع الحکایات کے مطالعہ سے اس عہد کے مسلمانوں کا علمی مزاج واضح ہوکر سامنے آتا ہے اس زمانے میں علم وفضل کا معیار یہ تھا کہ جس قدر علوم فراہم ہوسکتے تھے ان سب کو سمیٹ کر ان سے بہرہ اندوز ہونا ایک فاضل اور دانشمند کے لئے ضروری تھا۔ آجکل کی طرح علم کی تقسیم بندی نہ تھی اور مختلف علوم کو شعبوں میں بانٹ کر کسی ایک شعبہ میں تخصیص حاصل کرنا اور باقی شعبوں سے بے نیاز رہنا مسلمانوں کی

تہذیب میں مروج نہیں تھا آج بھی نظریۂ تعلیم پر غور کرنے والے بہت سے دانشمند یہ محسوس
کرتے ہیں کہ تخصیص ایک قسم کی جہالت ہے اسلامی تہذیب کے عروج کے دور میں مسلمان اس
نکتہ سے واقف تھے۔ عوفی کی کوشش ایک دوسرے اعتبار سے بھی قابل تعریف ہے دراصل اس وقت
تک اتنے بڑے پیمانے پر علمی معلومات کو جمع کرنے کا کام عربی زبان میں کیا جاتا تھا۔ عربی ہی
مسلمانوں کی علمی زبان تھی اس انداز کی متعدد کتابیں جنکو آجکل انسائیکلوپیڈیا کہا جاتا ہے عربی
میں موجود تھیں عوفی پہلا دانشمند ہے جو فارسی زبان کا استعمال کرکے اس میدان میں قدم
رکھتا ہے اور ایک نہایت ضخیم بلکہ کہنا چاہئے کہ عظیم کارنامہ یادگار چھوڑ جاتا ہے۔ دوسری
قابل توجہ بات عوفی کا انداز بیان ہے وہ نہایت ہی سنجیدہ علمی مسائل کو مختصر حکایات
کی شکل میں پیش کرتا ہے اور اپنے اسلوب کی سحر آفرینی کی بدولت اس کوشش میں
پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے ظاہر ہے کہ اس قسم کی منفرد کوشش بغیر غیر معمولی تحقیق اور
توانائی کے ممکن نہ تھی خاص طور سے وہ اپنی کتاب میں حکایات جمع کرنے کی خاطر تاریخ کا
پورا دفتر کھنگال کر رکھ دیتا ہے ۔ وہ اپنی اس کوشش میں یعنی تاریخی معلومات اور واقعات
کو چھوٹی چھوٹی حکایتوں میں پیش کرکے اپنے کو ایک باقاعدہ مورخ کے زمرہ سے علحدہ کر
لیتا ہے۔ البتہ ایک اخلاقی مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے جو مقام اور منصب وہ حاصل

کرتا ہے اسکا اعتراف اور احترام ہمیشہ کیا جائیگا۔ وہ تاریخ کے بارے میں یہ دلچسپی
نہیں رکھتا کہ علت و معلول کی ایک مسلسل زنجیر کے طور پر واقعات کا مشاہدہ کرے
یا دوسروں کے مشاہدہ کئے ہوئے واقعات کو مسلسل طور سے بیان کرے۔ اسکی نظر میں
تاریخ کا ہر سانحہ عبرت کا ایک چھوٹا سا سبق ہے۔ اس طرح تاریخ کے واقعات کو وہ
عبرت اور اصلاح کا ایک ذریعہ بنا دیتا ہے اسکی ہر حکایت ایک سبق آموز نتیجہ قاری
کے سامنے پیش کرتی ہے مجموعی طور سے اسکے ذہن میں حکایات کی ترتیب کا ایک سلیقہ
اور اس ترتیب میں ایک اخلاقی نظریہ کی کارفرمائی واضح طور سے نظر آتی ہے۔ وہ ایک
اخلاقی مفکر ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ہر نیکی کا ثواب اور ہر بدی کی سزا ناگزیر
ہے اس طرح ہر چھوٹا اور بڑا انسانی عمل اسکی نظر میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ایک سبق
آموز اور عبرت انگیز سانحہ بن جاتا ہے آخر میں دیکھا جائے تو یہی مقصد ایک مورخ کا بھی
ہوتا ہے اور دنیا کے بڑے مورخوں کو بھی اخلاقی مفکرین کے زمرہ میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔
وہ سلسلۂ حادثات کو ایک ترتیب زمانی کے ساتھ پیش کرکے آخر میں یہی نتیجہ اخذ کرتا
ہے کہ انسان کو دوسروں کے عمل اور حرکت سے سبق لینا چاہئے اور اپنا ہر قدم آنکھیں
کھول کر اٹھانا چاہئے عمل میں ہوشیاری اور بیدار دلی کا سبق دنیا مورخ کا اصل

مقصد ہے یہی کام عوفی چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے ذریعہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے
ہمارے عہد کے بعض ... محققین کا اندازہ یہ ہے کہ عوفی نے اپنی کتاب کے لئے
دو ہزار سے زیادہ حکایات کی جمع آوری میں کم از کم اپنے عہد میں موجود سو یا اس سے بھی
زیادہ ماخذوں کی چھان بین کی ہوگی۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تقریباً ہر شعبہ علم
سے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر اس نے اپنی کتاب کی حکایات میں جمع
کر دیا ہے اس نے یہ حکایتیں جن کتابوں سے لی ہیں جابجا ان کتابوں کا نام بھی لکھ
دیا ہے ۔ عوفی نے جوامع الحکایات کے اوپر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں وہ اس عہد
کی ایک ہلکی سی جھلک بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کر گیا ہے وہاں اس نے قباچہ اور التمش
کی آویزش اور جنگی مقابلے کا حال بڑی تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ یہ مقدمہ اس عہد کے تاریخی
حالات اور اجتماعی ماحول کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد کرتا ہے اور بذات خود ایک
نہایت قیمتی دستاویز کا مرتبہ رکھتا ہے ۔

تاج المآثر

حسن نظامی نیشاپوری کی تالیف "تاج المآثر" پہلی کوشش ہے جسکو

باقاعدہ تاریخ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسن نظامی نے نہایت محدود

مقصد سامنے رکھ کر قلم اٹھایا تھا۔ وہ ترکوں کی فتوحات اور ہندوستانیوں پر انکا غلبہ فقط

کفر و اسلام کے معارکے کی صورت میں دیکھتا ہے بلکہ اسکی نظر ان سیاسی تفصیلات پر

بھی نہیں جاتی جن کی بناء پر ابتدائی دور میں ترکوں نے ہندوستان کے حکمران طبقے کے خلاف

آویزش اور جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا تھا وہ بار بار یہ اطلاع دیتا ہے اور شاید اسی

اطلاع کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے کہ کفار کے بت خانے منہدم ہوگئے اور مسجدیں قائم

ہوگئیں اور ہر شہر سے اذان کی آواز بلند ہورہی ہے اسکے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

بے جا تفاخر اور مبالغے سے کام لے رہا ہے اور ایک پختہ کار مورخ کی طرح براہ راست

برجستہ سادہ اور دلنشین انداز بیان اختیار نہیں کرتا۔ اسکی زبان ضرورت سے زیادہ

مصنوعی اور صنائع بدائع سے بوجھل ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکی زبان تاریخی سانحات اور

حوادث کی رفتار کو سمجھانے کے لئے صریحاً ناموزوں اور غیر مناسب ہے۔ اسکی نثر میں

جگہ جگہ نظم کے پیوند بھی ہیں اور کثرت سے اشعار کو نقل کیا گیا ہے قباحت کی

بات یہ ہے کہ شاعروں کے نام کہیں نہیں دئے گئے وہ صورتحال کی برمحل تصویر کشی کی

خاطر اور اپنے بیان کو زیادہ اثر انگیز اور دلاویز بنانے کی غرض سے نثر کے چند جملے لکھ کر ایک شعر لکھ دیتا ہے اور یہ عمل محض فارسی شاعروں تک محدود نہیں رہتا بلکہ اکثر مقامات پر عربی شعر یا عربی کے ضرب الامثال نظر آتے ہیں حتی کہ حدیث نبوی اور آیات قرآنی کا استعمال بھی آزادی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ موقع بہ موقع وہ خود اپنا کلام بھی درج کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی قادر الکلام شاعر تھا۔ ایسا مؤرخ جسکا بنیادی مقصد اظہار فضیلت تھا اور اپنی عظمت کا رعب جمانے کے لئے تاریخ کے میدان میں اترا تھا۔ واقعات کی صورتحال واضح کرنے میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ واقعات کے سلسلے کو دیکھنا اور محفوظ کرنا اسکا مقصد تھا بھی یا نہیں یہ خود ایک سوالیہ نشان ہے!

قطب الدین ایبک نے دہلی کو باقاعدہ طور سے سلطان کی تخت گاہ بنا دیا اور اس نیت کا اظہار اپنی دو عمارتوں کے ذریعہ کیا یعنی قطب مینار جو ہنوز اپنی جگہ پر کھڑا ہے اور مسجد قوت الاسلام جسکی نیم شکستہ محرابیں اسکی عظمت پارینہ کی داستان سنارہی ہیں۔ اس وقت سے مختلف طبقوں کے لوگ اسلامی ملکوں کے مختلف شہروں سے اور خاص طور سے ماوراء النہر اور خراسان سے آکر ہندوستان میں مقیم ہونے لگے اکثر وبیشتر لوگ دہلی کو اپنی منزل گاہ سمجھتے تھے۔ حسن نظامی بھی اہل قلم کے طبقے کا ایک دانشمند تھا جو خراسان

کے تاریخی شہر نیشاپور سے نکل کر مختلف شہروں میں گھومتا پھرتا خصوصاً غزنی اور لاہور کے علماء صوفیاء اور اہل کمال کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتا ہوا ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء میں دارالسلطنت دہلی میں وارد ہوکر اقامت پذیر ہوا۔ علائم سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کے ترک حکمراں اس مرحلہ پر اپنی ساری توجہ اور توانائی انتظامی امور پر لگائے ہوئے تھے۔ فوجی تصرف کے بعد امور ملکی پر گرفت مضبوط کرنا انکا اولین مقصد تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں حکمراں طبقے کو ایسے مشاغل سے کوئی دلچسپی نہ تھی جو فرصت اور بے فکری چاہتے تھے۔ حسن نظامی کا تعلق خاص دانشوروں کے طبقے سے تھا جنکو عملی زندگی کی ہمہ وقت سرگرمی سے شدید الجھن ہوتی ہے اس نے یہاں آکر عجیب صورتحال فوراً محسوس کرلی۔ فطری طور سے اہل سیف اور اہل قلم میں جو ایک طرح کی بیگانگی اور فاصلے کی عادت ہوتی ہے اسکے ناگوار اثر سے حسن نظامی محفوظ نہ رہ سکا بہرحال اسکے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ تازہ قائم شدہ اور تیزی سے پھیلتے ہوئے معاشرے میں اہل قلم کی برتری اور اہمیت کا احساس دلانے کے لئے اسکو جدو جہد کرنی پڑے گی یہ خیال آہستہ آہستہ اسکے دل میں ایک مقصد بنکر کروٹیں لینے لگا ایک اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ حسن نظامی دہلی آکر بیمار ہوگیا اور بیماری کے عرصے نے خاصا طول کھینچا اس صورتحال نے اسکے دل میں غریب الوطنی اور بیکسی کے جذبے میں مزید اضافہ کردیا ترک اہل قلم تھے

امور ملکی کے تقاضے پورا کرنا وہ خوب جانتے تھے نئے معاشرے کی اصلاح و تنظیم قائم رکھنے کے لئے طبقۂ علماء کی موجودگی انکی سمجھ میں آتی تھی مگر خالص دانشور طبقہ جو بظاہر کسی عملی جدوجہد میں شریک نہیں ہوتا اور صرف خیالات کو سوچتا ہے یا انکا اظہار نظم یا نثر کے ذریعہ کرنے میں اپنا سارا وقت گنوا دیتا ہے ایسے طبقے کی موجودگی ترکوں کے سمجھ کی بات نہ تھی شاید وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان میں ایسی صورتحال میں اس طبقے کی موجودگی بہت زیادہ ضروری نہیں ہے اس صورتحال کے برخلاف حسن نظامی کو اپنی فضیلت اور علمی صلاحیت کا غیر معمولی شعور تھا اور اسکے ذہن پر "بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال" والے مقولے کا نقش بہت گہرا معلوم ہوتا تھا اس نے دہلی کے مختلف حلقوں میں اپنی کسمپرسی اور خستہ حالی کی نہایت تلخ لفظوں میں شکایت شروع کردی اسکو بعض لوگوں نے تسلی دی اور یہ تاکید کی کہ اگر وہ واقعی علم و فضل کا جوہر رکھتا ہے تو اسکے اظہار کی صورت اختیار کرنی چاہیے اور انہوں نے یقین دلایا کہ اگر اس نے قلم کے ذریعہ اپنی علمی صلاحیت کو دکھایا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بےقدری کا شکار رہے بلکہ یقیناً اسکی قدر ہوگی۔ دوستوں کی رہنمائی اور تجویز پر کہ ہندوستان کی فتح ایک یادگار کارنامہ ہے لہذا کیوں نہ وہ اس کارنامے کو تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اپنے قلم کے ذریعہ محفوظ کردے ایک اور وجہ یہ بھی ہوئی کہ اسی زمانے میں سلطان قطب الدین ایبک نے بھی اپنی فتوحات

کا حال لکھنے کا حکم دیا تھا۔ مختصر یہ کہ دہلی کے دوستوں کی تجویز اور بادشاہ وقت کی خواہش نے اسکو ذہنی طور سے اس کام کے لئے آمادہ کیا اور تاریخ نگاری کی تحریک کی جس کے نتیجے میں اس نے تقریباً ۲۴ سال کے واقعات ۵۸۷ - ۶۱۲ قلم بند کر دیے اور اپنی تاریخ کا عنوان "تاج المآثر" قرار دیا یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے پاس نہ تو ایک مورخ کا فطری مزاج تھا اور نہ ہی تاریخ نگاری کی باقاعدہ تربیت۔ پھر بھی اس نے اپنے مقصد میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ وہ محض اپنی فضیلت نمائی کی خاطر فارسی کے بڑے مورخین کی دکھائی ہوئی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور سیدھا سادھا انداز بیان اختیار نہیں کرتا۔

تاج المآثر میں واقعات کی تصویر بہت روشن نہیں ہے وہاں یہ مشکل سے نظر آتا ہے کہ واقعات کس طرح آگے بڑھ رہے ہیں اور کون سی شخصیات کیا کردار ادا کر رہی ہیں اور حالات میں کس انداز کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ سیاسی صورتحال کے مشاہدے سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا وہ حالات کی ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال تبدیلی کو بظاہر غور سے نہیں دیکھتا بلکہ اسکی توجہ قدیم عربی اور فارسی کے بے شمار شاعروں کے اشعار کا ذخیرہ جمع کرنے اور اسکو محفوظ کرنے پر لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاج المآثر کا حجم فارسی و عربی کے قدیم شعراء کے اشعار پر منحصر ہے اس کتاب میں کل بارہ ہزار سطریں

ہیں جن میں سے تقریباً سات ہزار سے زیادہ ہی عربی اور فارسی کے اشعار ہیں جبکہ نثر کا حصہ پوری کتاب کا آدھا ہے اور اس نثر میں بھی اتنی زیادہ مقفی .. اصطلاحات اور بوجھل محاورات ہیں کہ انکے اندر سے تاریخی اطلاعات کو برآمد کرلینا ایسا ہی ہے جیسے "کوہ کندن و کاہ برآوردن" یا دوسری مثال یوں سمجھے کہ خاک کے انبار میں سے سونے کے ذرات کا تلاش کرنا ۔ گمان یہ ہے کہ اتنے بے شمار اشعار اسکو یاد نہ ہونگے اس لئے یقیناً اس نے اپنی کتاب کی تالیف میں بے شمار علمی اور ادبی ماخذوں سے استفادہ کیا ہوگا یہی اس کتاب کی خوبی ہے اور اسی کو خامی بھی سمجھنا چاہئے ظاہر ہے کہ تاریخ کتابیں پڑھکر نہیں لکھی جاتی .. بلکہ ہوشیاری اور بیدار دلی کے ساتھ خارجی حالات کا مشاہدہ کرکے لکھی جاتی ہے مورخ اپنے کتاب خانے میں بیٹھ کر کام مکمل نہیں کرتا بلکہ وہ میدان جنگ سے لیکر دربار شاہی تک اور دربار شاہی سے عوام کے بازاروں تک ہر جگہ جاکر مشاہدہ کرتا ہے اپنے معاصرین .. سے ملتا ہے اور اس عہد کی عظیم شخصیتوں کے عملی کردار کا خاموشی سے محاسبہ کرتا ہے وہ اس کتاب میں ایک مورخ کا خارجی انداز چھوڑ کر خالص داخلی انداز اختیار کرتا ہے مثلاً وہ متعدد موضوعات پر اپنے تخیل کا رنگ چڑھاتا ہے جیسے شاہی درباروں کی رنگ رلیاں، ساقی کا جلوہ، موسم بہار کی رونق، قلم کی گلفشانی وغیرہ وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ اس طرح

کی رنگین نثر وہ اپنے معاصرین کا دل خوش کرنے کے لئے اور اپنی رنگین بیانی کی داد لینے کے لئے لکھ رہا تھا۔ اسکے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں تھی کہ اسکو درست اور باقاعدہ اطلاعات کی ایک دستاویز اگلی نسلوں کے لئے چھوڑنا ہے، وہ اپنی تالیف کے ابواب یا قطعات کو دوستوں کے حلقے میں پڑھکر سناتا تھا اور اپنی تعریفیں سنکر جی خوش کرتا تھا اس طرح ہمعصر دوستوں کو خوش کرنے کی کوشش میں وہ آنے والی نسلوں کو بھول گیا۔ اسکے زمانے میں فارسی زبان میں اس نوعیت کی تالیفات خاصی لکھی جا چکی تھیں جس میں اہل قلم اپنے مربی کی فتوحات کا ذکر کرتے تھے اور جنکو عرف عام میں فتح نامہ کہا جاتا تھا وہ رزمیہ انداز کے فتحنامے سے خاصا متاثر نظر آتا ہے اس نے اس کتاب کو ترائن کی دوسری جنگ سے شروع کیا ہے جس میں محمد غوری کو آخری اور حتمی فتح حاصل ہوئی تھی اگر وہ ایک غیر جانبدار اور سنجیدہ مورخ ہوتا تو واقعات کا سلسلہ ترائن کی پہلی جنگ سے شروع کرتا جس میں محمد غوری بری طرح شکست کھا گیا تھا اور بڑی مشکل سے میدان جنگ سے زخمی حالت میں زندہ نکالکر لے جایا گیا تھا۔ مؤلف نے کتاب کے آغاز میں ایک طولانی بحث چھیڑی ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ آسمانی قانون اور انسانی عقل دونوں کا تقاضہ ہے کہ کفار سے جنگ کی جائے یہی دین اور حکومت دونوں کے مقاصد ہیں۔ اس دلیل کو تنقید کی کسوٹی پر جانچا جائے تو اندازہ

ہوگا کہ ترکوں کے یہاں نظریہ اور عمل میں ایک گہرا تضاد تھا ترک بنیادی طور سے سپاہی پیشہ
اور عیش پسند تھے انکا سیاسی اور اجتماعی کردار کہیں اس نظریہ کی حمایت نہیں کرتا جسے
مورخ نے نہایت اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے ترک دنیا کی تمام توسیع پسند اور فرمانروا
قوموں کی طرح مذہب کو اپنی روز مرہ کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہ
تھے وہ اپنے فرمانروائی کے مفاد اور سیاسی مصلحتوں کو سب سے زیادہ مقدم سمجھتے تھے انکی
نظر میں اسلام کا پیغام دوسرے درجہ کی ضرورت تھا اس اعتبار سے حسن نظامی کی تاریخ کو
احتیاط سے پڑھنا چاہئے وہ جس جوش و خروش کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اور توسیع
کا تذکرہ کرتا ہے وہ حقیقت سے بہت زیادہ نزدیک نہیں ہے۔ حسن نظامی کے اس دعوی کو
ہرگز تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ترکوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرلی تھی یا
کم ازکم انکی حکومت اسلامی اصولوں کی تابعدار تھی۔ آخر میں لب لباب کے طور
پر یہ کہنا مناسب ہوگا کہ حسن نظامی کی کوشش رائیگاں نہیں گئی اور نہ اسکی تالیف اہمیت
سے خالی ہے۔ وہ بعد میں آنے والے تمام قابل ملاحظہ مورخین کا نشان بردار ہے
جہانگیری اور جہانبانی کے بارے میں اسکے نظریات عدل اور اچھے انصاف کی بابت اسکی مکرر تاکید
نہایت قابل قدر بات ہے جسکی بنیاد پر اسکو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جائیگا۔

طبقات ناصری :-

منہاج سراج جوزجانی ایک وسیع پیمانے پر تاریخ لکھنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے
اور نہایت سنجیدہ فکر رکھنے والے مؤرخ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے حالانکہ وہ تربیت اور
پیشے کے اعتبار سے ایک فقیہ تھا وہ فیروزکوہ میں ۵۸۹/۱۱۹۳ میں پیدا ہوا تھا جہاں
سے تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے ۶۲۴/۱۲۲۶ میں ہندوستان آیا اور غوری حکمراں کے والی
ناصرالدین قباچہ کے پاس پہونچا جہاں اسکی بڑی پزیرائی ہوئی اور اوچ کا مدرسہ فیروزی اسکے سپرد
کردیا گیا لیکن جب قباچہ اور التمش کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور شمس الدین التمش نے
ناصرالدین قباچہ کو شکست دی تو التمش کی دعوت پر وہ بھی دوسرے علماء کی طرح دہلی آگیا اور
التمش اور اسکے جانشینوں کے زمانے میں دہلی کا قاضی رہا اسکی محفل وعظ میں جیسا کہ اس نے خود
ایک جگہ بیان کیا ہے تمام صف اول کے امراء کے علاوہ اکثر اوقات التمش بھی شریک ہوتا تھا۔
اسکے خاندان میں فضیلت اور امارت دونوں شرف مشترک ہوگئے تھے اسکے دادا امام عبدالخالق جوزجانی
کو جوکہ اپنے علم اور زہد و تقوی کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور تھے ان سے غزنوی خاندان
کی ایک شہزادی منسوب ہوئی تھی مشہور ہے کہ سلطان ابراہیم غزنوی کے چھتیس لڑکے اور چالیس
لڑکیاں تھیں اس نے اپنی تمام لڑکیوں کی شادی ایسے اشخاص سے کی تھی جو علم و فضل تقوی
اور طہارت میں اعلی مقام رکھتے تھے اس اصول کی بناء پر اتفاق سے سلطان کی ایک بیٹی منہاج سراج

کے حصے میں بھی آئی تھی منہاج سراج کے آباؤاجداد اپنے علاقے کے شہزادوں اور فرمانرواؤں
کے درمیان مناقشات کو روکنے میں اکثر ثالث بالخیر کی خدمت انجام دیتے تھے اور وہاں کے
وسیع علاقے پر حکومت کرنے والے چھوٹے چھوٹے بادشاہ انکا بڑا احترام کرتے تھے۔منہاج خود بھی
بچپن میں غور کے شاہی خاندان میں پلا تھا۔سلاطین غور کی حکومت کے چار مراکز تھے گو یا غور کے
شہزادوں کی حکومت چار حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی یہ مراکز تھے فیروزکوہ، نیمروز، بامیان اور غزنی
منہاج سراج کی ابتدائی تعلیم و تربیت سلطان غیاث الدین فیروزکوہ کی بیٹی شہزادی ماہ ملک نے
اپنی نگرانی میں کی تھی [1] وہ شہزادی کو نہایت احترام کے ساتھ یاد کرتا ہے اور اسکی محبت کو
شفقت مادری کے برابر تصور کرتا ہے جب اس نے انہتر [69] سال کی عمر میں اپنی کتاب الضد ختم کی تو
وہاں یہ ذکر کیا کہ مجھ کو اپنی ماں کی جگہ ماہ ملک یاد آتی ہے وہ شہزادی کی اعلیٰ تعلیم،
فیاضی، ذہانت اور خدا ترسی کو یاد کرکے بہت زیادہ تعریف کرتا ہے اس نے ہندوستان میں
وارد ہونے سے پہلے نہایت عبرت آموز اور خونی انقلاب کا مشاہدہ کیا تھا اور وہ منگولوں
کے بڑھتے ہوئے وحشیانہ سیلاب کا شاہد عینی تھا جسکی زد میں شہر کے شہر اور پوری پوری
آبادیاں ویران ہوتی چلی گئیں یقیناً ایسے شدید اور عبرت انگیز حادثات کو دیکھ کر اسکا احساس
اور مشاہدہ نہایت تیز ہوگیا تھا اور شاید انہیں مشاہدات نے اسکو ایک بلند پایہ مورخ بننے

---

[1] طبقات ناصری ص ۲۸

میں اسکی زبردست مدد کی، منہاج کے دور کی تاریخ ساز قوتیں خاص طور سے چار تھیں یعنی خوارزم شاہی سلسلہ اسماعیلیہ، سلاطین غور، اور تاتاری حملہ آور ... اس نے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے ان چاروں قوتوں کا اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا مگر جب اس نے مسلمانوں کو تاتاریوں کے سامنے بے بس پایا تو مجبور ہوکر اسکو ہندوستان کا رُخ کرنا پڑا۔

منہاج کی طبقات ناصری اسکے ستر برس کی عمر میں ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء میں منظر عام پر آئی اور فوراً ہی ایک مشہور اور مقبول تاریخ سمجھی جانے لگی اس وقت سے آج تک علم تاریخ کے دانشمند اسکو ایک اہم تالیف تصور کرتے چلے آئے ہیں وہ مقدمہ میں اس بات کا ذکر بھی کرتا ہے کہ کس طرح اس تالیف کے محرکات فراہم ہوئے: "یہ ضعیف اور حقیر منہاج سراج دعا گوی مسلمانان عرض کرتا ہے کہ ایک بار میں عمادی کی تاریخ مجدول کا مطالعہ کررہا تھا عمادی کی تاریخ کو پڑھکر میرا جی چاہا کہ میں اسی انداز کی ایک تاریخ لکھوں اور اس میں بیان واقعات کو سلطان التمش کے زمانے تک لاؤں" عبرت کی بات یہ ہے کہ عمادی کی تاریخ جسکا حوالہ منہاج سراج نے دیا ہے بعد کو نایاب اور مفقود ہوگئی اور آج عمادی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ منہاج نے محض انکساری اور خاکساری کے طور پر یہ بات کہی ورنہ اسکی تالیف کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علم تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتا

تھا اور اسکی نظر تاریخ کے واقعات پر بہت دور تک تھی طبقات ناصری کا مطالعہ یہ واضح کردیتا ہے کہ یہ کتاب بہت بھرپور تیاری کے بعد لکھی گئی ہے۔ منہاج کو اس کتاب کی تالیف کا حکم سلطان وقت التمش نے نہیں دیا تھا نہ ہی کسی دوسرے حاکم اور دانشمند نے ہی اسے اس بات کا شوق دلایا تھا بلکہ وہ اپنی فکر اور اپنی نیت سے اس کام پر جان کھپانے میں لگ گیا تھا یقیناً اسکی دانشمندی کا یہ تقاضہ تھا کہ اپنے عہد کے طبقہ امراء اور اہل اقتدار کو جہانبانی اور جہانگیری کی تعلیم دے اور انکے سیاسی تجربات کو وسیع کرے وہ ایک سنجیدہ مقصد سامنے رکھتا تھا اس نے اپنی تاریخ کی تالیف میں طبقات کا طریقہ اختیار کیا جو عرب مورخین کا سب سے معروف اور دلنشین معمول تھا یعنی بنی آدم کی سرگزشت اور انسانی قافلے کے منزل بہ منزل سفر کی داستان ملاحظہ کرنا ہو تو وقت کو مختلف طبقات یعنی تہوں میں بانٹ دیجئے اور پھر ایک کے بعد دوسری تہہ سلسلے وار اٹھاتے چلے جائیے۔ ماضی کے سانحات جو وقت کی تہوں میں دفن ہیں خود بخود سامنے آتے چلے جائینگے۔ غرض کہ تاریخ کو طبقات میں لکھنے کا طریقہ مسلمان مورخین بہت پہلے سے جانتے تھے اور منہاج کے سامنے متعدد درخشاں نمونے موجود تھے جسکی وہ کامیابی کے ساتھ پیروی کرتا ہے البتہ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ منہاج نے اپنی کتاب میں۔ جہاں بھی مناسب سمجھا ہے وہاں ابداع اور تنوع سے کام لینے میں

ذرا بھی تکلف نہیں کیا ہے اس کتاب میں آفرینش عالم سے لیکر ۱۲۵۸/ ۶۵۸ تک کے
تاریخی واقعات درج کئے ہیں کتاب کا پہلا طبقہ انبیائے کرام سے متعلق ہے اور حضرت آدم
سے لیکر خاتم النبیین صلعم تک آتا ہے اسکے بعد آگے کے طبقوں میں ایران کی قبل اسلام کی تاریخ اور
عرب کے جاہلی دور کے حالات خصوصاً یمن کے بادشاہوں کا ذکر ملتا ہے عرب کے جاہلی دور
میں اس جزیرہ نما کا جنوبی حصہ یعنی یمن ہی تہذیب وتمدن کا مرکز تھا فارسی کے تمام مورخین
کی طرح وہ بہت جلد اپنی توجہ عالم اسلام کے مشرقی حدود تک ڈالتا ہے اور خاص طور سے
ایران کے مشرقی خاندانوں پر روشنی ڈالتا ہے جنکو جدید دور میں دور احیاء کی سلطنتوں کے نام
سے تعبیر کیا جاتا ہے مجموعی طور سے کتاب میں تیئس[۲۳] طبقات ہیں آخر کے دس طبقات جس
میں سلاطین غزنی اور بعد کے شاہی سلسلوں کا تذکرہ ہے وہ یقیناً انتہائی قیمتی معلومات سے بھرپور
ہیں ۔ مورخ ان ابواب میں بیشتر ایسے حالات لکھتا ہے جنکی وہ ذاتی طور سے اور نہایت تفصیل کے
ساتھ اطلاع رکھتا ہے طبقات نویسی عام طور پر دوسری تاریخوں سے ایک اعتبار سے جدا اور
امتیازی خصوصیت کی حامل ہوتی ہے ۔اس میں ہمیشہ سے سوانح نگاری کا رجحان غالب رہا
ہے یہی شکل منہاج سراج کی تالیف طبقات ناصری میں بھی صاف نظر آتی ہے وہ اپنے
عہد کے نزدیک کے حکمرانوں اور امیروں کی زندگی کے حالات ایسی تفصیل سے لکھتا ہے کہ

سانحات شخصی سوانح کی پرچھائیں میں مدھم ہو جاتے ہیں منہاج اس رجحان کی تائید کرتا ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ تقدیر خاص یاوری اور کمک کرتی ہے مثلاً محمد بن سام غوری اپنے خاندان کے دوسرے فرمانرواؤں کی بہ نسبت نہایت معمولی اہلیت کا انسان تھا پھر بھی ہندوستان کی فتح ایک عظیم کارنامہ ہے جو اسکے حصے میں آیا اور اس نے ایک ایسے تاریخی عمل کی بنیاد رکھی جسکے نتائج بہت دور تک چلے گئے وہ ہندوستان پر محمد غوری کی فتح کی اہمیت اور اسکے گہرے نتائج کو اچھی طرح سمجھتا ہے اور اپنے اندازے کے مطابق معزالدین محمد بن سام غوری کو سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہم پلہ قرار دیتا ہے جس نے تیسری صلیبی جنگ میں یورپ کے عیسائیوں کو شکست دی تھی ۔ وہ اپنی تاریخ کا ایک باب مغربی ایران کے کرد سلسلے کا ذکر کرنے کے لئے وقف کرتا ہے یہ ایک ایسا تنوع ہے جو اس سے پہلے فارسی کے کسی مورخ کے یہاں نظر نہیں آتا وہ ایک جداگانہ باب میں سلاجقہ روم یعنی اناتولیہ کے شاہی خاندان کو بھی توجہ کا موضوع قرار دیتا ہے یہی وہ خاندان ہے جس نے صلیبی حملہ آوروں کے طوفان کا مقابلہ کیا اس وجہ سے انکی اہمیت پوری اسلامی تاریخ میں منہاج کے زمانے میں اور اسکے بعد محسوس ہونے لگی تھی البتہ منہاج سراج یہاں بھی فارسی زبان کا پہلا مورخ ہے جس نے سلاجقہ روم کے حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آخر کے دو باب جو

التمش اور اسکے جانشینوں سے متعلق ہیں وہ خاص اہمیت کے حامل ہیں ان ابواب کے مطالعہ سے پچاس برس کے حالات روشن ہو جاتے ہیں التمش کی تخت نشینی سے لیکر اس سال تک جب کہ مورخ نے اپنا قلم رکھا اور کام ختم کیا پوری نصف صدی کا عرصہ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ منہاج اس پورے زمانے کا شاہد عینی تھا اور اسکی سیاسی حالات اور تبدیلیوں پر پوری طرح نظر تھی لہذا مذکورہ بالا دو ابواب کو التمش اور اسکے بعد کی نصف صدی پر محیط زمانے سے متعلق سب سے معتبر شہادت سمجھنا چاہئے اس نے ان ابواب میں شامل اطلاعات کو یا تو انتہائی ذمہ دار لوگوں سے سنکر لکھا تھا یا وہ شخصی طور سے حالات کی رفتار کا شاہد عینی تھا وہ تقریباً پچیس امراء کے سوانحی خاکے دلچسپ انداز سے بیان کرتا ہے جو التمش کے بعد سب سے زیادہ طاقت رکھتے تھے اور وہی آپس کے اتفاق اور بعض اوقات رشک و رقابت کے ذریعہ حکومت کے بست و کشاد کو انجام دیتے تھے ان میں تقریباً سب ہی ایسے تھے جنکی زندگی بردہ فروشوں کے بازار سے شروع ہوئی تھی وہ سب حتی کہ سلطان التمش بھی اپنی اس حقیقت کو ظاہر کرنے سے بالکل نہیں شرماتے تھے۔ مورخ کو اپنے مربی سلطان ناصر الدین محمود کے عہد سلطنت کے پندرہ سال کا بیان تفصیل سے کرنا مقصود تھا لہذا وہ اس مرحلہ پر پہونچکر سال بسال کے حساب سے واقعہ قلمبند کرتا ہے البتہ اس عہد کی تفصیلات

بہت دلچسپ ہیں اور گہرا تاثر قائم کرتی ہیں مورخ نے اپنی توجہ دربار تک محدود
رکھی ہے اور دہلی کی حکومت کے حالات کی رنگ برنگی تصویر ہر دور تک نظر ڈالنے سے پرہیز
کیا ہے آخری طبقہ میں منگولوں یعنی تاتاریوں کے حالات اور انکے ذریعہ پھیلی ہوئی
ہلاکت اور تباہی کا تذکرہ تفصیل سے پیش کیا ہے اس باب میں صحیح حالات کے
علاوہ ایسی ضعیف روایات بھی ہیں جنہیں مولف نے ہندوستان میں آنے کے بعد یہاں وارد
ہونے والے مسافروں، مہاجروں اور تاجروں سے سنی تھیں وہ اس باب میں چنگیز خان کے
وضع کئے ہوئے قوانین کا بھی ذکر کرتا ہے جو منگولی زبان میں "یاسا" کہلاتے تھے۔

منہاج سراج فرقہ اسماعیلیہ کا ذکر کرتے . . وقت اپنے عہد
کے تعصبات سے بلند ہوکر ایک مفکر تجربے کار مورخ کا ثبوت دینے سے قاصر رہ جاتا
ہے وہ فرقہ اسماعیلیہ کے بارے میں انتہائی حقارت کے ساتھ وہی سب قصے اور افترا
پردازی کی داستانیں لکھ جاتا ہے جو اسکے ہمعصر عوام میں مشہور تھے یقیناً انکی
تحریک نے اسلام کے جسد سالم میں ایک گہرا رخنہ اور تقسیم پیدا کر دیا تھا یہ بھی
درست ہے کہ وہ امامت کے نظریے کو پیش کرکے خلافت اور خاص طور سے خلافت
بنی امیہ اور خلافت بنی عباس کی حکومت کرتے تھے مگر اسلامی معاشرہ میں انکے

ساتھ جو تشدد برتا گیا اور جس طرح کا ظلم انکے ساتھ روا رکھا گیا اسکو بھی ایک غیر جانبدار نظر سے دیکھنا چاہئے عالم اسلام کے بے شمار لوگوں کا اسماعیلیہ کی تحریک میں شامل ہو جانا اور اس تحریک کے اثرات کو قبول کر لینا عقلی اور جذباتی اپیل کے بغیر ہرگز ممکن نہیں تھا منہاج سراج اس مسئلہ کو ایک سنجیدہ دانشور کی نظر سے غور کرکے دیکھنے کے بجائے خالص تعصب کی عینک سے دیکھتا ہے ۔

مختصر طور سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منہاج سراج ایک قاضی کی حیثیت سے نہایت مشغول زندگی گذارتا تھا ظاہر ہے کہ اختلافات اور اسکے نتیجہ میں طرح طرح کے مقدمات کا دائر کرنا انسان کی پرانی عادت ہے اور یہ قصہ انسانی معاشرہ میں تہذیب کے ابتدائی مرحلہ سے ہی شروع ہو چکا تھا منہاج بنیادی طور سے ایک قاضی کے فرائض انجام دیتا تھا اور اسکا پیشہ اسکے لئے فرصت کے بہت ہی تھوڑے لمحات چھوڑتا تھا پھر بھی ایسی شاندار اور دلچسپ تاریخ کی تالیف مکمل کر لینا اسکا ایک قابل تعریف کارنامہ ہے منہاج سراج نے اپنی اس کتاب کو تکمیل کرنے کے بعد اسے اپنے مربی ناصرالدین محمود کے نام معنون کیا ۔

تاریخ فیروز شاہی

ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی اپنی کتاب میں ایک جگہ
دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے اس تاریخ کو لکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے غور سے دیکھنے
پر اندازہ ہوتا ہے کہ برنی نے اپنے دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے واقعی اس نے
بلبن سے لیکر فیروز شاہ تغلق تک جن سلاطین کا ذکر اپنی تاریخ میں کیا ہے انکو اپنے قلم کی طاقت
سے زندۂ جاوید بنا دیا ہے برنی نہ صرف ایک سیاسی مبصر ہے بلکہ ایک تخلیقی فنکار بھی ہے
جو تاریخ کے خشک اور بے مزہ واقعات کو ایک انتہائی دلچسپ روداد اور طربیہ و المیہ
کی ملی جلی داستان بنا کر پیش کرنا جانتا ہے اس نے طبقہ اشراف کے نہایت امیر گھرانے
میں آنکھ کھولی تھی۔ اسکے پدری اور مادری سلسلے کے بزرگ اقتدار کے انتہائی اعلیٰ مقامات پر
فائز تھے اسکی جوانی عیش و عشرت میں گذری تھی اور وہ ترکوں کے طبقہ حاکم کی رنگ رلیوں
کے مزے اچھی طرح چکھ چکا تھا کیونکہ وہ عرصہ دراز تک ندیم سلطانی رہا تھا ندیم کا عہدہ
اپنی مخصوص نوعیت کی بنا پر ایک باقاعدہ ادارے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا یہ ادارہ جیسا کہ مورخین
بیان کرتے ہیں خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں تشکیل پایا تھا۔ سب سے پہلے وہی اپنی مخصوص
محفلوں میں چند مخصوص لوگوں کو دعوت دیتے تھے جو ندیم کہلاتے تھے نظام الملک طوسی

اپنی مشہور آرا تالیف "سیاست نامہ" میں ندیم کے منصب کی کیفیت اور نوعیت کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں :" ندیم کو ہمہ وقت دربار میں جانے کا حق تھا حتی یہ کہ وہ سلطان کی محفل خاص میں داخل ہو کر بادشاہ کے مقرب کی حیثیت سے اسکے پاس بیٹھ بھی سکتا تھا، ضرورتاً ندیم ہر طرح کی سرکاری ذمہ داریوں کے انجام دینے سے مستثنیٰ رہتا تھا اس لئے کہ خدمت اور امور کی انجام دہی کے نتیجے میں ماتحتی کا تصور لازمی تھا اور ندیم کسی کا ماتحت نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ بادشاہ کے پاس کسی بھی وقت آکر اسکا جی خوش کر سکتا تھا نظام الملک کے نزدیک بادشاہ چونکہ ہر وقت نہایت سنجیدہ مسائل میں گھرے رہتے ہیں اور تھک جاتے ہیں لہذا انکا جی خوش کرنے کے لئے اور انکی طبیعت سے کدورت کو دور کرنے کے لئے ایسے نکتہ داں حاضر جواب اور خوش فکر اصحاب کی ضرورت ہوتی تھی جو بادشاہ کو خوش و خرم رکھیں اور اپنی باتوں سے سلطان کی طبیعت تازہ کریں اور اگر سلطان کا جی شراب و شاہد کی طرف مائل ہو تو اس میں بھی سلطان کے ہم پیالہ اور ہمراز رہیں یہ ندیم کی ذمہ داریاں تھیں جو نظام الملک نے پہلی بار اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں ۔

جب ہم ضیاء الدین برنی کو ندیم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ خود مدعی ہے تو ایک نتیجہ صریحی طور پر برآمد ہوتا ہے یعنی وہ علماء اور فضلا کے اس طبقہ سے بالکل تعلق نہیں رکھتا جن کی زندگی قال اللہ اور قال الرسول میں گذرتی ہے اور نہ ان کے تقویٰ اور طہارت

کی تربیت حاصل کی تھی جو قرون وسطی کے علماء کی زندگی میں لازمی شرط سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان علماء کے آداب میں ہر اس چیز سے پرہیز لازم تھا جسکو شریعت نبوی حرام قرار دیتی ہے۔ اسکے برخلاف ندیم کی زندگی میں حرام و حلال کی کوئی قید نہ تھی۔ اس کی راتیں سلطان کی بزم خاص میں شراب و سرور اور رقص و موسیقی کے مشاغل میں گزرتی تھیں البتہ جس وقت برنی تاریخ فیروز شاہی لکھتا ہے اس زمانے میں اسکی عمر چوہتر کے قریب پہونچ چکی ہوتی ہے اور وہ عرصہ دراز سے تائب ہوچکا ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت مذہبیت یا دوسرے لفظوں میں کہا جائے تو مذہبی احساسات کا شدید غلبہ طاری تھا جو شاید جوانی کی بےاعتدالیوں اور امیرانہ عیش و نوش کا لازمی رد عمل تھا اس قسم کا رد عمل اکثر لوگوں کی زندگی میں دیکھا گیا ہے اگر برنی نے یہ تاریخ کچھ پہلے لکھی ہوتی تو شاید اسکا لہجہ ایسا نہ ہوتا جیسا کہ تاریخ فیروز شاہی میں نظر آتا ہے ۔ برنی کی طبیعت اعتدال سے آشنا نہیں تھی وہ زندگی کے ایک سرے پر ترکوں کے حکمران طبقے کی عیاشیوں میں شریک رہ چکا تھا اور جب بڑھاپے میں رد عمل ہوا تو وہ ایک دوسرے سرے پر جا کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے جہاں وہ نہایت شدت کے ساتھ نیکی، راست بازی اور پرہیزگاری کی اہمیت کا احساس کرتا ہے۔ یہی احساس تاریخ کا ایک واضح فلسفہ دریافت کرنے میں اسکی راہنمائی کرتا ہے یعنی وہ یہ تاکید کرتا ہے

کہ راست بازی اور عدل و انصاف کی صاف ستھری زندگی کے بغیر نہ افراد کی نجات ممکن ہے

نہ شاہی سلسلے خوشحال اور کامرانی کے ساتھ اپنے تسلط اور اقتدار کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔ وہ

بحیثیت مؤرخ سیاست اور اخلاق کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔

برنی کو اپنے مربی سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد ۷۹۲ھ

مطابق ۱۳۵۱ء برے دن دیکھنے پڑے وہ نہ صرف شاہی خدمات سے محروم ہو گیا بلکہ اپنے حریفوں

کی ریشہ دوانی کا بھی شکار ہوا اور نہ صرف عہدہ اور منصب گیا بلکہ اقتصادی وسائل کے اعتبار سے

بھی اسکو سختی جھیلنی پڑی۔ ان نا مساعد حالات کے علاوہ ایک احساس جو دل پر بار بار نشتر

زنی کرتا تھا وہ یہ تھا کہ زندگی کا بیشتر حصہ اس نے عیش و عشرت میں گزارا ہے ان احساسات

نے ملکر طبیعت کو پژمردہ کر دیا تھا۔ وہ اس داخلی پژمردگی سے نبٹنے کے لئے قلم ہاتھ میں لینے پر

مجبور ہو گیا۔ دراصل اسکے داخلی اور خارجی حالات نے ملکر اسکو ایک مؤرخ اور اہل قلم بننے پر مجبور کیا۔

وہ ایک خاص مقصد سے تاریخ نویسی پر توجہ کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ گذشتہ پچانوے[۹۵] برس کی

مفصل روداد اپنے مربی سلطان فیروز شاہ تغلق کے سامنے بے کم و کاست لکھ کر رکھ دے تاکہ

سلطان کے سیاسی تجربے میں اضافہ ہو اور چشم دل روشن ہو جائے وہ دوسرے معروف اور معتبر اسلامی

مؤرخین کی طرح بہت بڑے پیمانے پر تاریخ عالم لکھنے کا خیال ہرگز اپنے دل میں نہیں رکھتا

وہ واقعات کو وہاں سے بیان کرتا ہے اور ڈوری کا سرا خاص اس جگہ سے پکڑتا ہے جہاں
سے منہاج سراج نے چھوڑا تھا (١٢٥٩/٦٥٨) منہاج سراج جہاں تک سلسلۂ حادثات کی
روداد سنا چکا ہے برنی باقاعدگی کے ساتھ وہیں سے آگے بڑھتا ہے اور اگلے بچانوے برس کا
جائزہ لینے پر توجہ مذکور کر دیتا ہے (١٢٥٩/٦٥٨ تا ١٣٥٢/٧٥٣) وہ اپنی تاریخ کے
حدود خود اپنی زبان سے اس طرح بیان کرتا ہے: "اور اس بچانوے[95] برس کے عرصہ میں آٹھ

سلاطین مزید تین کے علاوہ دہلی کے تخت سلطنت پر بیٹھے ہیں جن کا میں خود شاہد عینی
ہوں یا جن کے حالات میں نے عینی شاہدوں سے سنے ہیں"

برنی اس زمانے میں جبکہ وہ سلطان کے غیض و غضب کا شکار ہے اور دربار سے دور کس مپرسی
کی زندگی گذار رہا ہے اسی عالم میں وہ دو مزید تالیفات مکمل کر ڈالتا ہے پہلی "فتاوای جہانداری"
ہے، جو برنی کے سیاسی نظریات پر ایک معتبر دستاویز تصور کی جاتی ہے اور انداز بیان کی
دلچسپی کے اعتبار سے ایک بہترین کتاب کا درجہ پانے کی مستحق ہے دوسری کتاب کا عنوان
"نعت محمدی" ہے یہ کتاب برنی نے سرور کائنات کی مدح اور ثنا میں لکھی تھی وہ ذاتی طور سے

اس تالیف کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"کیونکہ میں نے اپنی زندگی گناہوں میں گزاری ہے اور مجھے اپنی عاقبت کا خیال کر کے بڑھاپے

ں بہت زیادہ تشویش لاحق ہے میں نے سوچا کہ سرورِ کائنات کا دامن پکڑوں تو شاید میری

شفاعت اور بخشش کا سامان ہو جائے یہ سوچ کر میں نے نعت محمدی لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے"۔

بہر حال برنی کی زیادہ اہم اور قابل قدر کتاب تاریخ فیروز شاہی کے بعد فتاویٰ جہانداری ہے

جسکی وجہ سے وہ اسلامی تہذیب کے معروف و معتبر سیاسی مفکرین کی صف میں جگہ پاجاتا ہے۔ ہم برنی

کے سیاسی نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان نظریات کا

اثر ہندوستان کے قرون وسطی کی حکومت اور ترک حکمرانوں کی پالیسی پر نہ پڑا ہو یقیناً برنی کے سیاسی

نظریات نے اسکے عہد کی رائے عامہ کو متأثر کیا ہے۔ برنی کی خاص تالیف 'تاریخ فیروز شاہی' ہے

جو 'فتاویٰ جہانداری' میں پیش کئے ہوئے نظریات کی تأثیر سے خالی نظر نہیں آتی وہی نظریات

تاریخ فیروز شاہی میں خاص تفصیل سے دہرائے گئے ہیں۔

برنی اپنی تالیف کے پہلے باب میں سلطان غیاث الدین بلبن کی شخصیت

اور اسکے دربار کا نہایت شاندار نقشہ پیش کرتا ہے وہ بلبن کو زندگی کے دو متضاد مرحلوں

سے گذرتا ہوا دکھاتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جب بلبن امیر تھا اس زمانے میں وہ اکثر عیش

و نوش کے جشن منعقد کرتا تھا اور ان تمام لذتوں کے مزے چکھنے کا عادی تھا جنکا ترک حکمرانوں

میں رواج تھا مگر تاج سلطانی سر پر رکھنے کے بعد اسکی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے

جس میں وہ ایک انتہائی پرہیزگار انسان بن گیا۔ دربار میں شراب کی ممانعت کردی گئی اور وہ تمام رسومات جو سلطان کی عزت و سطوت یا سلطنت کی شوکت کے منافی تھیں سختی سے ممنوع قرار پائیں۔ اسی ضمن میں برنی نصائح بلبن کا دلچسپ اور ڈرامائی عنوان قائم کرتا ہے اور بلبن کی زبان سے سلطنت کے وارث اور بڑے بیٹے شہزادہ محمد کے نام وہ تمام نصیحت آمیز نکتے بیان کردیتا ہے جو دراصل خود برنی کے نظریات ہیں البتہ بلبن کے بعد اسکے جانشین اور پوتے کیقباد کے دور میں صورتحال بالکل بدل گئی اور زبردست عیش وعشرت کا دور شروع ہوا۔ برنی اس دور کے واقعات بیان کرتے وقت واقعی اپنے قلم کی معجز بیانی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ کیقباد کے بعد غلاموں کے خاندان کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور سلطنت کا اقتدار خلجیوں کے ہاتھ میں منتقل ہوجاتا ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی کے زمانہ میں برنی کہتا ہے کہ میرا بچپن تھا سلطان جلال الدین خلجی جب تخت پر بیٹھا تو میں بارہ برس کا تھا اور مکتب میں پڑھتا تھا۔ یہاں سے تاریخ کے تمامتر واقعات برنی کے لئے آنکھوں دیکھا حال بن جاتے ہیں جلال الدین خلجی کے بعد اسکے بھتیجے داماد اور جانشین علاءالدین خلجی کا دور شروع ہوتا ہے اس سلطان کے زمانہ میں ترکوں نے عظیم فتوحات کا منصوبہ شروع کیا اور سلطان کا لشکر بحرِ ہند کے ساحل پر واقع شہر کنیا کماری تک پہونچ گیا برنی علاءالدین خلجی کے دور حکومت کے واقعات نہایت احتیاط تحمل

اور گہری نظر کے ساتھ لکھتا ہے وہ ایک سنجیدہ مؤرخ کی حیثیت سے ذرا بھی مبالغے کو اپنے بیان

میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ علاؤالدین کی تیزی سے حاصل کی ہوئی عظمت و شوکت بہت

جلد اسکے جانشین قطب الدین مبارک شاہ کے عہد میں ختم ہوگئی جس طرح بلبن کے پوتے کیقباد

کے وقتوں میں ترکوں نے عیش و عشرت کا ماحول گرم کیا تھا۔ بالکل ایسے ہی قطب الدین مبارک شاہ

کا دربار بھی رقص و سرود اور شراب و شاہد کی بدعنوانیوں میں ڈوب گیا۔ مبارک شاہ کو اسکے

ہندو غلام خسرو خان نے قتل کر کے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دہلی کے تخت پر غاصبانہ

قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ برنی اس داستان کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے واقعی اس نے تمام

حالات کا نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا یہاں پر وہ ایک تاریخ نویس کا پورا حق ادا کر گیا ہے ۔

خسرو خان ہرداری کو بہت جلد ایک ترک سردار غیاث الدین تغلق تختۂ سیاست

سے دور کر دیتا ہے اور خود حکمران کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے مگر تاریخ میں ایسا انقلابی کردار

ادا کرنے کے باوجود غیاث الدین تغلق کو زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کی مہلت نصیب نہیں ہوتی

وہ فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہونے بھی نہیں پاتا ہے کہ دارالسلطنت سے باہر ایک نوتعمیر

قصر کا گنبد اسکے اوپر گر پڑتا ہے اور وہ سلطنت کا اقتدار اپنے بیٹے محمد بن تغلق کے لئے

چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتا ہے ۔ محمد بن تغلق کے دور میں برنی کو اس سلطان

کی نزدیکی حاصل رہتی ہے اس لئے کہ وہ سلطان کا ندیم ہے وہ بہت اچھی طرح سلطان کی

خلوت اور جلوت کے معاملات سے واقف ہے ظاہر ہے کہ برنی ایک نہایت ذہین انسان تھا۔

پختہ فکر کے علاوہ نہایت شدید مشاہدے کا بھی مالک تھا وہ سلطان محمد بن تغلق کے کردار کا

پوری بصیرت کے ساتھ معائنہ کرتا ہے مگر یہ سلطان کی بدقسمتی ہے کہ برنی کے قلم نے جو تصویر

تاریخ میں چھوڑی ہے اس میں بادشاہ کی صورت بلکہ سیرت کے تمام بد نما خدو خال ابھر کر ہمارے

سامنے آگئے ہیں ہم تکرار کے ساتھ سلطان محمد بن تغلق کے سلسلے میں بدقسمتی کا لفظ استعمال

کرنے کے لئے حق بجانب ہیں اس کے معاصرین میں تین عظیم اہل قلم ہیں جنہوں نے سلطان

کی قلمی تصویریں کھینچی ہیں پہلا ابن بطوطہ دوسرا برنی اور تیسرا عصامی صاحب 'فتوح السلاطین'

ہے۔ تینوں کے دل سلطان کی ہمدردی سے خالی ہیں اور صریحی طور سے تینوں مورخین

کے یہاں ایک طرح کی ... مخالفت اور تعصب کا رنگ غالب نظر آتا ہے بہرحال

برنی سلطان کی اچھی صفات بھی بیان کرتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ایسی

زبردست متضاد صفات کا مجموعہ دنیا کے انسانوں میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ برنی یہ بتاتا

ہے کہ سلطان کے ذاتی زندگی کی پاکیزگی اور طہارت کو دیکھ کر اسکی ذات پر شبلیؒ اور جنیدؒ

کا گمان ہوتا ہے ترک ...... حکمرانوں میں ایک بڑا حرم رکھنے اور جنسی بدعنوانیاں

کرنے اور اور انحرافات کرنے کا عام رواج تھا محمد بن تغلق کی سیرت میں دور دور تک اس کمزوری کا نشان نہیں ملتا اسکے باوجود اس نے جو پالیسی بھی نافذ کی وہ ناکام ہوتی رہی اور اسکا نتیجہ زبردست خرابی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ محمد بن تغلق کے بارے میں برنی کی تنقید دیکھ کر خود مورخ کی نیت پر شک ہونے لگتا ہے اور اسکا رویہ ایک سوالیہ نشان بن جاتا ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ عرصۂ دراز تک ندیم کی حیثیت سے سلطان کی قربت میں بیٹھنے کے باوجود برنی کے دل میں سلطان کی طرف سے گوشہ نرم پیدا نہیں ہوا نہ وہ اپنے مربی سے محبت کرتا ہے اور نہ وہ اسکی کمزوریوں کو دیکھ کر چشم پوشی یا در گزر کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جو کہ دوستی کا فطری تقاضا تھا۔ وہ سلطان کی تصویر کشی کرتے وقت ایک بے رحم مصور بن جاتا ہے۔ محمد بن تغلق کے بعد اسکے جانشین فیروز شاہ تغلق کی سلطنت کا احوال لکھنے میں برنی ایک مؤرخ نہیں رہتا بلکہ ایک مدح خوان اور قصیدہ نگار بن جاتا ہے فیروز شاہ تغلق کے ضمن میں برنی کا لہجہ صریحی طور سے تملق اور چاپلوسی سے بھرپور نظر آتا ہے یہ ایک معاصر اہل قلم اور اور مؤرخ کی ناگزیر کمزوری ہوتی ہے کوئی بھی سیاسی تبصرہ نگار اپنے زمانہ کی برسر اقتدار شخصیت کے خلاف کڑی تنقید اور بے لاگ نکتہ چینی نہیں کر سکتا ہم برنی کو بھی اس اعتبار سے قابل معافی قرار دیتے ہیں۔

برنی فارسی زبان کے تمام مورخین میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل ہے وہ شاید ابو الفضل بیہقی کے بعد دوسرا مورخ ہے جسکا قلم تاریخی واقعات کے اندر سیاسی نظریات کی آمیزش پر قادر ہے اور یہی برنی کا سب سے بڑا کمال ہے۔

باب دوم

تیرھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا اور ایران کی صورتحال اور ھندوستان پر اس کے اثرات

محمد بن سام غوری کی فتح ۱۱۹۲/ ۵۸۸ اور شمالی ہندوستان پر اسکا اقتدار

تاریخ میں سیاسی اعتبار سے جس قدر اہم تصور ہوتا ہے اتنا ہی بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کا حامل ہے وہ دہلی کو سلطان کی تخت گاہ قرار دینا ہے اسکا مقصد بظاہر محض اس قدر ہے کہ یہاں سے پورے شمالی ہندوستان پر احکام و اوامر کا نفاذ کیا جا سکے ملک گیری اور جہانبانی کی سہولت کے لیے مرکز سلطنت مقرر کرنا ایک ناگزیر تقاضہ تھا مگر پوری اسلامی تہذیب پر اسکے اثرات مرتب ہوئے اور دہلی کی اہمیت تمام اسلامی دنیا میں آنے والی صدیوں کے لئے مسلم ہوگئی۔ دہلی کا شہر محض ہندوستان کا مرکز سلطنت ہی نہ تھا جہاں رہکر محمد بن سام غوری کے جانشین فرمانروائی کرتے بلکہ اسکو اسلامی تہذیب کے ایک مرکز کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی اور اسکا یہ مرتبہ غزنی سمرقند بخارا اور نیشاپور سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا اسلامی تاریخ کے بعض دانشمند بغیر تردید اور تامل کے اپنے اندازے کی میزان میں دہلی کو بغداد اور قرطبہ کا ہم پلہ تصور کرتے ہیں۔ بغداد اور قرطبہ یورپ اور ایشیا میں واقع دو شہر تھے جہاں پر اسلامی تہذیب اپنی عظمت اور جلال کے نکتۂ عروج پر پہونچتی ہوئی نظر آتی ہے اسلامی تہذیب کے دفتر میں ان دونوں شہروں کا نقش بالکل اسی

درخشاں ہے جس طرح یورپ میں شہر روم کا نام یادگار ہے جو قرون وسطیٰ کی مسیحیت سے قبل ایک عظیم حکومت کا مرکز تھا اور قرون وسطیٰ میں مسیحیت کا مرکز بنا رہا اور جسکو عرب مورخین رومۃ الکبریٰ کہتے ہیں ۔ اقبال نے رومۃ الکبریٰ کے خرابوں کو دیکھ کر دہلی کے گذرے ہوئے جاہ و جلال کو یاد کیا تھا اس لئے اوپر کہا گیا کہ دہلی کی عظمت قرطبہ اور بغداد کے ہم پلہ شمار ہونے کی مستحق ہے اقبال تعلّی یا مبالغہ نہیں کرتے اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ

سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے

محمد بن سام غوری کی وفات (۶۰۲/ ۱۲۰۶) سے پانچ سال قبل تیرھویں صدی عیسوی کا آغاز ہوچکا تھا محمد بن سام غوری کے براہ راست جانشین غلام یا مملوک کہلاتے ہیں انکا عہد حکومت ۶۸۹/ ۱۲۹۰ تقریباً بچاسی برس تک جاری رہتا ہے اس سلسلے کا آخری بادشاہ معزالدین کیقباد تھا اس کے بعد جب حکومت سلاطین خلجی کے خاندان میں منتقل ہوتی ہے تو پہلے خلجی بادشاہ یعنی جلال الدین فیروز شاہ خلجی کا مختصر عہد حکومت جو پانچ برس پر مشتمل ہے وہ بھی تیرھویں صدی عیسوی میں ہی گزرتا ہے جلال الدین کے جانشین علاؤالدین کی تخت نشینی کے پانچ برس بعد تیرھویں صدی عیسوی اپنے اختتام کو پہونچتی ہے ۔ غلام خاندان کا عہد حکومت ھندوستان کی تاریخ میں اس لئے اہم تصور ہوتا ہے کہ انکی ہی

کوششوں سے ہندوستان میں عرصہ دراز کے لئے مسلمانوں کی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں مگر یہ عرصہ زمانی مشرقی اسلامی ایشیا یعنی ترکستان اور خراسان کی تاریخ میں بھی غیر معمولی عبرت اور اہمیت کا حامل ہے اس زمانے میں حملۂ تاتار کا ہولناک حادثہ پیش آیا اور جس وقت ہلاکو نے بغداد کو تباہ کیا ۶۵۶/۱۲۵۸ ان دنوں دہلی کے تخت پر سلطان ناصرالدین محمود برائے نام کا بادشاہ تھا اور غیاث الدین بلبن اصل فرمانروائی کی ذمہ داریاں انجام دے رہا تھا۔

منگولوں کے حملے نے دہلی کو اسلامی ایشیا کے ہر دانشور اور اہل کمال کا ملجا اور ماوا بنا دیا۔ تاتاریوں کے تباہ کن سیلاب سے جو بھی بچ گیا اس نے دہلی کا رخ کیا اور اسکو اس شہر میں حسب امید پناہ نصیب ہوئی دانشوروں تاجروں اور سیاحوں کی رفت و آمد نے دہلی کو اسلامی تہذیب کے دوسرے مرکزوں سے ایک رشتے میں منسلک اور مربوط کر دیا تاتاریوں کی تباہی نے دہلی کو اسلامی جغرافیہ کے نقشے پر سب سے زیادہ ممتاز شہر بنا دیا اور یہاں کی علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کی آواز اسلامی دنیا کے ہر شہر میں آسانی کے ساتھ پہونچنے لگی اس صورتحال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہمکو تیرھویں صدی عیسوی میں واقع تصوف کے مراکز کا معاینہ کرتے وقت ان تمام مقامات پر نظر ڈالنی پڑیگی جو ہندوستان سے

باہر خراسان اور ترکستان کے شہروں میں سرگرم عمل تھے ان تمام مرکزوں کا تعلق دہلی اور اسکے علماء اور اہل سلوک سے قائم تھا اور یہ تعلق امتداد وقت کے ساتھ زیادہ گہرا اور قریب تر ہوتا چلا گیا ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اپنی تہذیب کے ابتدائی زمانے سے ہی ایک متحرک معاشرہ تھا یعنی تاجر ہوں یا ..... سیاح یا اہل فضل ان سب گروہوں میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھومنے کا بہت زیادہ رواج تھا ہم کو خصوصیت کے ساتھ گردش و سیاحت کا شوق سب سے زیادہ اہل سلوک اور صوفیائے کرام میں نظر آتا ہے۔ معمول کے طور پر ہر بڑا صوفی اپنی زندگی کا ایک خاصا حصہ عالم اسلام کی سیاحت میں گذارتا تھا وہ ہر اس شہر میں جاتا تھا جہاں کسی مشہور عارف کا تذکرہ سنتا تھا یا کسی جگہ کو کسی صوفی کے مزار کی بناء پر شہرت حاصل تھی صوفیوں میں ایک گروہ قلندروں کا بھی ہمیشہ سے متحرک اور فعال رہا ہے جو کسی ایک مقام پر ایک خاص مدت سے زیادہ اقامت نہیں کرتے تھے اور جنکے مسلک میں خانقاہ بنا کر رہنے کا قاعدہ ممنوع تھا حقیقت یہ ہے کہ ہر صوفی اپنے کو کسی ایک مقام یا ملک سے مخصوص کرنے کے بجائے خود کو پورے عالم اسلام کا شہری سمجھتا تھا صوفیوں کے مرکزوں میں مختلف شہروں اور مختلف ملکوں کے آدمیوں کا یکجا جمع رہنا ایک عام بات تھی صوفیوں کے سلسلے ایک دوسرے سے ممتاز ضرور تھے مگر انکے مرکزوں میں تربیت حاصل کرنے اور رہنے سہنے کے سلسلے میں

کسی قسم کی کوئی شرط یا پابندی ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی مسلمان اولیائے کرام ہمیشہ سے نہایت
وسیع القلب اور بشر دوست ہونے کا ثبوت دیتے رہے ہیں جس طرح ابتدائی دور کے صوفی اپنے
مرکزوں میں عیسائی راہبوں اور یہودیوں کو بھی خندہ پیشانی سے آنے جانے اور وہاں قیام
کرنے کی اجازت دیتے تھے اسی طرح ہندوستان میں بھی یہ روایت زندہ رہی اس ملک کے مختلف
مرکزوں میں صوفیائے کرام اپنی خانقاہوں میں ہندو جوگیوں اور فقیروں کا بڑی خندہ پیشانی کے
ساتھ استقبال کرتے تھے اور انکو اپنی خانقاہوں یا اپنے جماعت خانوں میں بلاکر ٹھہرانے
میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے[1] واقعہ یہ ہے کہ یہ مرکز نہایت کامیابی کے ساتھ روحانی تربیت
اور اصلاح نفس اور تزکیۂ باطن کی بہت اچھی تعلیم دیتے تھے ان میں رہکر بڑے بڑے سرکش
گنہگاروں کی زندگیوں میں انقلاب آجاتا تھا اس لئے عام معاشرہ میں صوفیوں کے مرکز نہایت
احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور لوگ ان مرکزوں کو اور وہاں کے رہنے والوں کو طلب دعا
اور اکتساب برکت کا وسیلہ سمجھتے تھے ان مرکزوں میں رہنے والے بیشتر اوقات عبادت
و ریاضت چلہ کشی اور ضبط نفس کی دوسری مشقوں میں لگے رہتے تھے جو انکا شیخ یا پیر
تجویز کرتا تھا یا پھر شیخ کے چاروں طرف بیٹھ کر انکے وعظ و ارشادات کو غور سے سنتے تھے
شیخ کے لئے مریدوں کو جمع کرکے روزانہ یا شب کے وقت کچھ باتیں بیان کرنا اور وعظ کی

---

[1] فوائد الفواد میں مختلف موقع پر شیخ فریدالدین گنجشکر کی خانقاہ میں جوگیوں کی موجودگی کا ذکر موجود ہے

شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا ایک لازمی معمول تھا اکثر ان ارشاد کی محفلوں میں
مرکز سے باہر کے لوگ بھی عقیدت کی وجہ سے شریک ہو جاتے تھے شیخ چونکہ ایک عالم و فاضل
شخص ہوتا تھا اور وہ علوم باطنی کے علاوہ علوم رسمی پر بھی پوری دسترس رکھتا تھا اس لئے
بیشتر مراکز نہ صرف روحانی تعلیم اور تصوف کی تربیت کے لئے ممتاز تھے بلکہ انکی حیثیت ایک بڑی
تعلیم گاہ کی سی تھی مرکزوں سے متعلق کتب خانے بھی ہوتے تھے صوفی اور مرکزوں کے سربراہ شاہی
ملازمت سے ہمیشہ اجتناب برتتے تھے انکا مقصد ترک دنیا تھا اس لئے بیشتر درویشی کی زندگی
گذارتے تھے انکے نان و نفقہ کا انتظام خوشحال عقیدتمند نذرانہ دیکر کر دیا کرتے تھے عقیدتمندوں
کا یہ نذرانہ صوفیوں کی اصطلاح میں فتوح کہلاتا تھا البتہ ایسی مثالیں بھی کثرت سے ہیں کہ اگر
فتوح میسر نہ آئی تو صوفیائے کرام کو انتہائی افلاس اور فقر و فاقہ میں زندگی گذارنی پڑی
ایران کے مرکزوں میں یہ شہادت ملتی ہے کہ بعض اوقات نذرانہ یا فتوح براہ راست بادشاہ
کی طرف سے بھی آتے تھے لیکن ہندوستان کے مرکزوں میں ایسی شہادت نہیں ملتی۔ ہندوستان
کے صوفیوں کا معمول یہ تھا اور اس پر ہمیشہ بڑی سختی سے عمل ہوتا رہا کہ حکومت کی دی ہوئی
رقم یا براہ راست بادشاہ کا دیا ہوا تحفہ صوفیوں کی جماعت میں قبول نہیں کیا جاتا تھا
یہ اور بات ہے کہ دربار سے تعلق رکھنے والا امیر کبیر کسی صوفی کے حلقہ ارادت میں داخل

ہوگیا اور اس نے کچھ مرکز کے خرچ کی خاطر پیش کیا تو اسکے قبول کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مرکز کے بیشتر صدر یا شیوخ کی زندگیاں ہماری نظر میں ہیں وہ اپنے بیشتر ایام حالت صوم میں گذارتے تھے اور شام کے وقت نہایت سادہ غذا سے روزہ افطار کرلیتے تھے انکے لنگر خانے میں جو غذا پکتی تھی وہ درویشوں اور خانقاہ کے رہنے والوں میں تقسیم کردی جاتی تھی جماعت خانوں میں سماع کی محفلیں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں مگر سماع کا رواج فقط چشتی سلسلے میں ہی ہے بعض سلسلوں میں سماع بالکل ممنوع ہے اور اسکی اجازت نہیں دی گئی ہے۔[1]

تیرھویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے نقشے پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تاتاریوں کے ذریعہ تباہی کے نتیجے میں یا دیگر اسباب کی بنیاد پر جو خالص اجتماعی یا فکری نوعیت کے ہوسکتے ہیں اسلامی دنیا میں وہ عرفانی سلسلے ختم ہوچکے تھے یا اگر بالکل ختم نہ ہوئے تھے تو انکا اثر کمزور ہوچکا تھا جنکا ذکر صاحب کشف المحجوب شیخ عثمان بن علی ہجویری (وفات ۴۶۵ھ) نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور جو ہماری تحقیق کے حدود زمانی سے کم و بیش ڈیڑھ (۱۵۰) صدی قبل کی تالیف ہے البتہ ترکستان اور خراسان کے وسیع علاقے میں تاتاریوں کے حملے سے طریقت کے جو بڑے بڑے مرکز متاثر ہوئے اور تباہ ہوگئے انکا ایک مختصر سا جائزہ لینا ضروری ہے جن کے اسباب کا قبل ذکر کیا جاچکا ہے یعنی ان مرکزوں کا ہندوستان میں واقع مرکزوں

---

[1] مثلاً سلسلہ نقشبندیہ میں موسیقی اور سماع بالکل ممنوع ہے اور سہروردیہ سلسلہ میں بھی سماع کا رواج بہت کم ملتا ہے۔

سے ایک تہذیبی تعلق تھا اور باہمی ارتباط کی بنیاد پر ہندوستان کے اہل سلوک اکثر وبیشتر باہر کے مرکزوں میں پہنچتے تھے اور استفادۂ روحانی کی خاطر بہت سے مرکزوں میں جاکر وقتاً فوقتاً قیام کرتے تھے ہماری نظر سب سے پہلے نواح ہرات کے مقام چشت پر ٹھہرتی ہے اس لئے کہ اس جگہ کا جغرافیائی فاصلہ کم ہے اور یہ ہندوستان سے بہت زیادہ قریب ہے دوسری بات یہ بھی ہے کہ چشت کا مقام ایک اہم سلسلے کا مقام پیدائش بھی ہے جسکے نقوش ہندوستان کی تاریخ میں نہایت گہرے مرتب ہوئے آجکل چشت شمالی افغانستان میں ہری رود دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر منگولوں کے حملے سے قبل تک ہرات اور اسکے نواح کے دو مقامات یعنی چشت اور جام دونوں تصوف کے اہم مرکز تھے اور تیسرا مرکز خود ہرات کا شہر تھا - چشتی سلسلے کی روایات بتاتی ہیں کہ ایران میں ادب اور زبان کا احیاء شروع ہونے کے چند برس بعد اور بخارا کی سامانی سلطنت کے ابتدائی زمانے میں چشت کا مرکز طریقت وجود میں آگیا تھا وہاں سب سے پہلے شیخ ابو اسحاق شامی ۳۲۹ / ۹۴۰ء[1] اپنے وطن شام سے تشریف لائے اور کچھ دن بعد وہاں کے ایک اہل سلوک خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (وفات ۳۵۵ / ۱۰۶۳) کو اپنا خلیفہ اور جانشین بناکر شام کی طرف واپس چلے گئے خواجہ ابو احمد ابدال چشتی کے جانشینوں کا سلسلہ عرصۂ دراز تک چلتا رہا اس سلسلے کے ایک نمایاں بزرگ خواجہ مودود چشتی

---

[1] انوار العارفین ص ۲۵۶ - صاحب روضہ اقطاب نے آپ کا سنہ وفات ۳۰۴ھ / ۹۱۶
[illegible]

ہیں اسکے بعد دوسرا معروف اور قابل ذکر نام خواجہ عثمان ہروانی کا ہے در اصل خواجہ مودود چشتی کی وفات کے بعد انکا محل اقامت ایک اہم مرکز کی حیثیت سے آہستہ آہستہ اپنی شہرت کھو بیٹھا اور خواجہ مودود چشتی کے خلیفہ چشت سے نکل کر متفرق مقامات کی طرف چلے گئے اور دور دور جاکر اقامت پذیر ہو گئے خواجہ عثمان ہروانی کے نام کا اشارہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں وارد ہونے والے پہلے صوفی خواجہ معین الدین چشتی کے شیخ اور مرشد تھے۔ اوپر کی عبارت میں ہم نے ہرات اور جام کا نام بھی لیا ہے ہرات کے مرکز طریقت کی شہرت وہاں کے ایک عارف خواجہ عبداللہ انصاری (پ ۳۹۶/۱۰۰۵ وفات ۴۸۱/۱۰۸۸) کی مرہون منت ہے جو عہد سلجوقی کے صوفی اور اسکے ساتھ ہی ایک صاحب طرز ادیب بھی شمار ہوتے ہیں۔ جام کے مرکز میں بھی عرصہ دراز تک تصوف اور سلوک کی تربیت کامل سرگرمی کے ساتھ جاری رہی مگر اس مرکز سے متعلق سب سے مشہور نام شیخ احمد جام کا ہے جنکی وفات ۱۱۴۲/۹۴ء[۱] میں ہوئی۔

ہرات سے شمال کی جانب کچھ فاصلے پر بلخ کا شہر ہے اس شہر کو فارسی زبان کے عہد احیاد کی سرگرمی میں حصہ لینے والے بہت سے شاعروں کی پیدائش گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے جو فارسی ادب کے بالکل ابتدائی شاعر شمار ہوتے ہیں مگر یہ شہر تصوف اور طریقت کی برکت سے بھی محروم نہیں تھا تیرھویں صدی عیسوی کے بالکل ابتداء میں جلال الدین رومی

---

[۱] مفتاح التواریخ ص ۴۳

کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی تھی (پیدائش ۶۰۴ھ / ۱۲۰۷ وفات ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳) وہ ابھی بچے ہی تھے کہ انکے والد محمد بن حسین خطیبی جو بہاء الدین ولد کے نام سے بھی مشہور تھے ۶۱۷ / ۱۲۲۰ میں بلخ کو چھوڑ کر پورے خراسان اور شمالی ایران سے گذرتے ہوئے ایرانی حدود سے باہر ترکی کے شہر قونیہ میں جاکر آباد ہو گئے تھے ۔[1]

خوارزم کا شہر تیرھویں صدی عیسوی میں ترک نسل کے ایک شاہی سلسلے کا مرکز تھا جو تاریخ میں خوارزم شاہ کہلاتے ہیں علاء الدین خوارزم شاہ کی پالیسی اور اسکے غیر دانشمندانہ اقدامات کی وجہ سے چنگیز خان اور اسکے تاتاری وحشیوں کے علاوہ توسیع پسندی کے ارادے کا ابتدائی سبب بنے خوارزم ایک بڑا سیاسی مرکز ہونے کے علاوہ تہذیب و تمدن اور ساتھ ہی تصوف کا بھی ایک ممتاز اور نمایاں مرکز تھا یہاں کے سب سے مشہور صوفی شیخ نجم الدین کبری کا نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا جو منگولوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے البتہ انکے جانشینوں اور مریدوں کا سلسلہ برقرار رہا اور دور تک پھیلتا چلا گیا ۔

نیشاپور کا شہر تیرھویں صدی عیسوی میں وہاں کے دو مشہور اہل طریقت بزرگوں کے نام کی وجہ سے قابل ملاحظہ ہے شیخ ابوسعید ابوالخیر (وفات ۴۴۰ھ / ۱۰۴۸) اور دوسرے مشہور صوفی بزرگ شیخ فریدالدین عطار (وفات ۶۲۷ / ۱۲۲۹) ہیں جنہوں نے تاتاریوں کے ہاتھ

---

[1] ادب نامۂ ایران ص ۳۲۹

اس وقت شہادت پائی جب منگول نیشاپور کی طرف بڑھے اور اس شہر کو تباہ کر دیا۔

ہم کو تیرھویں صدی عیسوی کا جائزہ لیتے وقت بغداد کی طرف بھی نظر ڈالنی پڑے گی جہاں ابھی مشہور صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی حیات تھے تیرھویں صدی کا نصف اول جیسے ہی تمام ہوا ۶۵۶/۱۲۵۸ میں ہلاکو خان کا خونخوار لشکر یہاں بھی آ پہونچا اور بغداد کا شہر خاک کا ڈھیر ہو گیا یہاں کے بہت سارے باشندے مار ڈالے گئے جن میں علماء فضلا اور ساتھ ہی صوفیائے کرام بھی شامل تھے

اس باب کے آغاز میں عالم اسلام کی تہذیبی وحدت کے بارے میں اشارے کئے جا چکے ہیں ہندوستان کی سرزمین میں سرگرم عرفانی سلسلوں کا نقشہ اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ہم ہندوستان سے باہر کے مراکز اور وہاں وجود میں آنے والے سلسلوں کو گہری نظر سے نہ دیکھیں اور مسلسل مطالعے کا موضوع نہ بنائیں واقعہ تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں نظر آنے والے عرفانی سلسلوں کی بنیاد اس ملک سے باہر مختلف مقامات اور مراکز میں پڑی تھی ہماری تحقیق اور جستجو کا عہد تیرھویں صدی عیسوی بدقسمتی سے وحشی تاتاریوں کے حملوں کا دور ہے یہ حملے مذکورہ صدی کی ابتدا سے شروع ہوئے اور نصف اول کے اختتام تک یعنی ۶۵۶/۱۲۵۹ میں بغداد تباہ ہو گیا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ بغداد نہ صرف مسلمانوں کی نظر میں بلکہ پوری مہذب دنیا کی نظر میں ام البلاد کی حیثیت رکھتا تھا یہ شہر مسلمانوں کی تہذیب کا مرکز تھا بغداد کی تباہی

سے اسلامی تہذیب کی شاندار تاریخ کا باب تقریباً ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور کہا یہ جاتا ہے کہ

مسلمانوں کا فکری اور تمدنی معیار دوبارہ اتنا بلند نہیں ہو سکا جسقدر کہ زوال بغداد سے

پہلے تھا ہم اپنے موضوع جستجو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقط اس قدر ذکر کرینگے کہ تاتاریوں کی

تباہی کے نتیجے میں وہ تمام قدیم سلسلہ ہای طریقت زیروزبر ہو گئے جو اب تک مختلف مقامات پر

سرگرم اور جاری تھے اور جنکا تفصیل کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تذکرہ شیخ عثمان ہجوی کی تالیف

کشف المحجوب میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں جب تاتاریوں کی تباہی کا سیلاب ذرا سا تھما

تو مسلمانوں میں روحانی اور اخلاقی تنظیم کی جدو جہد نئے سرے سے شروع ہو گئی اگر کہا جائے کہ

اس جدو جہد کے نتیجے میں تصوف کے نئے سلسلے وجود میں آئے اور ان سلسلوں نے دوبارہ مشرقی

اسلامی دنیا کو اپنے حلقہ اثر میں لے لیا تو بے خیال بیجا نہ ہوگا۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ

ان سلسلوں کی بدولت مسلمانوں کے معاشرے میں تصوف کی تعلیمات نے دوبارہ مقبولیت حاصل

کی اور طریقت کو شریعت کے حریف کی حیثیت سے از سر نو استحکام حاصل ہوا جیسا کہ ابتدائی

عہد کے سلسلوں کی روایت تھی تیرھویں صدی عیسوی کے سلسلے بھی اپنی وابستگی اور تعلق حضرت علیؓ

یا حضرت ابوبکر صدیق سے جوڑتے تھے اور ان دو بزرگوں کے توسط سے سرور کائنات کو اپنا

پیشرو قرار دیتے تھے البتہ بیشتر سلسلے اپنا مرشد اول حضرت علی مرتضیٰ کو قرار دیتے تھے

حضرت علی کی طرف ترجیح اور انکی روحانی حیثیت کو تفضیل کی نظر سے دیکھنا اکثر وبیشتر صوفی سلسلوں کا رجحان رہا آیا ہے۔ اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تیرھویں صدی عیسوی اور اسکے بعد سے ایک خلط ملط یہ ہوا کہ بہت سے صوفیای کرام کے اقوال کو حدیث نبوی سے ملا دیا گیا اور وہ اس قدر مقبول ہوئے کہ نہ فقط حدیث کے برابر بلکہ واقعی حدیث سمجھے جانے لگے اس دور کے تصوف کا مطالعہ کرتے وقت تحقیق کے طالب العلم کی ایک سنجیدہ اور مشکل ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ صوفیائے کرام کے اقوال کو حدیث نبوی سے جدا کرے اور ناقدانہ بلکہ عالمانہ نظر سے یہ دیکھتا چلا جائے کہ کونسا جملہ حدیث ہے اور کونسی بات کسی مشہور پیر طریقت کا قول ہے۔ اسلام میں تصوف کے آغاز سے ہی یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ مختلف تہذیبوں کے افکار و عقائد مثلاً یونان کی نو افلاطونیت ہندوستان کا ویدانت اور بدھ مذہب کے عقائد اور اسی طرح بہت سی ... مسیحی اقدار کو آہستہ آہستہ طریقت کے نظام میں جذب کیا جارہا ہے اور یہ متفرق عقائد اس طرح اسلامی طریقت میں داخل ہورہے ہیں جیسے چھوٹی چھوٹی ندیاں کسی بڑے سمندر کی طرف بہہ رہی ہوں۔ یہ کیفیت تیرھویں صدی عیسوی تک آکر اپنے مرحلہ اختتام کو پہونچ جاتی ہے یعنی مختلف تہذیبی ماخذوں سے مستعار لئے ہوئے عقائد قطعی طور سے اسلامی رنگ اختیار کرلیتے ہیں اور مسلمان صوفی ان خارجی عقائد کو اپنے مسلمات کا جزو لاینفک

بنا لیتے ہیں۔ البتہ ان خارجی عقائد کے ورود سے ابتدائی زمانے میں جو تنازعہ اور کھنچاؤ شریعت
اور طریقت کے درمیان واقع ہوگیا تھا وہ اب درجہ بدرجہ کم ہوتا نظر آتا ہے اس لئے کہ مسلمان
اس مرحلہ تک پہونچکر (تیرھویں صدی عیسوی میں) اس امتیاز سے تقریباً غافل ہوجاتے ہیں کہ
کون سے عقائد انکے فکری اور روحانی نظام میں باہر سے وارد ہوئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ ایک
اعتبار سے تمام خارجی عقائد کی آبادکاری ہوچکی ہے اور اسلامی معاشرہ انکا حقیقی وطن بن چکا
ہے خارجی اثرات کا اسلامی نظام میں جذب ہوجانا کوئی بڑی بات ثابت نہ ہوئی جیسا کہ اوپر
عرض کیا گیا ہے اسکے نتیجے میں شریعت اور طریقت کے درمیان کی خلیج خاصی حد تک کم ہوگئی اس
عہد میں قائم ہونے والے سلسلوں کی ایک صفت یہ ہے اور یہ صفت آگے چلکر ایک روایت بن جاتی
ہے کہ ہر سلسلے کا نظام دوسرے سے تھوڑا بہت جدا نظر آتا ہے اور اپنی امتیازی حیثیت یا کہنا چاہیے
کہ تشخص برقرار رکھنے کی خاطر ہر سلسلے کے اندر ابداع و اختراع کی واضح کوشش نظر آتی
ہے مثلاً بعض سلسلے ذکر کے موقع پر مخصوص اسماء الٰہی کی تکرار اور گردان کا ضابطہ نافذ کرتے
ہیں اور بعض سلسلوں میں بہت سی دوسری روحانی ورزشیں مثلاً مراقبہ چلّہ کشی اور بعض کے یہاں
حبس دم وغیرہ کو جائز اور مستحسن تصور کرلیا جاتا ہے تیرھویں صدی عیسوی یا اس سے کچھ پہلے قائم
ہونے والے مختلف سلسلوں نے جو ضابطے اپنے اپنے طور پر مقرر کئے بعد کی نسلوں میں ان ضابطوں

کو برتنے کا رواج اور زیادہ شدید اور سخت ہوگیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہی رواج مختلف سلسلوں

میں آج تک برقرار ہے اس لئے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں قائم ہونے والے سلسلے یعنی وہ جو حملہ

تاتار کے بعد وجود میں آئے ہیں آج تک بغیر کسی بڑے تغیر اور تبدیلی کے ویسے ہی برقرار ہیں

امتداد وقت کے ساتھ انکی بہت سی شاخیں ضرور ہوتی چلی گئیں مگر ہر شاخ کسی نہ کسی سلسلے سے

آج تک وابستہ ہے البتہ ایک بات ضرور ایسی ہے جو تمام سلسلوں میں مشترک اور یکساں ہے

یعنی عرفان حقیقت کے نتیجے میں روح کی جدوجہد اور بالآخر تسکین کے اظہار کا ذریعہ ناگزیر طور

سے ہر سلسلے میں ایک ہی ہے اور وہ شاعری ہے صوفی کسی بھی نظام طریقت یا سلسلے سے وابستہ ہو

شاعری اسکے احساسات کا واحد اور مشترک وسیلہ ہے ظاہر ہے کہ جذبے کی حدت رفعت اور

پاکیزگی کا بہترین اظہار فقط شاعری کے ذریعہ ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ تصوف کے مختلف سلسلوں نے

اسلامی معاشرہ کی تنظیم نو میں جو مثبت کارنامہ انجام دیا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا

تاتاریوں کی تباہی کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ ایک زبردست اور ناقابل تلافی نقصان سے روبرو

ہوا اس نقصان کے نتیجے میں قنوطیت اور پژمردگی کے احساسات کا طاری ہوجانا لازمی بات تھی

تصوف کے سلسلوں نے مسلمانوں کو قنوطیت کے سائے سے بچالیا اور اللہ کی ذات پر توکل کی

تعلیم اس خوبی ذہانت اور فراست کے ساتھ ذہن نشین کی کہ پورا معاشرہ ایک نئی امید

اور ایک نئی آرزو کے ساتھ زندہ ہو گیا واقعہ یہ ہے کہ تصوف کے صالح عناصر انسان کو زندہ رہنے اور زندگی کی ناخوشگوار کشمکش جھیلنے کا انتہائی دانشمندانہ طریقہ سکھا دیتے ہیں طریقت کی تعلیمات میں زوال اور پستی و ابتذال کا منظر بہت بعد میں رونما ہوتا ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں جو سلسلے وجود میں آرہے ہیں وہ صالح عناصر سے بھرپور نظر آتے ہیں ابتذال کی علامات مثلاً اولیاء کی قبروں کی تقریباً پرستش، کرامات پر ضرورت سے زیادہ زور، سماع سے لذت اندوزی اور پیروں فقیروں کی اندھی تقلید وغیرہ وغیرہ یہ عناصر بہت بعد کی پیداوار ہیں ذیل کی سطروں میں مختصر طور سے ان سلسلوں کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے جنکی تنظیم تیرھویں صدی عیسوی یا اس کچھ قبل ہوئی اور جنکے اثرات بعد تک حتیٰ کہ آج تک برقرار ہیں اور جنکے مراکز اصلاً ہندوستان سے باہر بغداد خراسان اور وسط ایشیا کے شہروں میں واقع ہوتے تھے۔

سلسلہ قادریہ:۔ قادریہ سلسلے کا مطالعہ تقدم زمانی اور اہمیت کے اعتبار سے سب سے پہلے کرنا لازم ہے سلسلہ مذکورہ کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی کی ولادت ایران کے شمالی صوبے گیلان (معرب جیلان) میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوئی تھی ان کا سال ولادت گیارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ۱۰۷۸ء/۴۷۰ھ شمار ہوتا ہے۔ عبدالقادر جیلانی اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے بغداد چلے آئے[۱] اور انکی بقیہ عمر یہیں گذری وہ بارھویں صدی کی تین دہائیاں پوری کرنے کے بعد ایک

---

[۱] تاریخ اولیاء ص ۵۴

روحانی معلم کی حیثیت سے دنیا میں مشہور ہونا شروع ہونے اس سے پہلے انہوں نے اپنی عمر کے پچیس برس ایک آزاد درویش کی حیثیت سے سیاحت اور جہانگردی میں صرف کیئے اور اس عرصہ میں بعد کے گیارہ سال مکمل تنہائی تجرد اور عبادت فکری میں گذارے انکو بغداد کے مشہور صوفی شیخ المخزمی سے خرقہ حاصل ہوا تھا وہ اپنے شیخ کی وفات کے بعد بغداد میں شیخ کی خانقاہ اور مدرسہ کے سرپرست کی کی حیثیت سے وہیں رہنے لگے۔ شیخ عبدالقادر کے ارشادات اور مواعظ کے دو مجموعے اسلامی دنیا میں بہت زیادہ مشہور ہیں ایک الفتح الربانی اور دوسرا فتوح الغیب۔ شیخ عبدالقادر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارشادات اور اپنی تحریروں میں خالص تصوف کی اصطلاحیں بہت کم استعمال کرتے ہیں انکا اسلوب سادہ عام فہم اور دلنشین ہوتا ہے جسکے ذریعہ وہ پاکیزہ زندگی کی تعلیم دیتے ہیں اور اخلاقی اصولوں کی اہمیت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں انکے اخلاقی نظام میں مادی زندگی کی حرص و ہوس اور دنیا پرستی کی شدید مذمت نظر آتی ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کی متوازن اور ہموار شخصیت اس وقت فروغ پا سکتی ہے جب زندگی کی مادی تامین کے ساتھ روحانی قدروں کا احترام اور اخلاقی اصولوں کی پابندی برقرار رہے۔ شیخ ان عارفوں میں سے ہیں جو جہاد بالنفس کو جہاد بالسیف پر ترجیح دیتے ہیں یعنی استقامت دین کی خاطر تلوار لیکر کفار و مشرکین سے لڑنا اس قدر اہم نہیں جتنا کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھنا ضروری ہے نفس آدمی کو گمراہ

History of sufism in India V.1 P.84 ۱ے

کرتا ہے اور نفس کے قابو میں آکر متوازن شخصیت سے محروم ہوجاتا ہے۔ شیخ کی تعلیمات میں
دوسرا نکتہ خود بینی اور مخلوقات کی پرستش سے احتراز پر تاکید ہے یعنی انسان خویشتن بین
واقع ہوا ہے وہ کسی حالت میں بھی خود بینی کے حصار سے باہر نہیں آسکتا اور اسی طرح وہ مادی
مخلوقات کا ایسا زبردست عاشق ہے کہ انکی پرستش اور انکا خیال بھی ترک نہیں کرتا۔ شیخ کے نزدیک
یہ دونوں باتیں شرک خفی کا درجہ رکھتی ہیں اور ان سے نجات کی جو صورتیں شیخ نے بتائی ہیں ان
سے شیخ کی اصالت فکر واضح ہوتی ہے وہ اپنی ایک تقریب میں کہتے ہیں کہ سالک کو خداجوئی کی راہ
میں کامیابی اس وقت ہوسکتی ہے جبکہ وہ عبادت میں عقبیٰ کا خیال بھی ترک کردے کیونکہ آخرت میں ثواب
کا تصور بھی ایک طرح کی خواہش کا پتہ دیتا ہے اور سالک کے لئے ہر خواہش سے بلند ہونا
لازم ہے فنا فی اللہ یعنی اپنی مرضی کو مرضی الٰہی میں فنا کردینا بعد کا درجہ ہے پہلے مرحلہ میں سالک سے یہ
مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے دل کی تمام خواہشوں کو فنا کردے اس لئے کہ خواہشات کا تعلق نفس
سے ہوتا ہے۔ شیخ کے نزدیک نیکی اور بدی دو پھل ہیں جو ایک ہی درخت کی دو شاخوں پر لگے ہوئے ہیں
البتہ سالک کو چاہئے کہ وہ اس شاخ کی طرف ہاتھ بڑھائے جس پر نیکی کا پھل لگا ہوا ہے اور اس
شاخ سے پرہیز کرے جو بدی کے پھلوں سے بھرپور ہے۔ شیخ عبدالقادر بعض قدیم عارفوں کے
اس عقیدے کی مزید تکرار اور وضاحت کے ساتھ تعلیم دیتے ہیں کہ واقعی صوفی وہ نہیں ہے

ہے جو مکمل ترک دنیا کرکے رہبانیت اور خانقاہی زندگی اختیار کرلے بلکہ واقعی صوفی وہ ہے

جو خلق خدا کے دکھ درد سے اپنی دلچسپیاں برقرار رکھے اور خدمت خلق کے لئے ہمیشہ مستعد رہے

یہاں تک کہ اسکی ذات دوسروں کے لئے عمل صالح کا نمونہ بن جائے۔ شیخ نے ضابطہ فکر و عمل میں

شریعت کے قوانین کی پابندی نہ صرف لازمی ہے بلکہ روحانی ترقی کی جدوجہد میں وہ پہلا درجہ ہے

اور یہ کہ شریعت کے قوانین پر عمل درآمد کے بغیر سلوک کی راہ میں سالک آگے نہیں بڑھ سکتا۔ شریعت

پر عمل درآمد کے لئے پاکیزگی اور پرہیزگاری چاہئے وہاں سے آگے روح کی پاکیزگی کا مقام آتا ہے

اور روح کی پاکیزگی کے نتیجے میں سالک ولایت کے درجہ پر فائز ہوتا ہے اگر اس مرحلہ پر پہونچ

گیا تو سمجھئے کہ عارف نے اپنے کو تمام گناہوں سے بچا لیا۔ حتی کہ اسے ان گناہوں سے بھی نجات مل

گئی جو اسکے دل میں چور کی طرح چھپے ہوئے تھے اور جنکی خفیہ رہنمائی اسکا نفس کرتا تھا یہ سلوک کا

دوسرا مقام تھا اس سے گذر کر تیسرا مقام آتا ہے اور وہ ترک کا مقام ہے یعنی سالک اپنی ہر

خواہش سے دستبردار ہوجاتا ہے اور اپنی مرضی کو مرضی خالق کے ساتھ ملا لیتا ہے۔ شیخ کے نزدیک

چوتھا اور آخری مقام فنا کا ہے اس مقام پر پہونچکر حقیقت سے مکمل اتصال اور وصال ہوجاتا

ہے سالک وصال کے درجہ پر پہونچکر تمام علوم خفی و جلی کا مالک بن جاتا ہے اور اسی درجہ کو عرفان

کہتے ہیں۔ ۱؎

۱؎ A History of Sufism in India. V. I. P 85

مندرجہ بالا سطروں میں شیخ عبدالقادر کی تعلیمات کا نہایت مختصر و سہل خاکہ بیان

کیا گیا جو سلسلہ قادریہ میں آج تک معروف مانوس اور متداول ہے شیخ عبدالقادر کی

وفات بارھویں صدی عیسوی کے نصف آخر ۵۶۱ / ۱۱۶۶ میں واقع ہوئی اگرچہ قادریہ سلسلے کا

نشو و نما بہت آہستہ ہوا البتہ شیخ عبدالقادر کی شخصیت انکی وفات کے فوراً بعد اور زیادہ مقبول ہو گئی

اور یہ مقبولیت برابر بڑھتی رہی انکے کشف و کرامات کی بے شمار داستانیں امتداد وقت کے ساتھ

مشہور ہوتی گئیں اور غالباً انہیں داستانوں کی مقبولیت کے نتیجہ میں قادریہ سلسلہ اسلامی دنیا میں

خصوصاً عالم اسلام کے مشرقی علاقے میں پھیلتا چلا گیا آج بھی قادریہ سلسلے کے پیرو سب سے زیادہ تعداد

میں انڈونیشیا اور ملیشیا کے اندر ہیں البتہ ہمارے مطالعہ کا میدان ہندوستان تک محدود ہے

ہندوستان میں بھی قادریہ سلسلے کی نمائندگی برابر ہوتی رہی حملہ تاتار کے بعد اسلامی دنیا میں تصوف کی جس

طرح تنظیم نو ہوئی اور جس عنوان سے مختلف سلسلے وجود میں آئے اسکو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہتے ہیں

کہ قادریہ سلسلے کو تقدم حاصل ہے یعنی سلسلہ مذکور سب سے پرانے سلسلوں میں غیر معمولی امتیاز اور

اہمیت کا حامل ہے البتہ ہندوستان میں یہ سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی یا اس سے قبل وارد نہیں ہوتا

قادریہ سلسلے کے نقوش ہندوستان میں چودھویں صدی عیسوی اور اسکے بعد یعنی پندرھویں صدی عیسوی

میں نظر آتے ہیں البتہ جیسا کہ قبل عرض کیا گیا تقدم زمانی ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے قادریہ سلسلے اور اسکے

بانی شیخ عبدالقادر جیلانی المعروف بہ غوث اعظم کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا -

سلسلہ سہروردیہ

سہروردیہ سلسلہ ہمارے موضوع تحقیق کے اعتبار سے سلسلہ مذکورہ بالا کی بہ نسبت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس سلسلے کی بنیاد بھی بغداد میں ہی پڑی جو کہ تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے پہلے اسلامی تہذیب کا واحد مرکز تصور ہوتا تھا اور جسے نہ صرف مسلمان بلکہ تمام مہذب دنیا کے لوگ "عروس البلاد" کہتے تھے چونکہ بغداد خلفائے بنی عباس کا پایۂ تخت تھا اس لئے مسلمان اسلامی دنیا میں اس شہر کو احترام کے طور پر "مدینۃ الاسلام" کہتے تھے سہروردیہ سلسلے کا مؤسس حضرت شیخ شہاب الدین ابوحفص سہروردی کو شمار کیا جاتا ہے یہ سلسلہ اسلامی دنیا کے بہت وسیع علاقوں میں پھیلا اور خصوصاً ہندوستان میں جن دو سلسلوں کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس میں سے ایک سلسلہ سہروردیہ ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کی پیدائش ۵۳۶ / ۱۱۴۵ میں سہرورد نام کے مقام پر ہوئی جو لوگلڈیکی کے خیال کے مطابق سہراب کرد یا سہراد کرد تھا۔ بعد میں اسکا نام بگڑ کر سہرورد ہو گیا[1]

سہراب ایک قدیم ایرانی گورنر تھا یہ جگہ عراق و عجم کے پہاڑی علاقے پر شہر سلطانیہ کے قریب اور شمال کی طرف واقع ہے۔ جو آجکل ہمدان کے شمال میں صوبہ آذربائیجان میں واقع ہوا ہے۔ ایران کے قدیم جغرافیہ میں ہمدان سے لیکر جنوبی آذربائیجان تک کا پورا علاقہ جبال کی اصطلاح میں معروف تھا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ابتدائی عمر میں بغداد چلے گئے جہاں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۴ ص ۵۰۴

انکے چچا شیخ ابو النجیب سہروردی (۴۹۰/۱۰۹۶ — ۵۶۳/۱۱۶۸) پہلے سے مقیم تھے اور ایک مشہور عالم اور صوفی کی حیثیت سے بغداد میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے[1] شیخ شہاب الدین سہروردی کی ابتدائی تربیت میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور اس زمانے کے بہت سے فاضلوں اور عالموں کا ہاتھ ہے جوکہ اس زمانے میں بغداد میں قیام پذیر تھے البتہ شیخ کو تصوف اور طریقت کا راستہ خود انکے چچا شیخ ابو النجیب سہروردی نے دکھایا۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر اختصار کے ساتھ شیخ شہاب الدین سہروردی کے پیر طریقت یعنی شیخ ابو النجیب سہروردی اور انکے پیر طریقت یعنی شیخ احمد غزالی کا بھی ذکر کردیا جائے ۔

امام احمد بن محمد غزالی (وفات ۵۲۰ یا ۵۱۷/۱۱۲۶ یا ۱۱۲۳) جو پانچویں صدی ہجری گیارھویں صدی عیسوی کے ایک باکمال صوفی ہیں در اصل امام محمد غزالی (وفات ۵۰۵/۱۱۱۱)[2] کے چھوٹے بھائی ہیں ۔ امام محمد غزالی کی شہرت محتاج تعارف نہیں ہے امام محمد غزالی نے جس وقت ترک دنیا کی نیت سے بغداد کی اعلی تعلیم گاہ نظامیہ سے استعفا دیا تو انکی جگہ پر تدریس کی خدمت کی پیش کش انکے چھوٹے بھائی احمد غزالی کو کی گئی انہوں نے بھی کچھ دنوں تک نظامیہ بغداد میں استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کا وظیفہ انجام دیا مگر بعد میں اپنے بھائی کی طرح اس منصب سے استعفا دیدیا اور ارشاد و ہدایت میں لگ گئے جوکہ انکی دلچسپی کا اصل میدان

۱۔ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۱۱ ۲۔ ریاض النور ص ۱۵

تھا - شیخ احمد غزالی بغداد کے نہایت مشہور خطیب اور واعظ تھے مگر انکے مواعظ کا موضوع طریقت و عرفان کے مسائل تک محدود تھا - انکے مواعظ کو بعد میں مجموعے کی شکل میں جمع کیا گیا جسکو صوفیوں کی خانقاہ میں زبردست مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ان مواعظ کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں آج بھی موجود ہے - احمد غزالی کے معتقدات حسین بن منصور حلاج سے بہت نزدیک ہیں وہ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں بغداد سے مہاجرت کرکے شہر قزوین میں سکونت پذیر ہو گئے تھے جہاں انکا انتقال ۱۱۲۶/۵۲۰ یا بقول نفحات الانس ۱۱۲۲/۵۱۷ میں واقع ہوا[1] -

شیخ احمد غزالی کے جانشینوں اور شاگردوں میں سب سے زیادہ شہرت شیخ ابوالنجیب سہروردی کو میسر آئی اور احمد غزالی کے معتقدات کا چرچا بیشتر ابوالنجیب سہروردی کی کوششوں کا نتیجہ ثابت ہوا - شیخ ابوالنجیب سہروردی کی ولادت ۱۰۹۷/۴۹۰ میں جنوبی آذربائیجان کے مذکورہ بالا چھوٹے سے مقام سہرورد میں ہوئی جہاں سے آپ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بغداد تشریف لے گئے جہاں آپنے مختلف عالموں اور فاضلوں سے حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی - اسکے بعد آپ احمد غزالی کی صحبت میں رہنے لگے اور ان سے تصوف کے اسرار و رموز سیکھے پھر آپنے بغداد کے مغربی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک خانقاہ تعمیر کرائی جہاں عقیدتمند آکر آپسے روحانی فیض حاصل کرتے آپنے احادیث نبوی کے ذریعہ تصوف کے اصول اور اسکے اسرار و رموز کو ثابت کیا ہے - چونکہ بغداد میں آپ کا حلقہ ارادت

---

[1] نفحات الانس ص ۳۸۰

بہت وسیع ہو چکا تھا اس لئے آپ نے اپنے مریدوں کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے عربی زبان میں ایک رسالہ "آداب المریدین" کے نام سے تالیف کیا جسکا متعدد بار بہت سے عارفوں نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے[1] اور جو صوفیوں کی خانقاہوں میں ایک درسی کتاب کے طور پر بہت دنوں تک استعمال ہوتا رہا۔ شیخ ابوالنجیب سہروردی نے ۵۶۳/۱۱۶۸ میں بغداد میں وفات پائی اور اپنی خانقاہ میں مدفون ہوئے۔

شیخ احمد غزالی کے ایک دوسرے شاگرد اور جانشین کا ذکر بھی شیخ ابوالنجیب سہروردی کے ضمن میں کرنا ضروری ہے جو کہ اصل نام سے زیادہ اپنے لقب یعنی عین القضاۃ ہمدانی کے عنوان سے مشہور ہیں انکے اجداد شہر ہمدان کے قاضی تھے مگر انہوں نے منصب قضا اور اسکے مادی فوائد اور دنیاوی احترام کو چھوڑکر تصوف اور سلوک کی راہ اختیار کی عین القضاۃ ہمدانی بھی اپنے دوسرے معاصر شیخ ابوالنجیب سہروردی کی طرح مکتب جنیدی سے تعلق رکھتے تھے اور حسین بن منصور حلاج کے معتقدات کی تشریح میں نہایت سرگرمی کا اظہار کرتے تھے بغداد کے علماء نے عین القضاۃ کے معتقدات پر شک کرنا شروع کیا اور انکے اور انکے خلاف قتل و تشہیر کا فتوی جاری کردیا۔ عین القضاۃ ۳۶ سال کی عمر ۵۲۵/۱۱۳۱[2] میں اپنے استاد معنوی

---

[1] شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے روحانی حلقوں میں اسکی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے قاضی شرف الدین محمد بن محمد البلخی کی فرمائش پر ۷۶۶/۱۳۶۴ میں ایک مبسوط شرح لکھی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد بن یوسف الحسنی (وفات ۸۲۵ھ / ۱۴۲۱ء) نے ۸۱۳/۱۴۱۰ میں اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس میں جابجا توضیحی اضافے بھی کئے گئے

[2] [illegible]

حسین بن منصور حلاج کی طرح دار و رسن کی نذر کردئے گئے ۔

مذکورہ سطروں میں ان تین بزرگوں کا ذکر اشارتاً کرنا اس لئے ضروری

معلوم ہوا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی نفسیاتی کیفیات اور انکی ابتدائی زندگی کے ماحول

کا ایک نقشہ ذہن میں واضح ہو جائے یعنی یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ بغداد میں شریعت اور

طریقت کے درمیان تنازعہ کا ایک ماحول موجود تھا۔ جبکہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے طریقت

کے نمائندے کی حیثیت سے وہاں کی معاشرتی زندگی میں اپنے کو متعارف کرانا شروع کیا

وہ جب بغداد کے معاشرتی حلقوں میں ایک صوفی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے تو اس وقت

تک شیخ عبدالقادر جیلانی اور دوسرے حامیان طریقت و عرفان کی وفات ہوچکی تھی

شیخ شہاب الدین سہروردی کا مقابلہ طریقت کے حریف کی حیثیت سے علامہ عبدالرحمن

ابن جوزی سے ہوا ظاہر ہے کہ ابن جوزی اپنے وقت کے زبردست فقیہہ اور فاضل

انسان تھے ساتھ ہی انکو طریقت اور عرفان کے نمائندوں سے شدید اختلاف تھا۔ بلکہ وہ

صوفیوں سے علانیہ دشمنی کا اظہار کرتے تھے ابن جوزی جو زبردست خطیب اور فقیہہ تھے

نہ صرف صوفیوں کا مذاق اڑاتے تھے بلکہ انکی تردید اور مذمت میں قلم کا بھی استعمال

کرتے تھے انکی دو کتابیں "نقد العلم والعلماء" اور "تلبیس ابلیس" صوفیوں کے رد

میں بہت اہمیت رکھتی ہیں ابن جوزی کو اپنے زمانے کے خلفائے بنی عباس کی پوری
حمایت حاصل تھی اور انکے اشارہ پر اکثر و بیشتر صوفیوں کو قید و زندان کی مصیبت
جھیلنی پڑتی تھی اکثر و بیشتر صوفی انکے ... فتوی اور تشہیر کا شکار ہونے سے نہ بچ سکے
وہ اپنی تالیفات میں خصوصیت کے ساتھ ابو طالب مکیؒ، شیخ ابو القاسم قشیری اور احمد غزالی کے
معتقدات کی شدت کے ساتھ تردید و تکذیب کرتے تھے حاصل کلام یہ کہ شیخ شہاب الدین سہروردی
کو معمولی حریف سے سابقہ نہ تھا بلکہ ایک ایسے مخالف سے مقابلہ درپیش تھا جو علم و فضل کے علاوہ
حکومت وقت کی سرپرستی میں شریعت کی حمایت اور طریقت کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ ایسی
صورتحال کے پیش نظر انتہائی دانشمندانہ روش یہ تھی کہ صلح و مصالحت کا طریقہ اختیار کیا
جائے اور طریقت کے امتیازی عناصر کو شریعت سے دور و جدا بتانے پر اصرار نہ کیا جائے
بلکہ دونوں میں افہام و تفہیم کی ہر ممکن کوشش کی جائے تاکہ اختلافات کا دروازہ بند
رہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے یہی راستہ اختیار کیا اور آگے چلکر یہی اصول سہروردی
سلسلے کی سب سے ممتاز علامت قرار پائی۔ سہروردیہ سلسلے کا تعلق ویسے تو ابو النجیب
اور عین القضاۃ کے ذریعہ احمد غزالی تک پہونچتا ہے جو صریحاً جنید بغدادی اور حسین بن منصور حلاج
کے معتقدات کی تعلیم دیتے تھے مگر شیخ شہاب الدین سہروردی اس مسلک سے علحدہ

ہوجاتے ہیں اور اپنے سلسلے کو ایک دوسرے عقیدے کی سمت دکھاتے ہیں جہاں پر خاص تاکید یہ ہے کہ شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے سے جدا تصور نہ کرنا چاہئے ۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی مصالحانہ روش کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ انکے زمانے میں علماء شریعت جس قدر صوفیوں سے بدظن تھے وہ اعتراض اور بدظنی کا ماحول کم ہوگیا اور صوفیوں کے خلاف اہل شریعت نے جو محاذ آرائی کی تھی اس میں کمی واقع ہوگئی ۔

خلیفہ بنی عباس الناصر شیخ شہاب الدین سہروردی کا بڑا قدردان ہوگیا اور ان پر بہت زیادہ اعتبار کرنے لگا خلیفہ نے شیخ کو اپنے سفیر کی حیثیت سے پہلے تو مصر کے ایوبی سلطان ملک عادل سیف الدین کے دربار میں بھیجا اور پھر خوارزم کے حکمران سلطان محمد بن تکش خوارزم کے پاس روانہ کیا ۔ کہتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی خلیفہ عباسی کا پیغام لیکر قونیہ کے ترک فرمانروا علاءالدین کیقباد کے دربار میں بھی تین مرتبہ گئے تھے[1] ۔ گویا شیخ شہاب الدین سہروردی کی زندگی قدیم صوفیوں کی طرح ترک دنیا اور خالص فقر و درویشی پر مشتمل نہ تھی بلکہ تقوی و سلوک کے ساتھ ساتھ انکا تعلق اپنے عہد کے تمام اہم سلاطین سے بھی برقرار تھا ظاہر ہے کہ اس تعلق کی بناء پر شیخ شہاب الدین کو اپنے زمانے میں زبردست عزت و احترام حاصل تھا البتہ وہ بنیادی طور سے خانقاہی نظام اور خانقاہی زندگی کے آدمی

۱۔ سلجوق نامہ فارسی ص ۹۶-۹۷

نے تھے اور اپنا بیشتر اوقات دریائے دجلہ کے کنارے واقع ایک چھوٹی سی خانقاہ میں گذارتے تھے۔ خلیفہ عباسی الناصر نے انکی خانقاہ میں بہت سی تعمیرات کا اضافہ کر دیا تھا اور اسکے خرچ کے لیے ایک بڑی رقم بھی شیخ کو بھیجا تھا شیخ نے اپنی زندگی کا ایک خاصا حصہ سیر و سیاحت میں گذارا تھا جوکہ صوفیوں کا عام معمول تھا وہ مصر، ترکی، خراسان اور وسط ایشیا کے تمام ہی قابل ذکر مقامات سے گذرے تھے اور اپنی سیاحت کے زمانے میں بھی وہ کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی شرف یاب ہوئے۔ شیخ کی عظمت اور اہمیت کے سلسلے میں جہاں ایک یہ نکتہ قابل ملاحظہ ہے کہ وہ ایک زبردست سلسلے کے بانی ہیں وہاں ایک اور دلچسپ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ شیخ کے مریدوں میں جہاں بے شمار لوگ ہیں وہاں شیخ سعدی شیرازی بھی شامل ہیں شیخ سعدی بغداد میں عرصہ تک اپنے استاد کی خانقاہ میں مقیم رہے اور ان سے تصوف کے رموز حاصل کئے وہ یقیناً شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہر دلعزیز شاگرد تھے اس لئے کہ شیخ اہل بغداد کے عام رواج کے مطابق جب کبھی کشتی میں بیٹھ کر دریائے دجلہ کی سیر کرتے تو سعدی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اپنے عزیز شاگرد کو تصوف و اخلاق کی باریکیاں بتاتے رہتے تھے ایک ایسے ہی موقع پر شیخ نے جو تعلیم سعدی کو دی تھی اسکا وہ نہایت دلچسپ

مگر دقیق اشارہ ذیل کے قطعہ میں کرتے ہیں۔

مقالات مردان بمردی شنو | نہ سعدی کہ از سہروردی شنو
مرا پیر دانای فرخ شہاب | دو اندرز فرمود بررویِ آب
یکی آنکہ بر خویش خودبین مباش | دگر آنکہ بر غیر بدبین مباش

(بوستان سعدی)

شیخ شہاب الدین سہروردی کی وفات ۶۳۲/۱۲۳۵ میں بغداد میں

ہی واقع ہوئی وہ کئی کتابوں کے مؤلف ہیں مگر سب سے مشہور تالیف جو انکے قلم کا

ایک یادگار کارنامہ تصور ہوتی ہے وہ عوارف المعارف ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی اور جسے

بجا طور پر تصوف کی بنیادی کتاب کہا جاسکتا ہے اس کتاب میں تصوف کے تمام بنیادی

اور ضروری مسائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہی وہ تالیف ہے جس میں شیخ

نے پوری شعوری کوشش کے ساتھ شریعت اور طریقت کے اختلافات کو دور کرنے اور دونوں

میں مصالحت کی راہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے صوفیوں کی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے

یہ کتاب زبردست منبع الہام ثابت ہوئی۔ تمام عالم اسلام میں صوفیوں کی خانقاہوں

میں ایک سا ہی دستور تھا یعنی شیخ کی تاکید کے مطابق تمام مرید بعض کتابوں کا نہایت

دقیق مطالعہ کیا کرتے تھے اور ان کتابوں کو خانقاہی تربیت میں نصابی درجہ حاصل تھا۔

شاید یہ تصوف کی پہلی کتاب ہے جس میں تصوف کے بنیادی اور ضروری مسائل کو اس قدر تفصیل سے

بیان کیا گیا ہے کہ ایک سالک بغیر مرشد کے اس کتاب سے زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل

روحانی لذات حاصل کرسکتا ہے ۔ ایسی کتاب، بیشتر ان کتابوں کے زمرہ میں آتی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ شیخ کی مذکورہ کتاب سے متاثر ہوکر بعد کے بہت سے صوفیوں نے ایسی کتابیں لکھیں جو نفس مضمون کے اعتبار سے مذکورہ تالیف کا خلاصہ یا شرح معلوم ہوتی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ مقبول اور معروف کتاب شیخ عزالدین محمود بن علی کاشی (وفات ۷۵۲/۱۳۵۲) کی تالیف "مصباح الھدایہ و مفتاح الکفایہ" ہے جو فارسی میں لکھی گئی ۔

شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب عوارف المعارف ۶۳ ابواب پر مشتمل ہے اس کتاب میں لفظ صوفی کی حیثیت اور نوعیت پر دلچسپ بحث کی گئی ہے وہ اس عقیدے سے اتفاق نہیں کرتے کہ صوفی کا لفظ 'صفہ' سے مشتق ہے جو کہ مسجد نبوی میں ایک چبوترہ تھا اور جہاں نبی کریم صلعم کے بعض صحابی خالص زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے اور جنہوں نے اپنی مرضی سے ترک دنیا اور عزلت کا راستہ اختیار کرلیا تھا یہ الگ بات ہے کہ اصحاب صفہ کی زندگی بعد کے صوفیوں سے بالکل مماثلت رکھتی تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ نبی کریم صلعم اصحاب صفہ کے پاس سے گزرتے تھے تو انکے طریق زندگی کی تعریف کرتے تھے مگر شیخ شہاب الدین سہروردی کے نزدیک صوفی کا لفظ صفہ کے بجائے کلمہ 'صوف' یعنی اون سے مشتق ہے اس لئے کہ ابتدائی عہد کے صوفی موٹے اون کی گدری پہنتے تھے[۱]

---

[۱] عوارف المعارف اردو ترجمہ باب ۶ ص ۹۸

لفظ صوفی کی اصل اور مادہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے شیخ سہروردی ایک دلچسپ انکشاف

کرتے ہیں اور خراسان کے بہت سے ایسے صوفیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جو کہ غاروں میں بیٹھ

کر ہروقت یاد خدا میں مستغرق اور مشغول رہتے تھے اور ایسے لوگ شکفیہ اور جوئیہ کے

نام سے مشہور تھے[۱] شیخ کی اس دلچسپ اطلاع سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ خراسان

کے ابتدائی صوفیوں کی زندگی میں بہت سے طریقے بدھ مت کے راہبوں سے مستعار لئے گئے تھے

ہم جانتے ہیں کہ شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں خصوصاً وہ پہاڑی حصے جو آج مغربی

افغانستان میں شامل ہیں وہاں بدھ مذہب کے زمانے کی بے شمار خانقاہیں پہاڑوں کے اندر

پائی جاتی ہیں ابتدائی عہد کے صوفیاء نے تنہائی اور تجرد کو برقرار رکھنے کے لئے ان غاروں کا انتخاب

کیا جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت بدھ مذہب کے ماننے والوں نے قائم کی تھی جو

مسلمان صوفیوں تک منتقل ہوگئی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتاب میں ایک دوسرا نکتہ

علم سے متعلق ہے اس حدیث شریعت پر انکا اعتقاد ہے کہ "ایک عالم کو ایک عابد

پر اسی قدر ترجیح حاصل ہے جس قدر میری فضیلت امت پر ہے" وہ آیات قرآنی

کا حوالہ دیکر لفظ علم کے معنی بتاتے ہیں۔ انکا عقیدہ ہے کہ علم تفسیر و فقہ یا احادیث

پر عبور حاصل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ علم ایسی باطنی اور روحانی ودیعت ہے جو اللہ

۱۔ عوارف المعارف اردو ترجمہ ص ۱۰۲

کی طرف سے ایک انعام کے طور پر اسکے خاص بندوں کو عطا ہوتا ہے۔ یہاں پر شیخ سہروردی

نے طریقت کو شریعت سے جدا کرنے کے لئے ایک نہایت باریک فرق بیان کردیا ہے حالانکہ ظاہری

طور سے انکی کوشش یہی رہی کہ شریعت اور طریقت کو جدا نہ کیں جو غالبًا انکے زمانے کے

معاشرتی حالات کی مجبوری تھی شیخ قرآن کی اصطلاح "الراسخون فی العلم" کی تشریح

میں یہی نکتہ واضح کرتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں، جنکی روح حقیقت سے آشنا ہو چکی

ہے اور علم کی منزل میں راسخ ہونے کا مطلب یہی ہے کہ پاکیزگی اور زہد و تقوی کی مسلسل

مشق کے بعد انسانی روح حقیقت سے آشنا ہوجاتی ہے علم یعنی حقیقت سے آشنائی مدرسے

میں حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ یہ انبیاء کا ورثہ ہے۔ حقیقت سے آشنائی یعنی معرفت کے حصول کی

ضمن میں وہ سید الطائفہ جنید بغدادی کا حوالہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ معرفت کی

منزل تک پہونچنے سے پہلے بعض اوقات سخت مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے یعنی مسلسل زہد و عبادت

کے علاوہ شب زندہ داری، فاقہ، بھوک اور نفس کو مارنے کے لئے طرح طرح کی کوشش کرنی

پڑتی ہیں حتی کہ ان چیزوں سے بھی پرہیز اختیار کرنا پڑتا ہے جن کو شریعت نے عام حالت میں

اور عام آدمیوں کے لئے حلال قرار دیا ہے البتہ شیخ سہروردی ان صوفیوں کی شدید مذمت

کرتے ہیں جو اس عقیدے کی پیروی کرتے تھے یا اس کی ہمت افزائی کرتے تھے کہ معرفت کے

حصول کے بعد عارف شریعت کی ضرورت سے بے نیاز ہوجاتا ہے وہ اسکے بھی قائل نہیں ہیں کہ حالت سکر یا دوسرے لفظوں میں جذبے کی حالت میں عارف کے اوپر سے شرعی قیود اٹھ جاتی ہیں۔ شیخ تاکید کرتے ہیں کہ مجذوب اگر صوفی کامل ہے تو شریعت کی پابندی کو کبھی فراموش نہیں کریگا۔[۱] مسلمان صوفیوں نے بعض اوقات حلول کی طرف اشارے کئے ہیں شیخ سہروردی ہرگز نظریہ حلول کے قائل نہیں ہیں وہ حلول کی شدت سے تکذیب کرتے ہیں انکے خیال میں یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدے لاہوت اور ناسوت سے اخذ کیا گیا ہے۔ شیخ سہروردی کے نزدیک وہ تمام صوفی گمراہ ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ فنا کی منزل پر پہونچکر انکا وجود ذات الٰہی کے وجود میں غائب اور ضم ہوجائیگا جس طرح قطرہ سمندر میں گرکر سمندر کا حصہ بن جائیگا۔ انسان کے لئے مرضی الٰہی کا تابع ہونا اسکی بندگی اور عبودیت کی معراج ہے۔ عوارف المعارف میں نفس کی نوعیت اور کیفیت کے بارے میں بھی تفصیلی بحث ملتی ہے شیخ سہروردی کا خیال ہے کہ تمام مخرب اخلاق خواہشات نفس کے اندر سے ہی ابلتی ہیں اور نفس ہی انکا ذمہ دار ہے اس ضمن میں نفس کی اصلاح اور اسکے ضبط کی ترکیبیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ عوارف المعارف میں شیخ شہاب الدین سہروردی نے صوفیوں کے لئے خانقاہی زندگی کے ضابطوں کے بارے میں نہایت مفصل بحث کی ہے اور

---

[۱] عوارف المعارف اردو ترجمہ ص ۱۲۰

خاصے دلچسپ طریقے بتاتے ہیں عوارف المعارف کا یہ حصہ شیخ کی اصالت فکر کا ثبوت
ہے اور اس بحث کو شیخ عثمان ہجویری کی کشف المحجوب پر ایک برجستہ اضافہ تصور کرنا چاہئے
واقعہ یہ ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے تک یعنی بارھویں صدی عیسوی کے اواخر
میں صوفیوں کے اندر خانقاہی زندگی کا طریقۂ کار نہایت عام اور مقبول ہوچکا تھا لہذا انکا
ضابطہ متعین کرنا ایک بڑے اور صاحب فکر صوفی کی ذمے داری تھی یہ ذمہ داری
شیخ شہاب الدین سہروردی بڑی خوبی کے ساتھ پوری کرتے ہیں۔ شیخ نے یہ ضرور اعتراف
کیا ہے کہ خانقاہی زندگی ایک اعتبار سے بالکل ابداع یعنی نئی چیز ہے البتہ وہ خانقاہی
زندگی کا تعلق ارباب صفہ سے ملاتے ہیں اور وہ اپنے ضابطہ فکر کے مطابق خانقاہ کے اندر
وہی ماحول دیکھنا چاہتے ہیں جو مسجد نبوی میں ارباب صفہ نے پیدا کر رکھا تھا۔

سلسلہ نقشبندیہ

خواجہ ابو یعقوب یوسف ہمدانی سلسلہ نقشبندیہ کے بانی تصور کئے جاتے ہیں
وہ ممتاز صوفی و عالم تھے اور انکے پاس ہمدان تک دور دراز مقامات سے طلبا کی کثیر تعداد انکی خانقاہ میں پہنچتی تھی
انہوں نے خود ابتدائی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور مرو و ہرات کے شہروں میں ایک مقبول و معروف
صوفی کی طرح اپنی زندگی گزار کر ۵۳۵/۱۱۴۰ میں وفات پاگئے ان کا مزار شہر مرو میں واقع ہے۔

انکے چار مریدوں میں سب سے زیادہ شہرت خواجہ عبدالخالق کو ہوئی جو غجدوان کے رہنے والے تھے
یہ مقام بخارا کے نزدیک ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ شیخ عبدالخالق غجدوانی کو دراصل سلسلہ
نقشبندیہ کا سب سے بڑا مبلغ سمجھا جاتا ہے اور انہیں کی بدولت یہ سلسلہ ابتدا میں سلسلہ خواجگان
کہلایا تھا بعد میں اسکو سلسلہ نقشبندیہ کا لقب دیدیا گیا یہ سلسلہ ابتدا میں مرکزی ایشیا تک
محدود رہا اور بعد میں اس سلسلے کو ہندوستان میں بھی اچھا خاصا نفوذ حاصل ہوا۔ شیخ غجدوانی نے
عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ انکی تالیف مسالک العارفین
صوفیوں کے حلقوں میں بہت دنوں تک ایک نصابی کتاب کی طرح پڑھی جاتی رہی انکی دوسری کتاب
رسالہ عین الحیات بھی صوفیوں کی نظر میں نہایت قابل احترام اور اہم شمار ہوتی ہے۔ شیخ عبدالخالق غجدوانی
بظاہر یہی کہتے تھے کہ طریقت شریعت سے بالکل نزدیک ہے مگر وہ صوفیوں کے طریقہ زندگی کے سلسلے
میں آٹھ اصول پیش کرتے ہیں اور انکو ایک صوفی کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان اصولوں کو
اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ سب ہندوستان کے قدیم نظام 'یوگا' سے بہت زیادہ نزدیک معلوم
ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ بخارا سے لیکر ہرات اور قندھار تک بدھ مذہب کا زبردست اثر اسلام
کے بہت بعد تک برقرار رہتا آیا ہے۔ شیخ عبدالخالق غجدوانی یوگا کی ان آٹھ تعلیمات کو
صوفی زندگی کا جزو بنانے پر اصرار کرتے ہیں اور رسالہ عین الحیات میں انہیں اصولوں کو تفصیل کے

بیان کیا گیا ہے انکا خلاصہ ذیل میں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا اس لئے کہ سلسلہ نقشبندیہ اپنے اصولوں کی وجہ سے ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ نقشبندی صوفی انکو بدھ مذہب سے مستعار نہیں سمجھتے اور اصرار کے ساتھ یہ دعوی کرتے ہیں کہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی کو ان اصولوں کی تعلیمات حضرت خضر نے دی تھی۔ اکثر صوفیوں کے یہاں یہ روایت ہے کہ وہ حضرت خضر کو اپنی تعلیمات کا منبع الہام قرار دیتے ہیں اور خضر سے ملاقات کرنا صوفیوں کی ایک عام اور جانی پہچانی روایت ہے:

(۱) ہوش در دم = صوفیوں کو سانس اندر کھینچنے اور باہر نکالنے دونوں حالتوں میں ہوش برقرار رکھنا چاہئے اور لاپرواہی کے ساتھ سانس نہیں لینا چاہئے۔

(۲) نظر بر قدم = صوفیوں کو چلتے وقت اپنے قدموں پر نظر رکھنی چاہئے وسیع معنوں میں اشارہ یہ ہے کہ زندگی میں ہر قدم تدبر کے ساتھ اٹھانا چاہئے۔

(۳) سفر اندر وطن = اسکا مطلب یہ ہے کہ انسانی صفات سے ملکوتی صفات کی طرف بڑھنا صوفی کی ایک ذمہ داری ہے۔

(۴) خلوت در انجمن = اسکا مطلب یہ ہے کہ صوفی کی ظاہری مشغولیات سے اسکی باطنی مشق یعنی ذکر خفی میں حائل اور حارج نہیں ہونی چاہئے۔

(۵) یادکرد : صوفی کو زبان اور ذہن دونوں سے خدا کو یاد کرنا چاہئے اور ہر وقت یاد خدا میں مستغرق رہنا چاہئے۔

(۶) بازگشت : ذکر کے وقت صوفی کو آہستہ آہستہ خدا سے خطاب کرنا چاہئے کہ تو ہی میرا مقصد اور میری منزل ہے اور میں تیری طرف آرہا ہوں اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ صوفی کا دل ہر اچھے اور برے خیال سے خالی اور فارغ ہوجائیگا اور وہ ذکر کی لذت میں ڈوب جائیگا۔

(۷) نگاہ داشت : صوفی کو ذکر کے دوران دیکھ بھال رکھنی چاہئے کہ کوئی دوسرا خیال دل میں پیدا ہی نہ ہو۔

(۸) یاد داشت : صوفی کے دل میں طاری ہونے والی ایک کیفیت کا نام ہے اس کیفیت میں سوائے خدا کے اور کسی چیز کی موجودگی کا خیال دل میں باقی ہی نہیں رہتا۔[1]

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا سلسلہ مذکور بارھویں صدی عیسوی کے نصف میں وجود میں آچکا تھا خواجہ عبدالخالق غجدوانی کا عرصہ حیات کم وبیش تیرھویں صدی عیسوی کے بیشتر حصے پر محیط ہے مگر تیرھویں صدی عیسوی تک اس سلسلے کے مرکز ایک تو فقط مرکزی ایشیا، میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہاں سے باہر نہیں ہیں دوسری بات یہ ہے کہ سلسلہ مذکور کا نام تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر تک سلسلہ خواجگان ہی تھا یہ سلسلہ خواجہ بہاءالدین نقشبندی کی بدولت آگے چلکر سلسلہ نقشبندیہ

---

[1] رسالہ عین الحیات ص ۲۰

کہلانے لگتا ہے خواجہ بہاءالدین نقشبندی کی ولادت ۷۱۸/۱۳۱۸ میں واقع ہوئی تھی۔ ہندوستان

میں بھی یہ سلسلہ چودھویں صدی عیسوی میں داخل ہوتا ہے اور اس کے مراکز یہاں تیرھویں صدی عیسوی

کے بعد وجود میں آتے ہیں۔

سلسلہ کبرویہ

شیخ نجم الدین کبری (۱۱۴۵ء - ۶۱۸/۱۲۲۸ء) بھی ایک ایسے سلسلے کے بانی

ہیں جو شہرت اور اثرات کے اعتبار سے سہروردیہ سلسلے سے کم نہیں ہے۔ شیخ نجم الدین کبری کی شخصیت

بھی زوال بغداد کے وقت موجود صوفیوں کے زمروں میں نہایت اہمیت کی حامل ہے جنہوں نے بعد

کے صوفی مسلک اور عرفانی معتقدات پر نہایت ہی گہرے اثرات چھوڑے ہیں ان کے نفوذ کا اندازہ

اس سے ہوتا ہے کہ وہ صوفیوں کے ادب میں شیخ ولی تراش کے لقب سے مشہور ہیں شیخ نجم الدین کبری

کی پیدائش خوارزم میں ہوئی ابتدائی زندگی خوارزم اور ہمدان میں علوم ظاہری کی تکمیل یعنی حدیث و فقہ

کی آموزش میں گذری اس کے بعد وہ تبریز اور مصر کے شہر اسکندریہ وغیرہ میں سیاحت کرتے رہے

اور ان جگہوں پر عارضی طور سے اقامت کرکے اپنے علم و فضل کو بڑھاتے رہے۔ شیخ نجم الدین کبری

کی سلوک و معرفت کی تربیت قاہرہ میں مکمل ہوئی وہاں تصوف کے مسلک کی نمائندگی

شیخ روزبہان گازرونی کر رہے تھے نجم الدین کبری نے ان کی نگرانی میں سلوک کے مرحلے طے کئے اور

اس قدر اعتبار حاصل کیا کہ شیخ روزبہان نے اپنی بیٹی کی نسبت ان سے کردی اور ان کو

اپنے خلیفہ کی حیثیت سے واپس خوارزم جانے کی تاکید فرمائی[1]۔ نجم الدین کبری نے خوارزم پہونچکر

ایک خانقاہ تعمیر کی اور تصوف کی تبلیغ اور تربیت میں مشغول ہوگئے اور وہ بہت جلد پورے خراسان

میں مشہور ہوگئے انکے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع تھا خاص شاگردوں میں شیخ مجدالدین بغدادی (وفات ۶۰۶/۱۲۰۹)

شیخ سعد الدین حموی (شیخ فریدالدین عطار کے پیر) (وفات ۶۵۰/۱۲۵۳) اور شیخ نجم الدین دایہ (مرصاد العباد کے مولف) (وفات ۶۵۴/۱۲۵۶) کے نام قابل

ذکر ہیں۔ البتہ ان میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت شیخ سیف الدین باخرزی کی ہے جب شہر خوارزم

پر ۶۱۸/۱۲۲۱ میں منگولوں نے حملہ کیا اور شہر کو نیست ونابود کرڈالا تو اس خونی حادثہ میں شیخ

نجم الدین کبری کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے[2]۔ تاتاریوں کے حملے کا علم انکو اپنی روحانی قوت سے پہلے

ہی ہوچکا تھا انہوں نے اپنے بہت سے مریدوں کو اس المناک مصیبت سے آگاہ کیا اور انکو خوارزم کو

چھوڑکر جان بچانے کی خاطر دوسرے شہروں کی طرف چلے جانے کی ہدایت فرمائی مریدوں نے ان سے

بھی ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو انہوں نے یہ کہکر انکار کردیا کہ مجھ کو خوارزم سے جانے کا حکم نہیں ہے

قضائے الٰہی کا منشا یہ ہے کہ میں آخری دم تک خوارزم میں قیام کروں۔ شیخ کی زبان سے تاتاریوں

کی طرف سے نازل ہونے والی مصیبت کے حالات اور پیشگوئی کو سنکر بعض مریدوں نے سوال کیا کہ

کیا آپ مناجات اور دعاؤں کے ذریعہ اس تباہی اور دہشت خیز خونریزی کو ٹال نہیں سکتے

شیخ نجم الدین کبری نے اسکے جواب میں کہا کہ تباہی مقدر ہوچکی ہے اس سے نجات ناممکن ہے

A History of sufism In India V.1 P.93 [1,2]

یہ سنکر شیخ کے تمام مرید بادل ناخواستہ ان سے آخری ملاقات کرتے روتے اور پیٹتے رخصت ہوئے اور خراسان کے مختلف شہروں کی طرف چلے گئے۔

شیخ نجم الدین کبریٰ کا طریقۂ فکر سہروردیہ سلسلے کے صوفیوں سے خاصا جدا تھا وہ غیر معمولی وسعت مشرب رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو تمام خلق خدا کے ساتھ رواداری کا عمل کرنے کی تاکید فرماتے تھے وہ سہروردیوں کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ مقاطعہ اور زبردستی کے بھی قائل نہ تھے انکا یہ قول بہت زیادہ مشہور ہے کہ اللہ تک پہونچنے کے راستے اس قدر بے شمار ہیں جتنے کہ انسان کی سانسیں یعنی ان راہوں کو گنا نہیں جا سکتا حقیقت تک ہر راستہ بالآخر پہونچا دیتا ہے۔ شیخ نجم الدین کئی کتابوں کے مؤلف بھی ہیں ان میں زیادہ مشہور کتاب "الفصول العشرۃ" ہے جس میں تصوف کے دس اصول تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کردئے گئے ہیں۔ انکی دوسری کتاب جو سابق الذکر کی طرح عربی زبان میں ہی ہے وہ "منہاج السالکین" ہے مگر یہ مبتدیوں کے لئے نہیں ہے اسکا مطالعہ دقت کا محتاج ہے۔ شیخ کی ایک تالیف فارسی زبان میں بھی موجود ہے جسکا عنوان "صفات الادب" ہے یہ کتاب فارسی ادب سے کہیں زیادہ تصوف کے رموز و نکات پر روشنی ڈالتی ہے۔

شیخ نجم الدین کبریٰ نے ۱۲۲۱/۶۱۸ع[1] میں وفات پائی وہ اگرچہ

۱۔ تذکرۃ العارفین ص ۱۲۳

ذاتی طور سے تیرھویں صدی کے نصف اول کے صوفی ہیں لیکن انکا سلسلہ ہندوستان میں فوراً ہی مقبول نہیں ہوا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر تک ہندوستان میں کبرویہ سلسلے کے آثار واضح طور سے نظر نہیں آتے البتہ چودھویں صدی میں کبرویہ سلسلے کے نمائندے ہندوستان میں وارد ہونا شروع ہوتے ہیں کبرویہ سلسلہ بعد میں متعدد شاخوں میں تقسیم ہوگیا تھا بغداد اور خراسان میں اسکی بہت سی شاخیں نوریہ، رکنیہ، نوربخشیہ وغیرہ ناموں سے وجود میں آگئیں البتہ ہندوستان میں کبرویہ سلسلے کی دو شاخوں کو مقبولیت حاصل ہوئی یہ فردوسیہ اور ہمدانیہ کے نام سے مشہور اور متعارف ہیں چونکہ ہمارا موضوع تحقیق تیرھویں صدی عیسوی تک محدود ہے اس لئے فی الحال کبرویہ سلسلے کی مذکورہ بالا شاخوں یعنی فردوسیہ اور ہمدانیہ کے مرکزوں سے اور ان مرکزوں پر مشہور نمائندہ شخصیتوں کے ذکر سے اجتناب کرتے ہیں۔

چشتیہ سلسلہ

سلسلہ مذکور کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ بنیادی طور سے ایک ہندوستانی سلسلہ ہے اب تک جن سلسلوں کا ذکر کیا جاچکا ہے انکے مراکز ہندوستان سے باہر مرکزی ایشیاء خراسان حتیٰ کہ بغداد میں واقع تھے اور انکے بانی اکثروبیشتر ایران کے مختلف شہروں کے رہنے والے تھے۔ چشتی سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین چشتی کا مقام تولد ہندوستان سے باہر

خراسان کے جنوب مشرق میں واقع شہر سجستان میں واقع ہوا تھا لیکن انہوں نے اپنی روحانی سرگرمی کا اصل مرکز ہندوستان میں وارد ہونے کے بعد شہر اجمیر کو بنایا۔ اس ضمن میں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ خاص چشت تصوف کا کوئی اہم مرکز نہ تھا اور نہ چشتی سلسلہ ہندوستان سے باہر ایران اور افغانستان میں اس طرح پھیلا جس طرح کہ دوسرے سلسلے وہاں قائم اور برقرار تھے۔ چشت کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس سلسلے کی سب سے زیادہ اہم شخصیت شیخ ابو اسحاق شامی (وفات ۳۲۹/۹۴۰) حصول بیعت کے لئے حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری (وفات ۲۹۹/۹۱۱)[1] کے پاس جب بغداد پہونچے اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے تو خواجہ ممشاد علو دینوری نے ان سے انکا نام پوچھا جواب دیا کہ عاجز کو ابو اسحاق شامی کہتے ہیں آپنے فرمایا کہ آج سے چاہیئے کہ تمہیں ابو اسحاق چشتی کہیں اس لئے کہ چشت کے خاص و عام تجھ سے ہدایت پاکر میرے طریقے میں داخل ہو سکے اور روز قیامت تک اس سلسلے میں داخل ہونے والے چشتی کہلائینگے یہ کہکر خرقہ خلافت عطا کیا اور پھر چشت کے جانب روانہ کر دیا[2] چنانچہ آپ اپنے مرشد کے فرمان کے مطابق چشت (شاقلان) نزد ہرات کے علاقہ میں آکر سکونت پذیر ہو گئے[3] ۔ انہیں کی

---

[1] سفینۃ الاولیا ص ۱۸۹

[2] شجرۃ الانوار بحوالہ قلمی ورق ۱۵۳

[3] معین الارواح ص ۲۷ - ۲۸

بدولت چشت میں سب سے پہلے تصوف کی روایت قائم ہوئی۔ وہ حضرت حسن بصری کی
وساطت سے براہ راست حضرت علی مرتضیٰ اور سرور کائنات کو اپنا مرشد بتاتے تھے بہرحال
روایت یہ ہے کہ شیخ ابو اسحاق چشتی کچھ دن چشت میں رہکر واپس ملک شام کی طرف
مراجعت کر گئے البتہ کچھ دن انکے وہاں رہنے سے علاقہ چشت کو ایک اہمیت ملی یہ لینا
چاہئے کہ صوفیوں کی نظر میں مرکزیت حاصل ہوگئی صوفیوں کے شجروں میں بعض کا دعوی
ہے اور بعض اسکی تردید کرتے ہیں کہ شیخ نے اپنے خلیفہ اور جانشین کی حیثیت سے
خواجہ ابو احمد ابدال چشتی (۲۶۰/۸۷۳ — ۳۵۵/۹۶۵) کو وہاں چھوڑا خواجہ ابو احمد ابدال چشتی
کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ سومنات کی مہم پر ہندوستان بھی آئے تھے[1]
خواجہ ابو احمد ابدال چشتی سے لگاکر خواجہ مودود چشتی (وفات ۵۲۷/۱۱۳۲) اور شیخ عثمان ہرونی (وفات ۵۷۷/
۱۱۸۱) تک کئی درمیانی کڑیاں ہیں جنکے ناموں کا چشتی صوفیوں کے شجروں میں ذکر ملتا ہے۔ مگر معتبر
تاریخی تحقیق کا رجحان یہ ہے کہ پورے ایک صدی کے عرصے میں یعنی بارھویں صدی عیسوی میں
چشت کا مقام تصوف کے مرکز کی حیثیت سے اپنی اہمیت بالکل کھو دیا تھا نواح چشت میں
سنسبانی خاندان کی حکومت کے قیام سے نئے مراکز مثلاً فیروز کوہ وغیرہ وجود میں آئے
اور پورے علاقے میں سیاسی کشمکش اور جنگ و جدال کا ایسا سلسلہ قائم ہوا کہ وہاں

۱؎ سلسلہ عالیہ ص ۸

پر سکون و عافیت کا ماحول جو کہ تصوف کی تربیت کے لئے لازمی شرط ہے بالکل ختم ہوگیا یہ

دعوی اس بنیاد پر بھی معتبر معلوم ہوتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں خواجہ معین الدین چشتی

اپنے وطن کو خیر آباد کہکر وہاں سے نسبتاً دور دراز کے مقام یعنی راجستھان میں واقع

شہر اجمیر کو اپنی روحانی سرگرمی کا مرکز قرار دیتے ہیں اور ہندوستان چلے آتے ہیں اگر چشت

اور اسکے آس پاس کا ماحول سازگار ہوتا اور وہاں کے معاشرہ میں عافیت اور امن ہوتا

تو امکان یہی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر تشریف نہیں لاتے صوفیوں کے ادب میں

خواجہ معین الدین چشتی کی اجمیر میں آمد کے سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جن میں سے

ایک یہ بھی ہے کہ مدینہ میں قیام کے دوران ایک دن دربار رسالت سے اجمیر جانے اور

وہاں پھیلی ہوئی کفر و ظلمت کی تاریکی کو دور کرنے کا حکم ملا خواجہ معین الدین اس بشارت

سے بہت خوش ہوئے لیکن انہیں اجمیر کا محل وقوع معلوم نہ تھا پھر حضور صلعم نے ایک انار انکے

ہاتھ میں دیا اور فرمایا کہ جس جگہ تمہیں جانا ہے اسے اس میں دیکھو حکم کے مطابق جب انار

میں نگاہ کی تو تمام عالم اس میں نظر آیا جس میں اجمیر اور اسکی پہاڑیاں بھی تھیں [1] بقول

صاحب معین الارواح خواجہ صاحب زیارت حرمین کے لئے ۵۸۳/۱۱۸۷ سے ۵۸۵/۱۱۸۹ کے

درمیان گئے [2] تاریخ فرشتہ نے انکے ہندوستان بلکہ اجمیر میں داخل ہونے کی تاریخ ۵۶۱/۱۱۶۵

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۲۴ - مونس الارواح میں بھی یہی واقعہ کچھ فرق کے ساتھ موجود ہے اس میں خواب کے ذریعہ تمام عالم اور اجمیر کا دکھایا جانا لکھا ہے اور اسکے بعد انار بہشتی عطا کرنے کا ذکر ہے مونس الارواح قلمی ۱۰ - [2] معین الارواح ص ۸۹

لکھی ہے[1] نیز مونس الارواح میں ہے کہ ورود ہند کے بعد آپ نے پہلے دہلی میں قیام کیا جب وہاں آپ کے پاس عقیدتمندوں کا ہجوم رہنے لگا تو آپ نے اس سے بیزار ہوکر اجمیر کا ارادہ کیا[2] اس لئے دربار رسالت سے بشارت کا واقعہ کچھ زیادہ معتبر نہیں جیسا کہ صوفیوں کا قاعدہ ہے عقیدت کے جوش میں انکی روایات کا دامن بہت زیادہ پھیل جاتا ہے اور اس میں کرامات کا عنصر ثانی در تک داخل ہو جاتا ہے مگر یہ بات اپنی جگہ برقرار ہے کہ چشت بلکہ اسکے نواح بلخ سے لیکر ھرات تک کے وسیع اور عریض خطے میں زبردست سیاسی کشمکش کا ماحول مسلسل جاری تھا۔

اس میں شک نہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی قرون وسطی کی تاریخ اور مجموعی طور سے اسلامی تہذیب کی ایک نہایت عظیم شخصیت ہیں لیکن بعد کے عقیدتمندوں نے اپنی تالیفات میں انکی ذات کو بے شمار روایات کی تہوں میں لپیٹ دیا ہے پھر بھی انکے کردار کی عظمت کی تشخیص میں مشکل نہیں پیش آتی اور ہندوستان کی سماجی اور فکری تاریخ پر جو اثرات انکی ذات سے مرتب ہوتے ہیں انکا اعتراف تمام مورخین نے ہر دور میں کیا ہے تحقیق کے طالب العلم ہونے کی وجہ سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ان تمام عقیدتمندوں کی سطح سے بلند ہوکر جستجو کریں مگر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے سلسلے میں یہ مباحث درپیش

ع[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۷ ع[2] مونس الارواح قلمی ۲۲

آتی ہے کہ ابتدائی اور معتبر تالیف یعنی فوائد الفواد جو حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا (وفات ۷۲۵/۱۳۲۵) کے ملفوظات کا مستند مجموعہ ہے اور ابتدائی چشتیہ تاریخ بھی ہے جسے انکے مرید اور شاعر حسن دہلوی (وفات ۳۸-۷۳۷/۳۷-۱۳۳۶) نے ۷۰۷/۱۳۰۷ سے ۷۲۲/۱۳۲۲ کے درمیان مرتب کیا اس میں معین الدین چشتی کا ذکر تین بار بالکل سرسری اور ضمنی طور پر کیا گیا ہے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (وفات ۷۵۷/۱۳۵۶)[1] کے ملفوظ خیر المجالس جسے انکے مرید حمید قلندر (وفات ۷۶۸/۱۳۶۶)[2] نے مرتب کیا اس میں خواجہ معین الدین چشتی کا ذکر بالکل نہیں ملتا سیر الاولیا جسے امیر خورد کرمانی (وفات) نے مختلف کتب اور زبانی روایات کی بناء پر ترتیب دیا ہے اس میں بھی خواجہ کا ذکر بہت کم ہے وہ مآخذ جن میں انکی زندگی کے حالات، پرتھوی راج کے دربار میں انکے مباحثے، ہندو جوگیوں سے انکا مقابلہ اور انکی شخصیت اور انکے کرامات کا ذکر ملتا ہے انکے بارے میں سنجیدہ تحقیق سخت مشکوک ہے اور انکو سرے سے جعلی تالیفات کی ردیف میں رکھا جاتا ہے مثلاً دلیل العارفین، فوائد السالکین، اسرار الاولیاء، راحت القلوب وغیرہ۔ بہرحال صوفیوں کا ایک علحدہ ادبی ذخیرہ ہے اور انکا ایک مخصوص ادبی مزاج ہوتا ہے صوفی ادب میں تمام ہی عارفوں کے تذکرہ کے ساتھ کشف و کرامات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور صوفی ان باتوں کو خلاف فطرت نہیں سمجھتے کرامات کی حکایتوں کو

---

[1] مفتاح التواریخ ص ۸۹ [2] تذکرہ مشائخ ھند ج ۱ ص ۱۳۷

سننے اور سنانے کا تمام ہی صوفیوں کو غیر معمولی شوق ہوتا ہے۔

ہمارے پاس خواجہ معین الدین چشتی کی حیات اور چشتی مسلک کی تبلیغ کے سلسلے میں انکی کوششوں کو معلوم کرنے کے لئے اگر کوئی ماخذ ہے تو وہی تذکرے اور تالیفات ہیں جنکو مجموعی طور پر صوفی ادب کہا جاتا ہے لہذا اس ادب سے بعض ضروری تفصیلات کو اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی کی زندگی اور انکے کاناموں پر سب سے زیادہ مفصل اور قابل یقین ذکر جمالی دہلوی (وفات ۹۴۲/۱۵۳۹ء) کی سیر العارفین میں ملتا ہے جسے خواجہ اجمیری کی وفات سے کوئی تین سو سال بعد جمالی دہلوی نے لکھا[1]۔ اور جسکو نصیر الدین ہمایوں بادشاہ کے نام معنون کیا۔ شیخ جمالی دہلوی نے بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں اپنی زندگی کا ایک عرصہ گزارا اور مدت تک ہندوستان سے باہر درویشانہ وضع میں گھومتے رہے جو صوفیوں کا عام دستور تھا جب وہ اس لمبی سیاحت کے بعد ہندوستان واپس آئے تو ارباب صدق و صفا کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی[2]

جمالی نے کتاب لکھنے کی وجہ سے متعلق ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

"زیرا کہ بیشتر احوال و اعمال اسلوب و منوال این بزرگان اہل کمال
بعضی مجاوران سہل و معتقدان نا اہل در صفوت افواہ مردمان نا وقوف
سخنان مختلف غیر واقع انداختند و مسمعان بہوت و نا ثبوت لـ

---

[1] اسکی تصنیف ۹۳۶/۱۵۳۱ سے ۹۴۱/۱۵۳۵ کے درمیانی عرصہ میں ہوئی
[2] سیر العارفین قلمی ۔ ۳

بدان کلمات اعتقاد و اعتماد می نمایند بازدارم[1]

جمالی کے اس بیان سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ اس وقت تک ان صوفیائے کرام سے متعلق بے بنیاد اور غلط روایتیں منسوب ہونی شروع ہوچکی تھیں۔ جمالی نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ وہی داستانیں اور روایتیں ہیں جو انہوں نے ایران اور مرکزی ایشیا کی خانقاہوں میں رہنے والے صوفیوں سے سنی تھی اسکے علاوہ وہ روایتیں بھی ہیں جو ہندوستان میں رہنے والے صوفیوں کے درمیان مشہور تھیں ظاہر ہے اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد سنے گئے حالات و واقعات پر مکمل طور سے اعتماد کر لینا مناسب نہیں ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

"بنا بر آن ہرچہ معلوم داشتم و مرقوم یافتہ بودم بقلم آوردم و این مجموعہ معرفت را کہ اکثر احوال و سیر عارفانست سیر العارفین نام نہادم تا از برکت تذکرہ ایشان طالبان این معنی را دولت عظیم و نعمت مستقیم روی نماید و خوانندگان و مستمعان را از برکات این نکات حق تبارک و تعالیٰ در حیات و ممات نجات بخشند"[1]

---

[1] سیر العارفین قلمی - ۳

باب سوم

تیرھویں صدی عیسوی کے صوفیائے کرام

خواجہ معین الدین چشتی

ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ معین الدین چشتی سجستان میں
۵۳۷/۱۱۴۲ میں پیدا ہوئے۔ اور انکی ابتدائی تربیت خراسان میں ہوئی[1] انکے والد غیاث الدین حسن
نہایت پاک سیرت اور خدا ترس بزرگ تھے۔ خواجہ بارہ یا پندرہ برس کے تھے کہ انکے والد نے وفات
پائی انکی بسراوقات کا سہارا ورثہ میں ملا ہوا ایک باغ اور پن چکی تھی۔ ایک دن انکے باغ
سے ایک مجذوب ابراہیم قندوزی کا گذر ہوا تو خواجہ نے انکی خدمت میں انگور کے خوشے
پیش کئے۔ درویش مجذوب نے بغل سے کھلی نکالی اور اسے دانتوں سے چباکر خواجہ کے منہ میں رکھدی
غرض یہ کہ ابراہیم قندوزی کی کرامات سے خواجہ کو تصوف کی راہ مل گئی اور انکے دل میں نور عرفان
یکایک پیدا ہوگیا انہوں نے اپنی تمام املاک اور اثاثۂ دنیوی کو فروخت کردیا اور جو کچھ نقد
آیا اسے درویشوں میں بانٹ دیا[2] اور مسافرت اختیار کی مدت تک فقر و افلاس کی
حالت میں سمرقند اور بخارا میں رہکر قرآن کریم حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تعلیم میں لگے رہے[3]
تعلیم کی تکمیل کے بعد سمرقند سے عراق کی جانب روانہ ہوئے قصبہ ہروان میں
شیخ عثمان ہروانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انکی تربیت میں سخت مجاہدہ اور ریاضت میں مشغول
رہکر سلوک کی تربیت مکمل کی اور تقریباً بیس سال تک انکی خدمت میں رہے اور ان کے ساتھ

۱۔ سفینۃ الاولیا ص ۱۵۸ ۲۔ سیر العارفین قلمی ۷ ۳۔ انوار العارفین ص ۳۲۶

ہی مختلف جگہوں کی سیاحت کی عـ۱ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت بھی ساتھ ہی کی

خواجہ عثمان ہروانی نے دربار رسالت میں اپنے مرید کے لئے دعا کی عالم غیب سے ندا آئی

"معین الحق دوست ماست او را قبول کردم و برگزیدم" عـ۲

مرآۃ الاسرار میں ہے کہ خواجہ عثمان ہروانی اپنے مرید خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق اکثر کہا کرتے تھے

"معین الدین ما محبوب اللہ است و مرا از مریدی وی تفاخر می باشد" عـ۳

غرض خواجہ عثمان ہروانی سے خرقہ اور خلافت نامہ حاصل کرنے کے بعد آپ بغداد کی طرف روانہ ہوئے

قصبہ سنجار یا سنجان میں انکی ملاقات شیخ نجم الدین کبری (وفات ۶۱۰/۱۲۱۳) سے ہوئی کچھ

عرصہ انکی خدمت میں قیام کرنے کے بعد وہاں سے روانہ ہوکر قصبہ جیل پہونچے اور وہاں محی الدین عبدالقادر جیلانی

کا شرف نیاز حاصل کیا اور ستاون روز انکی خدمت میں … عـ۴ رہکر پھر بغداد پہونچے بغداد میں

اس زمانے میں بہت سارے عارفوں اور اولیائے کرام کا مجمع تھا یہاں وہ شیخ شہاب الدین سہروردی

(وفات ۶۳۲/۱۲۳۴) اور انکے پیر شیخ ضیاء الدین ابو النجیب سہروردی (وفات ۵۶۳/۱۱۶۷) سے ملاقات

کی کہا جاتا ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے آپ سے فیض بھی اٹھایا وہیں اوحد الدین کرمانی (وفات ۶۳۴/

۱۲۳۶) کو فیض یاب کرنے انکو خرقہ خلافت بھی عطا کیا۔ عـ۵ غرض انہوں نے اپنی سیاحت اور مسافرت

عـ۱ اسرار الاولیاء میں ہے کہ وہ بیس برس تک شیخ کی خدمت میں اس طرح رہے کہ انکا کپڑا اور بستر سر پر رکھکر حج کے لئے جاتے اسرار الاولیاء ص ۲۸

عـ۲ مونس الارواح قلمی ۱۱ عـ۳ مراۃ الاسرار قلمی ۱۶۰ عـ۴ سفینۃ الاولیاء ص ۱۵۸ تاریخ فرشتہ نے اس ملاقات سے انکار کیا ہے تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۵ سیر الاقطاب نے دو مرتبہ ملاقات ہونا لکھا ہے

باقی اگلے صفحہ پر

کا معمول جاری رکھا اور ایران، عراق اور شام میں واقع تقریباً سارے اہم مقامات ہمدان تبریز، جرجان، استرآباد، ہرات، سبزوار، حصار شادمان، بلخ اور غزنی وغیرہ کے سفر کئے ان مقامات پر انہوں نے کچھ زیادہ عرصہ قیام نہیں کیا بلکہ ان مقامات پر مشائخ سے ملاقات اور استفادہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے جب ان مقامات کی سیاحت کے بعد ہندوستان میں داخل ہوئے تو شیخ علی بن عثمان ہجویری کا انتقال ہو چکا تھا خواجہ نے انکے مزار پر چلہ کشی کی۔ شیخ سعد الدین حمویہ کے پیر شیخ زنجانی زندہ تھے انہوں نے بڑے خلوص و محبت سے خواجہ صاحب کا خیر مقدم کیا۔ کچھ عرصہ انکے ساتھ قیام کے بعد ان سے رخصت لیکر دہلی پہونچے[1] دہلی میں کچھ عرصہ قیام کے بعد انکی شہرت پھیلی اور لوگوں کا ہجوم انکے پاس آنے لگا تو وہ اجمیر کی طرف روانہ ہو گئے[2] یہاں چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ نے انکے قیام اجمیر کی مخالفت میں مختلف طریقوں سے رخنہ ڈالنے کی کوشش کی ہندو جوگیوں کو اپنے سحر اور جادو کے ذریعہ خواجہ کو مغلوب کرنے کے لئے مامور کیا لیکن خواجہ معین الدین چشتی اپنی روحانی قوت سے ان سب پر غالب رہے[3]

ایک بار اس سفر سے قبل بھی ملاقات کا ذکر ہے اس موقع پر خواجہ کو دیکھتے ہی عبد القادر جیلانی نے فرمایا تھا: "این مرد از مقتدای مشائخ روزگار خواہد بود کہ بسیاران از دولتش بمنزل رسند" سیر الاقطاب ص ۱۰۶ ع۵ سیر العارفین قلمی ۵

ع۱ شجرۃ الانوار بہ مختصر بہ قلمی ۳ ع۲ مونس الارواح قلمی ۲۲ " لقعا بر جیوہ الاجرار من تذکار جیوہ الابرار" اجمیر میں داخل ہونے کا سن ۵۸۲ھ کلمات ص ۱۲۸ تاریخ فرشتہ نے ۵۶۱ھ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۷ سیر الاولیاء سے کہ خواجہ کے ہندوستان میں داخل ہونے کے وقت یہاں کا حکمران پتھورا تھا سیر الاولیاء ۵۰-۶ لیکن صاحب طبقات ناصری اور تحفۃ الزاغ نے لکھا ہے کہ وہ سلطان معز الدین محمد بن سام غوری کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ع۳ اخبار الاخیار ص ۲۸

خواجہ معین الدین چشتی کی ذات کے سلسلے میں اس قدر بے شمار روایات کا انبار بعد کی تالیفات میں جمع ہوگیا ہے کہ واقعی طور پر صحیح اور غلط کا امتیاز نہایت ہی مشکل ہے۔ خواجہ نے اجمیر میں اپنا وقت نہایت ہی خاموشی سے گذارا انہوں نے دہلی میں چشتی سلسلے کی تبلیغ کا کام اپنے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی کو سونپ رکھا تھا اجمیر سے آخری وقت تک صرف ایک بار سفر دہلی کا ذکر سیرالاولیاء میں ہے[1]۔ وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خواجہ کے پاس اجمیر کے قریب ایک گاؤں جاگیر کے طور پر تھا مقامی حکام کا تقاضا تھا کہ اسکے لئے شاہی فرمان حاصل کرلیں شیخ کے صاحبزادوں نے شیخ سے اصرار کیا کہ وہ دہلی جاکر بادشاہ سے فرمان حاصل کرلیں خواجہ دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں پہونچکر اپنے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی کے پاس قیام کیا جب قطب الدین کو آپکے دہلی آنے کی وجہ معلوم ہوئی تو انہوں نے خواجہ کو شاہی دربار میں جانے سے روک دیا اور خود اس فرمان کو حاصل کرنے کے لئے بادشاہ وقت شمس الدین التتمش کے پاس پہونچے اور بادشاہ سے فرمان حاصل کرکے خواجہ کے سپرد کردیا اسی سفر میں خواجہ کو قطب الدین بختیار کاکی اور نجم الدین صغری[2] کے اختلافات کا علم ہوا وہ قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے لگے اس بات سے تمام دہلی میں ایک شور برپا ہوگیا چنانچہ آپ نے اہل شہر کی فریاد

ع[1] سیرالاولیاء ص ۶۳

ع[2] آپ بھی خواجہ عثمان ہرونی کے مرید تھے اور دہلی میں سلطان کی طرف سے شیخ الاسلامی کے عہدہ پر فائز تھے۔

اور سلطان التمش کی گذارش پر قطب الدین کو دہلی میں ہی چھوڑ دیا اور خود اجمیر کے لئے روانہ ہوگئے[1]

سیر العارفین میں بھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حالات کے ضمن میں

خواجہ معین الدین چشتی کے اجمیر سے دہلی پہونچنے اور وہاں قطب الدین سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے لیکن سیر العارفین کی روایت سیر الاولیاء کی روایت سے قدرے مختلف ہے سیر العارفین میں کہا گیا ہے کہ جب قطب الدین بختیار کاکی نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی تو وہاں سے اپنے پیر مرشد کی خدمت میں اشتیاق ملاقات کا ایک خط روانہ کیا اور قدمبوسی کی اجازت مانگی جواب میں خواجہ معین الدین نے انہیں وہیں رہنے کی تاکید فرمائی اور کہا کہ انشاء اللہ ہم خود اس طرف آئنگے چنانچہ آپ کچھ عرصہ بعد دہلی پہونچے اور پھر انہیں اس بدگمانی کا علم ہوا جو شیخ نجم الدین صغری اور قطب الدین بختیار کاکی کے درمیان تھی اور وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر قبل کیا جا چکا ہے۔ غرض خواجہ نے اس سفر کے بعد اپنے آخری ایام تک اجمیر میں ہی تبلیغ اسلام کا کام کیا۔ اجمیر میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ صرف اجمیر سے دہلی جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا[2]۔ انوار العارفین میں ہے کہ وہ اس قدر مستغرق رہتے کہ اس دنیا کی انہیں کوئی خبر نہ ہوتی جب نماز کا وقت ہوتا تو خواجہ قطب الدین اور خواجہ حمید الدین ناگوری انکے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز میں الصلواۃ الصلواۃ کہتے خواجہ کو احساس ہوتا

۱۔ سیر الاولیاء ص ۴۶ ۲۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۲۵۹

۳۔ انوار العارفین ص ۳۸-۳۳۷

ہوتا تو دوسری مرتبہ انکے کانوں میں الصلوٰۃ الصلوٰۃ کہتے پھر بھی آپ کا استغراق ختم نہیں

ہوتا۔ پھر آپ کے جسم کو ہلایا جاتا تو کہتے سترح محمدی سے چھٹکارا نہیں وضو کرتے اور نماز پڑھتے

مونس الارواح میں ہے کہ آپ ستر سال تک رات کو نہ سوئے اور نہ آپکا پہلو زمین پر پہونچا[1]

انوار العارفین میں قضائے حاجت کے سوا ستر سال تک آپ کے وضو کے کبھی باطل نہ ہونے کا بھی ذکر ہے[2]

صاحب مونس الارواح نے آپ کے متعلق لکھا ہے :

" نقل از شیخ فریدالدین گنجشکر قدس سرہ کہ فرمودہ اند از پیر خود حضرت
خواجہ قطب الدین احمد بن موسی اوشی شنیدہ ام کہ می گفتند پیر من حضرت
خواجہ معین الدین چشتی رضی اللہ عنہ ریاضت و مجاہدہ عظیم می داشتند بعد از
ہفت روز بپارچہ نانی از پنج مثقال بیش نبودے بآب تر ساختہ افطار می کردند"[3]

شجرۃ الانوار یہ اور انوار العارفین میں بھی قطب الدین بختیار کاکی سے یہی نقل ہے کہ :

" معین الدین نفس را ہرگز بمراد او نرساندی چنانکہ بعد از ہفتہ بلب نانی
کہ از پنج مثقال کمتر بودی افطار فرمودے " [4]

شیخ نظام الدین اولیاء سے خواجہ معین الدین چشتی کے لباس کے متعلق نقل ہے کہ :

"پوشش خواجہ بزرگ جامہ دوتا ی بود و ہر جا کہ پارہ شدی
التہای پاک ہر نوعی کہ یافتی پیوند کردی" [5]

خدا کی طرف سے ان پر جو بھی تکلیف یا مصیبت نازل ہوتی اس پر صبر کرتے اور کبھی

پریشان نہ ہوتے کبھی کسی بیماری میں اپنی صحت کے لئے دعا نہ کرتے بلکہ یہ کہا کرتے

---

[1] مونس الارواح قلمی ۱۹ [2] انوار العارفین ص ۳۲۵

[3] مونس الارواح قلمی ۸ [4]

[5] شجرۃ الانوار یہ فخریہ قلمی ۱۷۶

"الهی برجا که دروے تختی است برجان شیخ معین الدین سجزی نام زو کن"[1]

اور ایسا کرنے کو ایمان کی دلیل بتاتے" خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر میں ہی وفات پائی

اور وہیں دفن کئے گئے سال وفات ۶۲۷/۱۲۲۹ ہے اور وفات کے وقت عمر نوے[۹۰] سال تھی[2]

شیخ حمید الدین سوالی[3] ناگوری

شیخ حمید الدین ناگوری کا شمار خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے نہایت

مقرب اور معتقد مریدوں میں ہوتا ہے آپ کی کنیت ابو احمد اور لقب سلطان التارکین ہے۔[4]

آپ سعد بن زید جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے انکی اولاد میں سے ہیں۔[5] آپ کے والد کا نام احمد

تھا جو لاہور سے ہجرت کرکے دہلی میں سکونت پذیر ہوگئے تھے وہیں انکی شادی ہوئی اور حمید الدین

پیدا ہوئے اپنی پیدائش کے متعلق خود فرماتے ہیں۔ "اول کسے کہ بعد از اسلام در دہلی

زادہ شد من بودم"[6] خواجہ معین الدین چشتی کے دوران دہلی کے قیام حمید الدین ناگوری نے انکے

ہاتھ پر بیعت کی آپ کی والدہ ماجدہ بھی اپنے وقت کی بڑی متقی اور پرہیزگار خاتون تھیں

انکے متعلق فرماتے ہیں: "در وقتی کہ من متولد شدم اگر دران روزگار، ہیچ عورتی از مادر من

۱۔ اسرار الاولیا ص ۹۲
۲۔ تاریخ دعوت و عزیمت ج ۳ ص ۳۱
۳۔ سوالی ناگور کا ایک گاؤں ہے جو اجمیر سے دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے
۴۔ سفینۃ الاولیا ص ۱۶۰
۵۔ تذکرہ علمائے ھند اردو ص ۱۷۰ ۶۔ سرور الصدور قلمی ۷ مسلمانوں نے دہلی کو ۵۸۸/۱۱۹۲ میں فتح کیا اس لئے اندازہ ہے کہ آپ ۵۹۰ کے درمیان پیدا ہوئے ہونگے۔

بہتر و برزگتر بودی من از شکم او زادہ شدمی "[1]

سلطان التارکین کے لقب سے پکارے جانے کے متعلق صاحب "اخبار الاخیار"

نے یہ وجہ لکھی ہے کہ "ایک مرتبہ خواجہ معین الدین چشتی بہت خوش تھے انہوں نے حاضرین

سے کہا کہ جسکو جو دل چاہے مانگے حاضرین میں سے کسی نے دنیا مانگی اور کسی نے عقبیٰ جب

خواجہ معین الدین چشتی آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ سے آپ کی خواہش پوچھی تو

آپ نے عرض کیا "بندہ را خواستی نباشد خواست مولی است"

جواب میں معین الدین چشتی نے فرمایا "التارک الدنیا والفارغ من العقبیٰ سلطان التارکین حمید الدین صوفی"[2]

یہ بھی ایک مقبول روایت ہے جس پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے کہ اپنے ابتدائی زمانے

میں حمید الدین ناگوری بہت خوبصورت تھے چنانچہ جو عورت انکو دیکھتی وہ ان پر فریفتہ ہوجاتی لیکن

خواجہ معین الدین چشتی کی صحبت کے بعد تائب ہو گئے اور سخت روحانیت تقویٰ اور درویشی کا

مسلک اختیار کرلیا اور اپنی ساری دولت فقراء میں تقسیم کردی[3] انکے توبہ کرلینے کے بعد پرانے ساتھیوں

نے جب انہیں پھر سے فسق و فجور کی طرف مائل کرنا چاہا تو آپ نے جواب دیا کہ

"بروید بشنید منکہ ازار بند خود را خیاں محکم بستہ ام کہ فردا بحوران بہشت ہم باز نکنم"[4]

---

[1] سرور الصدور قلمی ۴ [2] اخبار الاخیار ص ۳۶

[3] سیر العارفین قلمی ۱۲ [4] فوائد الفواد ص ۲۰۶ بر سیر العارفین قلمی ۱۲

انکے بیشتر اوقات دشت وصحرا میں گذرتے تھے آپ کے پوتے اور جانشین فریدالدین محمود کہتے ہیں کہ "شیخ بزرگ چہل سال مجرد بود و در بیابان می گشت" ع۱

فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار ان سے پوچھا گیا کہ بعض مشائخ وفات پا جاتے ہیں اور انکی وفات کے بعد کوئی بھی شخص انکا نام نہیں لیتا اور بعض کی وفات کے بعد انکا نام اور انکی شہرت دنیا کے دور دراز حصوں میں پہونچ جاتی ہے اسکی وجہ کیا ہے؟ آپنے جواب دیا کہ جو صوفی اپنی زندگی میں خود اپنی تشہیر کرنے میں کوشاں رہتا ہے اسکی وفات کے بعد اسکا نام مٹ جاتا ہے اور اسکی شہرت ختم ہوجاتی ہے اور جو شخص زندگی میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھتا ہے وفات کے بعد اسکا نام اور اسکی شہرت تمام جہان میں پھیل جاتی ہے۔ ع۲ وہ وعظ اور پند کی مجلسوں میں اپنے مریدوں کو یہ بھی بتاتے تھے کہ ایسا صوفی جو نام ونمود اور شہرت کی فکر میں رہتا ہے دراصل وہ تصوف کو بدنام کرتا ہے اسکو واقعی صوفی نہیں سمجھنا چاہئے اصولاً ایسا صوفی جو بہت جلد شہرت حاصل کرلے اسکی شہرت بہت دن برقرار نہیں رہ سکتی اور اسکا نام جلد ہی فراموش کردیا جاتا ہے۔ درویشی اور ولایت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ درویش کو بالکل گمنامی اور عزلت میں زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اگرچہ وہ خود اپنے آخری دور میں بہت

ع۱ سرور الصدور قلمی ۲۹ ع۲ فوائد الفواد ص ۳ سیر الاولیا ص ۱۹۶

ع۳

مشہور ہو چکے تھے اور انکے عقیدتمندوں کا دائرہ نہایت وسیع ہو چکا تھا پھر بھی وہ اپنی طرف سے عزلت اور تنہائی کو ہی پسند کرتے تھے وہ تمام عمر گاؤں ہی میں رہے گاؤں میں انکے پاس صرف ایک بیگھا[1] زمین تھی جس میں کاشت کرکے سال بھر گزارہ کرتے اور ایک گائے پال رکھی تھی جسکا دودھ استعمال کرتے اور اسی پر قناعت کرتے۔ انکی زندگی بے حد سادہ تھی ایک چادر کمر سے بندھی رہتی اور دوسری جسم پر ڈال لیتے[2] انکی بیوی کا یہ عالم تھا کہ غربت کی وجہ سے سر پر دوپٹہ بھی نہ ہوتا پیراہن کا دامن سر پر ڈال لیا کرتی تھیں[3] صاحب سیرالعارفین نے انکی زوجہ کا نام خدیجہ لکھا ہے جو زہد و ورع میں رابعۂ عصر تھیں ایک ہفتہ بعد نیم کے پتے سے افطار کرتی تھیں[4] حمیدالدین ناگوری خود اپنے جانشین اور پوتے فریدالدین محمود سے اپنی بیوی کے متعلق کہتے ہیں

"دراں وقت کہ من نوشتہ شدم و کار خیر من کردند اگر ہیچ عورتی دراں
وقت بجز از جدہ شما بودی کار خیر من باد شدی"[5]

لیکن اس غریبی میں بھی استغنا کی ایک عجب شان تھی دنیاوی جاہ و حشم کا ذکر انکی مجلس میں کسی نے نہیں سنا خواجہ فریدالدین محمود اپنے ملفوظ میں فرماتے ہیں:

۱۔ سیرالاولیا ص ۱۶۷ صاحب سیرالعارفین نے دس جریب زمین لکھا ہے جو دریا کے کنارے تھی سیرالعارفین قلمی ۱۱

۲۔ سرور الصدور قلمی ۶ ۳۔ سیرالاولیا ص ۱۶۷-۱۶۶

۴۔ سیرالعارفین قلمی ۱۲ صاحب مراۃ الاسرار نے سبزی سے افطار کا لکھا ہے مراۃ الاسرار قلمی ۱۸۵

۵۔ سرور الصدور قلمی ۴

"ما بخدمت شیخ بزرگ می بودیم ہیچ روزی و ساعتی در محفل ایشان یاد ندارم که ذکر دنیا رفتی و ہرگز نا شنیدیم و کسی را نیز مجال آن نبودی که در خدمت ایشان ذکر دنیا کردی" - ع۱

اگرچہ چشتی مشائخ فتوح اور نذرانہ قبول کرنے سے انکار نہیں کرتے تھے لیکن شیخ حمیدالدین کا رویہ اس معاملے میں برعکس تھا وہ یہ کہکر نذرانہ اور فتوح لوٹا دیا کرتے تھے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے رزق اور روزی کو کسب کرنا سب سے بڑا عمل صالح سمجھتا ہوں۔ ناگور کے حاکم کو جب آپ کی حالت کی خبر ہوئی تو اسی وقت آپ کی خدمت میں کچھ نقد بھجوا دیا اور التماس کیا کہ وہ اگر قبول کریں تو کچھ اور زمین اور اس کے لئے بیج پیش کروں تاکہ فراغت سے گذر ہو جب آپ کے پاس نقدی اور پیشکش پہونچی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ ہمارے خواجگان میں سے کسی نے ایسی چیز قبول نہیں کی ہے ایک بیگھا زمین جو میرے پاس ہے وہ میرے لئے کافی ہے حاکم ناگور نے جب اس بات کی اطلاع بادشاہ وقت کو دی تو بادشاہ نے پانچسو تنکہ اور ایک گاؤں کا فرمان حاکم ناگور کے پاس بھیجا اور لکھا کہ میری طرف سے عجز و انکساری سے پیش کرنا تاکہ وہ قبول کرلیں جب حاکم ناگور یہ فرمان اور روپیہ لیکر آپ کے پاس پہونچا تو آپ نے کچھ نہ کہا اور اپنی زوجہ کے پاس اسکی آزمائش کے لئے پہونچے اور کہا کہ بادشاہ نے ہمارے لئے پانچ سو تنکے اور ایک گاؤں کا فرمان بھیجا ہے اگر تم کہو تو اسے قبول کرلیں اس زاہدہ کی اس وقت یہ

ع۱ سرور الصدور قلمی ۱۷

حالت تھی کہ سر پر دوپٹہ بھی نہ تھا پیراہن کا دامن سر پر ڈالے ہوئی تھیں پھر بھی جواب دیا

"ای خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندین سالہ خود را باطل کنی" تم مطمئن رہو میں

نے دو سیر سوت کاتا ہے جس سے آپ کے کپڑے اور میرا دوپٹہ تیار ہو جائیگا۔ شیخ اس بات

سے بہت خوش ہوئے اور یہ چیزیں واپس لیجا کر حاکم ناگور کے حوالے کر دیں۔ ع[1]

ایک بار ایک ترک آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا چاہتا تھا جب اس

بات کی اطلاع آپ کو ہوئی تو آپ نے اپنی زوجہ سے کہا کہ تم جانتی ہو کہ میں نے دنیا کو پورے طور

پر ترک کر دیا ہے یہ ترک کچھ لانا چاہتا ہے لوں یا نہیں پھر اسکے بعد یہ نہ کہنا کہ کیوں نہیں لیا آپکی

زوجہ نے جواب دیا بابا تم اسی طرح اپنے ترک پر قائم رہو خدا ہمیں مار نہ ڈالیگا۔ ع[2]

لیکن سرور الصدور کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بحالت مجبوری کبھی کبھی آپ فتوح لے بھی

لیا کرتے تھے ایک بار فرماتے ہیں: "اگر میں یہ جان لوں کہ لانے والے کا دل نہ لینے سے رنجیدہ

نہ ہوگا تو میں کچھ بھی قبول نہ کروں صرف اس وجہ سے قبول کرتا ہوں کہ وہ آزردہ نہ ہوں۔ ع[3]

شیخ سبزی خور تھے گوشت سے احتراز برتتے تھے تقشّف کے طور پر

اپنے مریدوں کے سامنے سبزی کی غذا کے فضائل بھی بیان کرتے تھے جسکا مطلب بالواسطہ طور

سے یہی ہوتا تھا کہ مریدوں کو سادہ غذا کی تعلیم دیں اور پر تکلف غذاؤں سے پرہیز کرنا

ع۱ سیر الاولیاء ص ۱۶۷ ع۲ سرور الصدور قلمی ۴۳

ع۳ سرور الصدور قلمی ۳ نیز ۱۳

سکھائیں ۔

سرور الصدور میں ہے کہ " فرمودند اگر فرائض بحث کنند نیکو باشد که اول علمے که مقصود شود علم فرائض باشد و پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمودست که تعلّموا الفرائض و علّموها [1]"

انکی تعلیمات کا ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ واقعی صوفی کو جہاں تک ممکن ہو کرامات سے پرہیز کرنا چاہئے کرامات کا اظہار ایک قسم کا تفاخر ہے اس قسم کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جو تصوف کو دکانداری اور نفع کا سودا سمجھتے ہیں حقیقی عارف اور صوفی اپنے کمالات کے اظہار میں انتہائی احتیاط بلکہ اخفاء سے کام لیتا ہے ۔

شیخ حمیدالدین ناگوری کو عربی فارسی اور ہندی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا [2] عموماً ہندی میں گفتگو کرتے تھے ناگور کے دیہات میں رہنے والا یہ کاشتکار ایک جید عالم بھی تھا علوم دینی پر انکی نظر کی گہرائی کا اندازہ انکی تصانیف کے بغور مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے ۔

شیخ حمیدالدین ناگوری نے اپنے معاصر شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی سے اکثر فقر و درویشی کے مسئلہ پر خط وکتابت کی [3] انکے مکاتیب سے چشتیہ اور سہروردیہ عقائد کا نقشہ صاف واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے سلسلہ سہروردیہ میں مال و دولت کے جمع کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا نقد و جنس و غلہ انکی خانقاہوں میں کثرت سے موجود رہتا تھا جن کو وہ خلق خدا کی خدمت میں خرچ بھی

---

[1] سرور الصدور قلمی ۵۴
[2]
[3] سفینۃ الاولیاء ص ۱۶۰ نیز مراۃ الاسرار قلمی ۱۸۵

کرتے رہتے تھے اسکے برخلاف چشتی صوفیہ نہایت افلاس اور تہی دستی کی زندگی گذارتے تھے اور
کسب زر کو اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے شیخ بہاءالدین زکریا نے اس مسئلہ پر جو جوابات
شیخ ناگوری کو دیئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان جوابات نے شیخ ناگوری کو مطمئن نہیں کیا
اور ان دونوں سلسلوں کا اختلاف اس مسئلہ پر جوں کا توں باقی رہا یہ مکاتیب دونوں
سلسلوں کے عقائد کی تشریحات کے بارے میں ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں
بزرگوں کے درمیان خط وکتابت ایک سوداگر کے ذریعہ ہوتی تھی جو ناگور سے تل لیجاکر ملتان میں
بیچتا تھا اور وہاں سے روئی لاکر ناگور میں فروخت کرتا تھا سیر الاولیاء[1] میں اسکی تفصیلات موجود ہیں
غالبًا دینی مسائل میں انکی بالغ نظری کا ہی خیال کرتے ہوئے سلطان شمس الدین التمش نے
انہیں اس محضر میں بلایا جو جلال الدین تبریزی پر لگائی گئی ایک تہمت کی تحقیق کے سلسلے
میں منعقد کیا گیا تھا اس مجلس میں بہاءالدین زکریا بھی موجود تھے ان دونوں کے درمیان اس
مجلس میں بھی دولت رکھنے کے سلسلے میں بات ہوئی اور یہاں بھی وہ بہاءالدین زکریا کی باتوں سے
مطمئن نہیں ہوئے ۔

شیخ حمیدالدین ناگوری کی ابتدائی تربیت علوم رسمی کے میدان میں ہوئی تھی وہ
فقہ اور شریعت کے زبردست رمز شناس تھے وہ یہاں بھی سہروردی مسلک سے ذرا علحدہ ہے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۶۸

ہوئے نظر آتے ہیں۔ سہروردی اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ دراصل شریعت اور طریقت میں کوئی
فرق نہیں ہے شیخ ناگوری کا کہنا ہے کہ دونوں میں فرق ضرور ہے اور دونوں ایک دوسرے سے علحدہ ہیں
البتہ دونوں کا رشتہ وہی ہے جو جسم اور جان کا ہوتا ہے شیخ ناگوری نے بڑی طویل عمر پاکر
۶۷۳/۱۲۷۴ع[1] میں وفات پائی اور ناگور میں ہی دفن کئے گئے[2] آپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنا جانشین
اپنے پوتے شیخ فرید الدین محمود کو بنا دیا تھا کیونکہ آپ کے لڑکے شیخ عزیز الدین آپ کی زندگی ہی میں ۶۶۲/۱۲۶۴
میں وفات پا چکے تھے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ماوراءالنہر میں واقع قصبہ اوش میں

میں پیدا ہوئے ابھی وہ صرف ڈیڑھ سال کی عمر کے تھے کہ انکے والد کمال الدین احمد موسیٰ

رحلت کر گئے[1] والد کی وفات کے بعد آپ نے والدہ ماجدہ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، پانچ

سال کی عمر میں تحصیل علم کی غرض سے شیخ ابوحفص اوشی کے پاس مکتب میں داخل کئے گئے[2]

شیخ ابوحفص اوشی نے آپ کو علوم ظاہری کے علاوہ علوم باطنی اور سلوک کے آداب وطریق

کی بھی تعلیم دی اس طرح آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ ریاضت و مجاہدہ میں بھی مشغول رہے، تعلیم

سے فراغت کے بعد بیس سال کی عمر میں[3] آپ بغداد پہونچے اور وہاں امام ابواللیث سمرقندی کی

مسجد میں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ اوحدالدین کرمانی اور شیخ برہان الدین چشتی وغیرہ کی موجودگی میں

خواجہ معین الدین چشتی سے شرف بیعت حاصل کیا[4] اسرارالاولیاء میں ہے کہ آپ بیس سال تک اپنے

مرشد کی خدمت میں رہے[5] آپ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ دن اور رات میں دو سو پچاس رکعت نماز

ادا کرتے تھے[6] اور ہر رات بلا ناغہ تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھکر سرور کائنات صلعم کے دربار میں

بطور ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک موقع پر تین دنوں تک یہ سلسلہ ناغہ ہو گیا تو حضور صلعم نے آپ کے ایک مرید

رئیس احمد کے ذریعہ تین راتوں سے اس تحفہ کے نہ پہونچنے کی شکایت کی۔ تو اس وقت آپ نے

---

[1] سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۱ [2] صاحب خیرالمجالس اور تاریخ فرشتہ نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے جسکا لب لباب یہ ہے کہ آپ کو شیخ ابوحفص اوشی کی خدمت میں خواجہ خضر لیکر پہونچے اور نہایت مہربانی کے ساتھ آپ کو پڑھانے کی تلقین کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خیرالمجالس ص ۱۰۷-۸ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۸ [3] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۸ ...

اس عورت کو بلاکر اسکا حق مہر ادا کر دیا اور اسے رخصت کر دیا جس سے صرف تین روز قبل

آپ کی شادی ہوئی تھی بات صرف اتنی تھی کہ وہ شادی کی مصروفیات کی وجہ سے ان تین دنوں میں

درود کا تحفہ رسالت مآب کی خدمت میں نہ بھیج سکے تھے[1] - اسکے بعد بغداد کے لئے روانہ ہوئے -

صاحب سیرالاولیاء نے اوش کے دوران قیام خواجہ خضر سے ملاقات کا ایک واقعہ بھی لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ

شہر کے کنارے ایک غیر آباد مسجد تھی اس میں ایک مینار تھا لیکن اسکو ہفت مینار کہتے تھے

قطب الدین بختیار کاکی کو ایک درویش نے دعاء بتائی تھی جسکو ہفت دعاد کہتے تھے اور کہا گیا تھا

کہ جو بھی اس مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد منارہ کے اوپر جاکر یہ دعاد پڑھیگا اسکی ملاقات

خواجہ خضر سے ہوگی. چنانچہ آپنے خواجہ خضر سے ملاقات کے شوق میں اس مسجد میں جاکر نماز اور دعاد

پڑھی آپ کی ملاقات خواجہ خضر سے تو ہوگئی لیکن نماز کا وقت ہوجانے کی وجہ سے ان سے گفتگو نہ

کرسکے[2] - بغداد پہونچکر وہاں شیخ شہاب الدین سہروردی اور دیگر بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہوتے

رہے اور وہیں انکی ملاقات قاضی حمیدالدین ناگوری سے بھی ہوئی اس ملاقات کے بعد ان دونوں کے

درمیان اتنا گہرا تعلق قائم ہوا کہ آخر آخر تک جدا نہ ہوئے اور انکے ساتھ ہی مختلف مقامات کی سیر کی

اور ان مقامات پر وہاں کے درویشوں سے ملاقات کی تفصیلات فوائدالسالکین، اسرارالاولیاء اور

---

[1] سیرالاولیا ص ۵۸   [5] اسرارالاولیا ص ۲۱   [6] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۷۸

[1] سیرالعارفین قلمی ۴۱ - ۴۲

[2] اس سلسلے کی تفصیلات فوائدالفواد ص   سیرالاولیاء ص ۶۱   سیرالعارفین قلمی ۴۸ وغیرہ میں بھی موجود ہے

راحت القلوب میں ملتی ہے غرض آپ مختلف مقامات کی سیاحت سے واپسی پر جب بغداد پہونچے

تو وہاں آپ کو اس بات کی اطلاع ملی کہ آپ کے مرشد خواجہ معین الدین چشتی خراسان سے ہندوستان کی

طرف روانہ ہو چکے ہیں مرشد سے شوق ملاقات میں وہ بغداد سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے اس سفر میں آپ

کے ساتھ جلال الدین تبریزی بھی ساتھ ہو گئے[1] آپ پہلے ملتان پہونچے اور وہاں کے مشہور بزرگ

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ملے، شیخ بہاء الدین زکریا آپ کے کمال محبت اور شفقت سے پیش آئے اور آپ

کو چند دنوں کے لئے اپنے پاس روک لیا انہیں دنوں مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا تھا[2] یہ حملہ بڑا سخت

تھا ناصرالدین قباچہ جو حاکم ملتان تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے اس بلا کے دور کرنے

کی درخواست کی آپ نے قباچہ کو ایک تیر دیا اور فرمایا کہ وہ اس تیر کو نماز مغرب کے وقت قلعہ کی برج

پر جاکر مغلوں کے لشکر کی جانب پھینکے، قباچہ نے آپ کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اسی رات اسے

اس فتنہ سے نجات مل گئی اور مغل فرار ہو گئے[3] اس واقعہ کے بعد قباچہ آپ کا معتقد ہو گیا اور

اس نے اصرار کیا کہ آپ کچھ عرصہ تک اس مقام پر قیام کریں لیکن آپ اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور

فرمایا کہ یہ جگہ شیخ بہاء الدین زکریا کے ذمے ہے اور ہمیشہ انکی پناہ میں رہیگی[4] ملتان میں چند دنوں

قیام کے بعد آپ دہلی کی جانب روانہ ہو گئے جب آپ کے دہلی آنے کی اطلاع سلطان شمس الدین التمش

---

[1] سیر العارفین قلمی ۲۴
[2] مغلوں نے ملتان پر ۶۲۱ھ/۱۲۲۴ میں حملہ کیا تھا طبقات اکبری ص ۵۴
[3] سیر الاولیا ص ۶۰ نیز سیر العارفین قلمی ۲۴ [4] سیر العارفین قلمی ۲۴

کو ملی تو اس نے شہر سے نکل کر راستہ میں آپکا نہایت شاندار استقبال کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ آپ اندرون شہر دہلی میں رہیں لیکن آپ نے شہر میں جانا پسند نہیں کیا اور شہر سے باہر ایک مقام کیلوکھری کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا اور وہیں رہنے لگے سلطان التمش کو آپ سے غیر معمولی عقیدت پیدا ہو چکی تھی اس وجہ سے ہفتہ میں دو بار[1] پابندی سے آپ کی خدمت میں آنا اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا[2] قاضی حمید الدین ناگوری جو آپ سے پہلے ہی ہندوستان پہونچ چکے تھے اور شیخ جمال الدین محمد بسطامی جو شیخ الاسلام دہلی تھے آپ کی خدمت میں رہنے لگے وہیں سے آپ نے خواجہ معین الدین چشتی کے پاس انکی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے جواب دیا کہ قرب روحانی کے بعد مکانی کوئی چیز نہیں تم دہلی میں ہی رہو[3] ۔ شہر دہلی میں قیام کے سلسلے میں سلطان التمش کا اصرار بڑھتا ہی رہا آخر آپ نے سلطان کے شدید اصرار پر مجبور ہوکر شہر دہلی میں ملک اعزالدین کی مسجد کے قریب سکونت اختیار کر لی اور وہاں پہونچکر لوگ آپ سے استفادہ کرنے لگے[4] پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ سلطان التمش خواجہ صاحب کا مرید ہو گیا تھا[5] قطب الدین بختیار کاکی نے سلطان التمش کو نصیحت بھی کی تھی کہ :

" ای والی دہلی باید کہ با غریبان و فقیران و درویشان و مسکینان نیکو باشی

---

[1] ثمرۃ الانوار میں تحریر ہے نے ہفتہ میں ایک بار خواجہ کی زیارت کے لئے انکے پاس آنا لکھا ہے ثمرۃ الانوار تحریریہ قلمی ۲۰۰

[2] سیر العارفین قلمی ۱۴   [3] ثمرۃ الانوار تحریریہ قلمی ۲۰۰

[4] سیر العارفین قلمی ۱۴   [5] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۱۶

و با خلق نیکوئی کنی و رعیت پرور باشی ہر کہ با رعیت رعایت کند و با خلق نیکوئی کند خدای تعالی او را نگاہدارد و جملہ اعداد او دوست دارند" [1]

شیخ الاسلام جمال الدین محمد بسطامی کی وفات کے بعد سلطان نے دہلی کے شیخ الاسلام کے عہدہ پر آپ کا تقرر کرنا چاہا لیکن آپ نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کے انکار کے بعد ہی شیخ نجم الدین صغری [2] دہلی کے شیخ الاسلام بنائے گئے۔ [3] شہر دہلی میں قیام کے بعد آپکی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا خاص و عام عقیدتمند ہونے لگے یہ بات نجم الدین صغری کو پسند نہ آئی اور انکی مقبولیت سے اسے ایک قسم کا رشک و حسد ہونے لگا اور خواجہ معین الدین چشتی کے اجمیر سے دہلی آنے پر وہ واقعہ پیش آیا جسکا ذکر خواجہ معین الدین چشتی کے حالات کی ضمن میں ہو چکا ہے۔ [4]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خدا کی یاد اور مشاہدہ ذات میں اس قدر مستغرق رہتے کہ اپنے اور غیر کے وجود کی بھی خبر نہ رکھتے جب کوئی شخص انکے پاس زیارت کے لئے آتا تو اسے تھوڑی دیر تک کھڑا رہنا پڑتا تب کہیں جاکر وہ ہوش میں آتے اور اسکی طرف متوجہ ہوتے۔ [5] انہوں نے آخری عمر میں ازدواجی زندگی اختیار کی تھی اسکے باوجود یاد حق میں مستغرق رہنے کی وجہ سے انہیں ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کی خبر تک نہ ہوتی، فوائد الفواد میں ہے کہ انکے چھوٹے صاحبزادے وفات پا گئے آپ اسے دفن کرکے جب گھر واپس آئے تو بیوی کی گریہ و زاری کی آواز سنی تو

---

[1] رسالہ خانوادہ چشت بحوالہ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۱۱۶ [2] آپ خواجہ عثمان ہارونی کے مرید اور معین الدین چشتی کے دوست تھے [3] سیر العارفین قلمی ۴۴ [4] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیر العارفین قلمی ۵۴-۵۶
[5] اخبار الاخیار میں ہے "نہایت استغراق داشت در یاد مولی چون کسے بزیارت آمدے زمانے بایستے تا بخود باز آمدے آنگاہ ...

ہاتھ ملنے لگے اور شیخ بدرالدین سے اس تأسف کی وجہ دریافت کی، انکے جواب پر آپ نے فرمایا کہ مجھے اب دھیان آرہا ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کی بقا اور زندگی کے لئے کیوں دعاء نہ کی[1] اگر میں اسکی زندگی کے لئے دعاء کرتا تو وہ بچ جاتا[2] - فوائد الفواد میں ہے کہ قطب الدین بختیار کاکی نے آخری عمر میں قرآن مجید حفظ کیا[3] اور ہر روز دو بار قرآن شریف ختم کر لیتے تھے[4] عبادت الٰہی میں انکی مشغولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ سونا بالکل ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ کبھی بستر نہیں بچھاتے تھے ابتدائی زمانے میں جب نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو کچھ دیر سو بھی لیتے تھے لیکن آخری عمر میں اسے بھی ترک کر دیا اور فرماتے اگر میں کبھی کسی وقت سو جاتا ہوں تو تکلیف ہوتی ہے[5] کسی سے کوئی چیز قبول نہ کرتے خاص طور سے بادشاہ وقت اور حاکم سے - ایک بار ملک اختیار الدین ایبک (شاہی حاجب) نے کچھ نقد رقم پیش کی آپ نے اسے قبول نہیں کیا اور اس بورے کو اٹھاکر دکھایا جس پر خود بیٹھے تھے بورے کے نیچے سونے کی نہر بہہ رہی تھی[6]

ایک بار سلطان التمش کا وزیر چند گاؤں کا فرمان لیکر خدمت میں حاضر ہوا آپنے فرمایا کہ اگر ہمارے خواجگان میں سے کسی نے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی قبول کر لیتے اگر ہم اسے قبول کرلیں تو اپنے خواجگان کو کیا منھ دکھائیں گے[7] اسرار الاولیاء میں

١- فوائد الفواد ص ٦٢ — ٢- سیر الاولیاء ص ٥٩ — ٣- فوائد الفواد ص ١٨
٤- سیر العارفین قلمی ۹الف — ٥- سیر الاولیاء ص ٥٩ — ٦- سیر الاولیاء ص ٦٣
٧- راحت القلوب ص ٣٢

ایک مرتبہ سلطان التمش نے دینار زر آپ کی خدمت میں بھیجا تو آپ نے اسے واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میں تمہیں دوست سمجھتا تھا لیکن تم دشمن ہو جس چیز کو خدا نے دشمن قرار دیا ہے اسے تو دوست خدا کے پاس بھیجتا ہے۔ یہ کیا دوستی ہے اسکے طلبگار بہت سے ہیں انکو دیدو۔[۱] اکثر آپ کے گھر میں فاقہ رہتا جب کئی فاقے ہو جاتے تو شرف الدین نامی ایک بقال کی بیوی سے جو آپ کے گھر آیا جایا کرتی تھی آپ کی زوجہ قرض لے لیتیں جس سے اپنے بچوں اور متعلقین کے کھانے کا انتظام کرتیں جب کہیں سے کچھ آجاتا تو اسکا قرض بھی ادا کر دیتیں ایک روز کسی وجہ سے اس عورت نے کہا کہ اگر میں تمہیں قرض نہ دوں تو تمہاری حالت مرنے کے قریب پہونچ جائے۔ آپ کی زوجہ کو اس بات سے بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے خواجہ قطب الدین سے ساری باتیں بتائیں خواجہ صاحب نے قرض لینے سے منع کرتے ہوئے اور ایک طاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب بھی تمہیں ضرورت ہو اس طاق سے جس قدر روٹی کی ضرورت ہو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہکر نکال لیا کرو چنانچہ وہ ضرورت کے وقت ایسا ہی کرتیں[۲] اس مفلسی اور فقر و فاقہ کے باوجود لنگرخانے میں جو کچھ بھی ہوتا اسے فوراً تقسیم کرا دیتے۔ اگر کوئی چیز نہ ہوتی تو ملازم سے فرماتے کہ آنے والوں کو پانی ہی پلا دو[۳] آپ کی تبلیغ یا کرامت سے متاثر ہو کر بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس سلسلے میں

۱؎ اسرار الاولیا ص ۲۷ ۲؎ سیر العارفین قلمی ۷۔ ۸

۳؎ راحت القلوب ص ۳۲

اسرار الاولیاء میں مذکور ایک واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ سلوک کے مرتبے کے متعلق بتا رہے تھے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ کامل ہو گیا آپ نے فرمایا جب وہ مردہ پر دم کرے تو حکم خداوندی سے وہ مردہ زندہ ہو جائے اسی دوران ایک عورت روتی ہوئی آپ کے پاس پہونچی اور کہا کہ بادشاہ وقت نے میرے لڑکے کو بے قصور پھانسی دیدی ہے آپ اسی وقت اس عورت کے ساتھ روانہ ہو گئے اور جائے وقوع پر پہونچ کر فرمایا: اے خدا اگر اس لڑکے کو بادشاہ نے بے قصور پھانسی دیدی ہے تو تو اسے زندہ کر دے آپ نے یہ فرمایا تھا کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا اور یہ دیکھ کر جائے وقوع پر موجود سارے ہندو مسلمان ہو گئے۔[1] انکے لقب کاکی کے سلسلے میں کئی روایتیں ہیں انوار العارفین میں ہے کہ ایک مرتبہ شمس الدین التتمش نے آپ سے طعام غیب کی خواہش کی تو آپ نے اپنے آستین سے گرم روٹیاں نکالکر اسے دیں۔[2] اسی کتاب میں ایک دوسرا واقعہ بھی نقل کیا گیا ہے کہتے ہیں کہ ایک بار نظام الدین اولیاء سے پوچھا گیا کہ کاکی کیوں کہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایک دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اصحاب کے ساتھ حوض شمسی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ کیا

۱۔ اسرار الاولیاء ص ۸۸-۸۹

۲۔ انوار العارفین ص ۳۴۳

اچھا ہوتا کہ اس سرد موسم میں گرم روٹی ہم لوگوں کو ملتی خواجہ نے حوض کے اندر ہاتھ ڈالا اور گرم روٹیاں نکالیں جسے تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھائیں ہے[1] اس سلسلے میں وہ واقعہ بھی مشہور ہے جس میں انہوں نے اپنی زوجہ کو ضرورت کے مطابق طاق سے روٹی نکالنے کے لئے فرمایا تھا جسکا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی معین الدین چشتی کی وفات سے قبل انکی زیارت کے لئے اجمیر تشریف لے گئے۔ اسی موقع سے خواجہ معین الدین چشتی نے انکو خلافت اور سجادۂ خواجگان، دستار اور عصا وغیرہ سے نوازا اور کہا کہ یہ رسول اللہ کی وہ امانت تھی جو خواجگان چشت سے مجھے ملی تھی میں نے تم کو سونپی تم اسکا ویسا ہی حق ادا کرو جیسے ہمارے خواجگان ادا کرتے تھے[2]

آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی مختلف جگہوں پر مجالس سماع منعقد ہوا کرتیں جس میں آپ بھی شریک ہوا کرتے عموماً سماع میں آپ پر وجد اور سرمستی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور عالم تحیر میں چلے جاتے وفات کا سانحہ بھی اسی طرح پیش آیا کہ شیخ علی سجزی کی خانقاہ میں مجلس سماع منعقد کی گئی تھی اس وقت خواجہ قطب الدین بھی موجود تھے قوال حضرت شیخ احمد جام کی غزل دلکش انداز د

---

[1] انوار العارفین ص ۳ لم ۳ نیز کرامات اولیا قلمی ۲۱۲ [2] اخبار الاخیار ص ۳۲

صاحب روضۂ اقطاب لکھتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی کو خواب میں چالیس دنوں تک متواتر رسول خدا صلعم کی زیارت [illegible] روضۂ اقطاب قلمی ۲۹

آواز میں گا رہا تھا جب اس شعر پر پہونچا:

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زمان از غیب جانے دیگر است

اسے سنتے ہی آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور بالکل از خود رفتہ ہو گئے۔ شیخ بدرالدین غزنوی

اور قاضی حمیدالدین ناگوری نے شیخ علی سجزی کی خانقاہ سے اپنے مکان پر لائے اس وقت بھی

عالم تحیر میں تھے اور بار بار فرماتے کہ یہی شعر پڑھو چنانچہ پڑھا جاتا، نماز کا وقت ہوتا تو

ہوش میں آکر نماز ادا فرماتے اور پھر وہی شعر سنکر عالم تحیر میں چلے جاتے چار دن اور

چار رات اسی عالم میں رہے اور پانچویں رات کو انتقال فرما گئے [1] تاریخ وفات کے سلسلے

میں سیرالاولیاء میں ہے کہ سلطان شمس الدین التمش، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور مولانا قطب الدین کاشانی

کا انتقال ایک ہی سال میں ہوا۔ نظام الدین اولیاء نے یاد کرکے یہ تاریخ بتائی۔

بسال ششصد و سی و سہ بود که از ہجرت ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء   نماند شاہجہاں شمس دین عالمگیر [2]

وفات سے قبل ایک مرتبہ نماز عید پڑھکر عیدگاہ سے آرہے تھے کہ راستے میں ایک جگہ رک کر

کچھ سوچنے لگے۔ لوگوں کے پوچھنے پر فرمایا کہ اس زمین سے عشق کی بو آرہی ہے مالک زمین

کو بلواکر اس سے قیمتاً زمین خرید لی اور فرمایا کہ وفات کے بعد مجھے اسی جگہ دفن کیا

جائے [3] چنانچہ اسی زمین پر آپ دفن کئے گئے۔ آپ کی نماز جنازہ شمس الدین التمش

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۸۴ [2] سیرالاولیاء ص ۶۶ [3] فوائد الفواد ص ۲۵۰

نے پڑھائی صاحب سیر الاقطاب نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ خواجہ کی وفات کے بعد
مولانا سعید نے کہا کہ خواجہ نے وصیت کی ہے کہ میری نماز جنازہ کی امامت وہی
شخص کریگا جس نے حرام کاری نہ کی ہو عصر کی سنتیں قضا نہ کی ہوں اور ہمیشہ
تکبیر اولی سے نماز جماعت میں شریک رہا ہو جب حاضرین میں سے کسی بھی شخص نے
اپنے اندر یہ صفت نہ پائی تو کچھ دیر خاموش رہنے اور انتظار کرنے کے بعد سلطان
شمس الدین التمش آگے بڑھا اور اس نے نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل کی ۔[1]
انتقال سے قبل آپ نے اپنا جامعہ عصا مصلا اور لکڑی کی نعلین شیخ فرید الدین گنجشکر
کو دینے کی وصیت کی[2] چنانچہ وہی آپ کے جانشین ہوئے ۔

۱۔ سیر الاقطاب ص ۱۶۰

۲۔ فوائد الفواد ص ۱۸۷

شیخ فریدالدین مسعود گنجشکر

آپ کا نام مسعود اور لقب فریدالدین تھا لیکن مشہور گنجشکر کے لقب سے ہوئے آپ کے والد کا نام جمال الدین سلیمان تھا[۱] انکا وطن کابل تھا جہاں سے سلطان شہاب الدین غوری کے عہد میں حملہ چنگیزی کی وجہ سے ہجرت کرکے لاہور آئے اور پھر وہاں سے ملتان آکر ملتان کے ایک قصبہ کھوتوال میں سکونت پذیر ہو گئے۔ کھوتوال میں آپ قاضی کے عہدہ پر فائز کئے گئے یہیں آپ کی شادی وجیہ الدین سمرقندی کی صاحبزادی سے ہوئی[۲] اور اسی قصبہ میں فریدالدین مسعود ۵۷۷/۱۱۸۱ میں پیدا ہوئے[۳] آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کی نگرانی میں اسی قصبہ میں حاصل کی پھر مزید تعلیم کی غرض سے وہ ملتان کے سرائے حلوائی میں پہونچے ملتان میں وہ شیخ شہاب الدین زکریا ملتانی کی صحبت سے بھی فیضیاب ہوئے اور یہیں آپ کی ملاقات قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی ملتان میں انکا قیام مولانا منہاج الدین[۴] کی مسجد میں تھا اور ان سے کتاب نافع[۵] جو علم فقہ میں ہے پڑھتے تھے اور قرآن شریف بھی حفظ کرتے

۱۔ صاحب سفینۃ الاولیا نے مسعود بن عزیزالدین محمود لکھا ہے۔ سفینۃ الاولیا ص ۱۶۳

۲۔ سیرالعارفین قلمی ۵۵ ۳۔ سیرالاولیا ص ۱۱۰

۴۔ مولانا منہاج الدین ترمذی ثم ملتانی اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں سے تھے فقہ اور اصول فقہ میں غیر معمولی تجربہ رکھتے تھے اور ملتان میں ہی درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے نزہۃ الخواطر ۱ ص ۲۲۳

چونکہ فوائد الفواد کے مختلف بیانات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آپکی وفات ۹۳ سال کی عمر میں ۶۷۰/۱۲۷۱ میں ہوئی تو تاریخ پیدائش لازماً ۵۷۷/۱۱۸۱ ہوگی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۵۲-۵۲

۵۔ کتاب نافع فقہ حنفی کی کتاب ہے اور اسکے مصنف ابوالقاسم بن یوسف الحسینی ہیں۔

اور دن اور رات میں ایک قرآن ختم کرلیا کرتے تھے[1] ایک روز اسی مسجد میں کتاب نافع کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوش سے ملتان پہونچے جب وہ اس مسجد میں تشریف لے گئے تو فرید الدین مسعود نے انکا بڑا احترام کیا خواجہ قطب الدین نے تہنیت کی دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد فرید الدین مسعود کی طرف مخاطب ہوکر ان سے پوچھا کہ تم کیا پڑھ رہے ہو فرید الدین نے جواب دیا 'نافع' پھر فرمایا تم جانتے ہو کہ تمہیں اس نافع سے نفع ہوگا جواب دیا "نفع من از کیمیاء سعادت بخش شما خواہد شد"[2] اور وہیں آپ کے مرید ہوگئے اسی دوران بہاء الدین زکریا ملتانی بھی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات کی غرض سے وہاں پہونچے کچھ ہی دیر وہاں قیام کے بعد قطب الدین بختیار کاکی دہلی کے لئے روانہ ہوگئے[3] کچھ دیر تک فرید الدین مسعود بھی سفر دہلی میں انکے ساتھ رہے پھر قطب الدین بختیار کاکی نے آپ کو علوم ظاہری کی مزید تعلیم حاصل کرنے کی تاکید کی اور تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی تشریف لانے کو کہا[4] اپنے پیر سے مزید تعلیم کی ہدایت پاکر وہ ہندوستان سے باہر کے لئے روانہ ہوئے اور قندھار

۱۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۳   ۲۔ سیر الاولیا ص ۷۱-۷۲ نیز سیر العارفین، خیر المجالس میں ہے کہ اسکے بعد شیخ فرید الدین مسعود نے قطب الدین بختیار کاکی کے پاؤں پر گر پڑے (در پای افتاد) اور یہ بیت کہا۔

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد — وز لطف تو ہیچ بندہ نومید نشد

عونت بکدام ذرہ پیوست دمی — کاں ذرہ بہ از ہزاران خورشید   خیر المجالس ص ۲۲۰

۳۔ صاحب تاریخ فرشتہ نے کئی دنوں تک قطب الدین بختیار کاکی کا ملتان میں قیام کرنا اور فرید الدین کا ان سے فیض پانا لکھا ہے۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۳

۴۔ سیر العارفین قلمی ۵۹ سیر الاولیا میں ہے کہ فرید الدین گنج شکر قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ ہی دہلی کے لئے روانہ ہوگئے اور وہاں ہوکر مرید ہوگئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے لگے۔ سیر الاولیا ص ۷۱

سیوستان، غزنی، بدخشاں اور بغداد وغیرہ میں علوم ظاہری اور باطنی حاصل کرتے رہے اس سفر میں انکی ملاقات شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ سعد الدین حموی، خواجہ اجل سجزی، امام مرادی اور دیگر بزرگان کرام سے ہوئی ان لوگوں سے انہوں نے فیض بھی حاصل کیا۔ اس سفر کی تفصیلات اور ان بزرگان دین سے ملنے کے واقعات اسرار الاولیاء اور راحت القلوب میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں تقریباً پانچ سال تک مختلف مقامات کی سیاحت اور تکمیل تعلیم کے بعد آپ دہلی تشریف لائے اور دہلی میں غزنی دروازہ کے نزدیک ایک برج کے نیچے حجرہ بنواکر عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے لگے دو ہفتہ میں ایک مرتبہ آپ اپنے مرشد سے ملاقات کی غرض سے انکی خدمت میں حاضر ہوتے اور پھر واپس اپنے مقام کوتوال پر چلے جاتے جہاں آپ کے ساتھ شیخ بدر الدین غزنوی اور شیخ احمد نہروانی بھی مقیم ہو گئے تھے۔ جب خواجہ معین الدین چشتی قطب الدین بختیار کاکی سے ملاقات کی غرض سے اجمیر سے دہلی تشریف لائے تو خواجہ قطب الدین کے مریدوں میں سے ہر ایک نے ان سے حسب استعداد نعمت باطنی پائی خواجہ معین الدین نے قطب الدین بختیار کاکی سے پوچھا کہ تیرا کوئی مرید رہ گیا ہے جواب دیا مسعود نامی ایک فقیر چلہ میں بیٹھا ہے خواجہ معین الدین چشتی نے انہیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی پھر وہ دونوں فرید الدین مسعود کے حجرہ میں آئے فرید الدین مسعود سخت ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ

وہ انکے استقبال کے لئے اُٹھ بھی نہ سکے خواجہ معین الدین چشتی نے قطب الدین بختیار کاکی سے فرمایا کہ اس بیچارے کو کب تک مجاہدہ کی آنچ پر جلاؤگے آؤ ہم اور تم جو کچھ اسے دینا ہے عطا کردیں یہ کہکر انکا دایاں بازو خواجہ معین الدین چشتی نے اور بایاں خواجہ قطب الدین نے پکڑ کر اٹھایا پھر خواجہ معین الدین نے آسمان کی طرف رخ کرکے خدا سے دعا کی "یا جل جلالہٗ فرید را قبول کن و بمرتبہ درویشان اکمل برسان" آواز آئی "فرید را برگزیدم و فرید فرید ہر دو وحید عصر است" خواجہ معین الدین نے خلعت عنایت کی اور خواجہ قطب الدین نے دستار اور مثال عنایت کرنے کے بعد اپنا خلیفہ نامزد کیا پھر خواجہ معین الدین نے فرمایا "بابا قطب الدین شاہبازے عظیم در دام آوردی کہ بجز سدرۃ المنتہیٰ آشیانہ نمی گیرد"۔ [ع۱]

صاحب سیر العارفین نے فوائد الفواد کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں فرید الدین گنجشکر نے قطب الدین بختیار کاکی سے چلہ کھینچنے کی اجازت چاہی خواجہ قطب الدین نے فرمایا کہ اسکی ضرورت نہیں ہے کہ خلوت میں بیٹھو اور چلہ کرو اس کام سے بہت شہرت ہوگی میرے پیروں نے بھی ایسا نہیں کیا انکی جلوت میں ہی خلوت ہوتی تھی۔ [ع۲] اسکے باوجود یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے چلہ کشی کی۔ سیر الاولیا میں ہے کہ "فرید الدین گنجشکر

ع۱ سیر الاقطاب ص ۶۶-۱۶۵ سیر الاولیا میں بھی یہ روایت کچھ فرق سے موجود ہے ملاحظہ ہو سیر الاولیا ص ۸۲

ع۲ سیر العارفین قلمی ۶۷ سیر الاولیا ص ۷۸

نے قطب الدین بختیار کاکی سے مجاہدہ خواہش کی تو انہوں نے چلے[1] کے لئے فرمایا آپ نے تین دنوں
تک کچھ نہ کھایا تیسرے دن ایک شخص نے چند روٹی آپ کی خدمت میں پیش کی آپ نے اس روٹی
کو رزق غیب سمجھ کر اس سے افطار کر لیا۔ اسکے بعد آپکی نگاہ ایک کوے پر پڑی جو مردار کی
آنتیں لئے درخت پر بیٹھا تھا یہ دیکھ کر انہیں کراہت پیدا ہوئی اور معدہ نے سارا کھانا باہر نکال دیا
جب اپنے پیر کے پاس پہونچے تو اس واقعہ کا ذکر کیا خواجہ قطب الدین نے فرمایا کہ اے فرید تیسرے
دن تم نے ایک شرابی کا کھانا قبول کر کے اس سے افطار کیا تھا یہ خدا کی عنایت تھی کہ تمہارے
معدہ نے اسے قبول نہیں کیا پھر آپنے چلے کا روزہ رکھنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ غیب سے جو
تمہیں پہونچے اسی سے افطار کرو فریدالدین نے پھر چلے کا روزہ رکھ لیا تین دن اور گذر گئے چونکہ
چھ روز سے کچھ نہ کھایا تھا اس وجہ سے بیحد کمزوری پیدا ہوگئی افطار کے وقت بھی کھانا میسر
نہ ہوا۔ ایک پہر گذر جانے کے بعد جب بھوک ناقابل برداشت ہوگئی تو آپنے زمین کی طرف ہاتھ بڑھاکر
چند سنگریزے اٹھائے اور اسے منھ میں ڈال لیا وہ سنگریزے خدا کی قدرت سے شکر ہوگئے
خیال آیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مکر شیطانی ہو منھ سے شکر کو پھینک دیا اور یاد حق میں مشغول
ہوگئے۔ نصف رات گذرنے کے بعد بھوک کی شدت کی وجہ سے پھر سنگریزے اٹھاکر منھ میں ڈال لئے
وہ بھی شکر ہوگیا پھر وہی بات دل میں آئی اور آپ نے اسے پھینک دیا اور یاد حق میں

---

[1] چلے کے روزہ میں افطار صرف پانی سے کرتے ہیں اور یہ روزہ کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ ایک سال کا ہوتا ہے۔

مشغول ہوگئے رات کے آخری پہر میں پھر آپ نے سنگریزے افطار کر منہ میں ڈالے تو وہ شکر ہو گیا آپ کے دل میں خیال آیا کہ یہ تیسری بار ہے شاید یہ نعمت خداوندی ہے جو غیب سے مجھ تک پہونچی ہے اور جس کے لئے شیخ نے فرمایا تھا جب وہ اپنے پیر مرشد کی خدمت میں پہونچے تو انہوں نے فرمایا اچھا کیا کہ اس سے افطار کیا غیب سے جو بھی ملے وہ ٹھیک ہے جاؤ شکر کی طرح ہمیشہ شیریں رہوگے۔[1] اس واقعہ کے بعد سے آپ کو پیر شکر بار اور گنجشکر کہتے ہیں۔ گنجشکر کی وجہ تسمیہ سے متعلق جمالی دہلوی شیخ کے سجادہ نشین شیخ احمد سے دریافت کے بعد اپنی کتاب سیر العارفین میں طے کے روزہ کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن اس میں سنگریزے کا ذکر نہیں وہ کہتے ہیں کہ چھ دن گذر جانے کے بعد جب ساتویں دن آپ اپنے پیر کی خدمت میں روانہ ہوئے تو بارش کا موسم تھا کھڑاوں پہنے ہوئے تھے کمزوری کی وجہ سے پاؤں میں لرزش تھی راستہ میں پاؤں پھسل گیا جیسے ہی زمین پر گرے منھ کھل گیا اور کیچڑ منہ میں چلا گیا اور وہ کیچڑ شکر ہو گیا جب آپ قطب الدین بختیار کاکی کے پاس پہونچے تو انہوں نے فرمایا۔ "بابا فرید از گلے قدرے گل بدہان تو رسیدہ شکر گشت چہ عجب قادر علی الاطلاق وجود ترا گنج شکر گردانیدہ ہموارہ شیریں خواہد داشت"[2]

آپ کے گنجشکر کی وجہ تسمیہ سے متعلق دیگر روایتیں بھی شجرۃ الانوار مخزنہ[3] سیر الاقطاب[4]، جواہر فریدی[5]

---

[1] سیر الاولیا ص ۷۸-۷۷ انوار العارفین ص ۳۵۰ [2] سیر العارفین قلمی ۶۷ صاحب تاریخ فرشتہ نے بھی تاریخ حاجی محمد قندھاری کے حوالے سے یہی روایت نقل کی ہے تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۳۸۸ [3] شجرۃ الانوار مخزنہ قلمی ۲۳-۱۲۲
[4] سیر الاقطاب ص ۱۶۵ [5] جواہر فریدی ص ۲۵۲

اور خزینۃ الاصفیاء میں موجود ہے[۱]

شیخ فرید الدین گنجشکر نے ایک مرتبہ اپنے پیر کے حکم سے چلہ معکوس بھی کیا تھا جب آپ سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے اس چلہ کے کرنے کو فرمایا تو اس وقت تک اس چلہ کے متعلق آپ کو واقفیت نہ تھی چنانچہ آپنے شیخ بدر الدین غزنوی سے اس سلسلے میں دریافت کیا اسکے بعد آپ مناسب جگہ کی تلاش میں اچہ پہونچے اور وہاں ایک ایسی مسجد دریافت کرلی جس کے اندر کنواں اور اسکے قریب ہی ایک درخت موجود تھا اس مسجد کے موذن رشید مینائی کی مدد سے آپنے چالیس دن تک اس طرح عبادت کی کہ روزانہ رات کے وقت رسی کا ایک سرا درخت سے اور دوسرا اپنے پاؤں میں باندھکر اپنے آپ کو کنویں میں الٹا لٹکا دیتے اور نماز معکوس میں رات بھر مصروف رہتے صبح کے وقت رشید مینائی آکر آپ کو کنویں سے باہر نکالتے تھے[۲]

خواجہ فرید الدین گنجشکر ایک عرصہ تک دہلی میں رہے انکے ریاضت و مجاہدہ، خواجہ معین الدین چشتی سے فیضیاب ہونے اور خلافت پانے کے بعد بہت شہرت پھیل گئی وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتے اسکے باوجود انکے پاس عقیدتمندوں کا ایک ہجوم آنے لگا لوگوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے انکی عبادت و ریاضت میں بھی خلل پڑنے لگا۔

۱۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۲۹۳-۲۹۲

۲۔ سیر الاولیاء ص ۷۹-۷۸ اخبار الاخیار ص ۵۹

اس صورتحال میں آپ نے اپنے پیر و مرشد سے سفر کی اجازت چاہی خواجہ قطب الدین نے چشم پُر آب

سے آپ کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تم میری موت کے وقت موجود نہیں رہوگے

اسکے بعد پہونچوگے تمہاری امانت قاضی حمید الدین ناگوری کے حوالے کردی جائیگی آنے پر ان سے لے لینا۔[1]

اسکے بعد آپ ہانسی کے لئے روانہ ہوگئے آپ کے ہانسی جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد خواجہ قطب الدین

نے وفات پائی فرید الدین گنجشکر کو خواب میں اپنے پیر و مرشد کے وفات کی اطلاع ملی اور آپ

ہانسی سے دہلی کے لئے روانہ ہوگئے۔[2] قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے بعد چوتھے دن آپ دہلی

پہونچے قاضی حمید الدین ناگوری نے امانت آپ کے حوالے کردی خرقہ پہننے کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

کے مکان پر تشریف لے گئے تین[3] دن اس مکان میں قیام کرنے کے بعد جب باہر نکلے تو سرہنگا

نامی ایک شخص (جو ہانسی سے آیا تھا اور دو تین بار آپسے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوچکا تھا

لیکن دربانوں نے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی تھی) آیا اور آپ کے قدموں پر گر گیا

اور کہا کہ جب آپ ہانسی میں تھے تو میں آسانی سے آپ سے مل لیتا تھا لیکن اب آپ سے

ملنا مشکل ہوگیا ہے اس بات کا آپ پر بڑا اثر ہوا اور آپنے اسی وقت ہانسی کے لئے روانہ

ہونے کا ارادہ کرلیا جب اس بات کی اطلاع لوگوں کو ہوئی تو انہوں نے آپ کو ہانسی جانے

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۶۷ سیر الاولیا میں ہے کہ روانہ کرتے وقت مصلا اور عصا بھی عنایت کیا سیر الاولیا ص ۸۴

[2] صاحب سفینۃ الاولیا نے لکھا ہے کہ جب قطب الدین بختیار کاکی کا آخری وقت آپہونچا تو انہوں نے فرید الدین گنجشکر کو ہانسی سے بلوایا اور جانشینی کے فرائض انجام دینے کی وصیت کی۔ سفینۃ الاولیا ص ۶۵۔ ۱۶

[3] سیر الاولیا ص ۸۳ ۔ تاریخ فرشتہ نے ایک ہفتہ لکھا ہے ایک ہفتہ بعد جب آپ جمعہ کی نماز کے لئے باہر نکلے تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۴

منع کیا اور کہا کہ شیخ نے آپ کو یہ مقام عنایت فرمایا ہے آپ کیوں دوسری جگہ جاتے ہیں؟

آپ نے جواب میں فرمایا کہ میرے پیر نے جو نعمت مجھے عنایت کی ہے شہر میں بھی وہی ہے اور

بیابان میں بھی وہی ہے۔[۱] غرض آپ ہانسی کے لئے روانہ ہوگئے جب ہانسی پہونچے تو اسوقت

تک آپ کی شہرت اور زیادہ پھیل چکی تھی خلائق کا ازدہام زیارت کے لئے آپ کے پاس

آنے لگا جس سے عبادت و ریاضت میں کمی واقع ہونے لگی آپنے سوچا کہ اب مجھے ایسی جگہ قیام

کرنا چاہئے جہاں کوئی پریشان نہ کرے چنانچہ آپ ہانسی سے اجودھن کے لئے روانہ ہوگئے

اجودھن کا انتخاب آپنے اس وجہ سے کیا کہ وہ ایک خراب مقام تھا اور وہاں کے لوگ

زیادہ تر خراب طبع اور بد اعتقاد تھے یہاں دلجمعی کے ساتھ عبادت و ریاضت کے زیادہ

امکانات تھے چنانچہ آپنے اس ویران جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد قصبہ سے باہر ایک درخت

کے نیچے کمبل بچھایا اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہوگئے۔[۲] شروع شروع میں کسی شخص نے

آپ کی طرف توجہ نہیں کی آپنے اجودھن میں ہی شادی کی جس سے بچے بھی ہوئے پھر آپنے قصبہ کی

جامع مسجد کے پاس مکان بنوایا اور اکثر اوقات اسی مسجد میں عبادت میں مشغول رہنے لگے۔[۳]

لیکن یہاں بھی آپ کی شہرت جلد ہی پھیل گئی اور معتقدین اور خلائق کا ہجوم آپ کے پاس

ع۱ سیر الاولیاء ص ۸۳ خیر المجالس میں ہے کہ آپ خاموشی سے کسی کو کہے بغیر دہلی سے ہانسی کے لئے روانہ ہوگئے۔ خیر المجالس ص ۸۹

۲-۳ خیر المجالس ص ۸۹

آکر رہنے لگا۔ یہاں سے بھی آپ نے کسی دوسرے پرسکون مقام پر جانے کا ارادہ کیا لیکن مرشد کی طرف سے آپ کو یہیں ٹھہرنے کی ہدایت ملی[ع۱]

شیخ فریدالدین گنجشکر کے قیام اجودھن کے دوران ایک دن سلطان غیاث الدین بھی آپکی پابوسی کے لئے خدمت میں حاضر ہوا۔ اس دن خلائق کا ہجوم بھی بہت زیادہ تھا شیخ فریدالدین کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ہاتف غیبی نے آواز دی "ای شیخ تنگ مباش و بر جفای خلق تحمل نما"[ع۲] اس دن کے بعد سے آپنے کسی بھی شخص کو زیارت سے منع نہیں کیا جب بھی کوئی جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی تو فرماتے دوستو میرے پاس آیا کرو تو الگ الگ آیا کرو تاکہ تم علحدہ علحدہ ملاقات کرسکو۔[ع۳]

شیخ فریدالدین گنجشکر کو سہروردی سلسلے کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی سے بے پناہ عقیدت تھی نظام الدین اولیاء سے منقول ہے کہ فریدالدین گنجشکر اپنے مریدوں کو اکثر عوارف المعارف کا درس دیا کرتے تھے درس دیتے وقت سننے والوں کے ہوش جاتے رہتے انکے بیان کی لذت سے سننے والے پر ایسی حالت طاری ہوجاتی تھی کہ اگر اس دوران سننے والوں میں سے کوئی مرجاتے تو اسے دولت وصال حاصل ہو جاتی نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ جس دن یہ کتاب میرے درس کے لئے لائے اسی دن فریدالدین گنجشکر کے یہاں لڑکا پیدا ہوا تو شیخ فریدالدین

ع۱ سیرالاقطاب ص ۱۶۷

ع۲ ایضاً " ع۳ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۵

نے شیخ شہاب الدین کی نسبت سے اپنے لڑکے کا نام بھی شہاب الدین رکھا۔[1]

صاحب شجرۃ الانوار یہ فخریہ نے گلشن اولیاء کے حوالے سے خواجہ فرید الدین گنجشکر کا شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاقات کی غرض سے شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ساتھ بغداد جانے کا واقعہ بھی نقل کیا ہے اس سفر میں شیخ شہاب الدین سہروردی نے شیخ فرید الدین گنجشکر کو بغداد سے واپسی کے وقت عوارف المعارف کا ایک نسخہ بھی عنایت کیا تھا۔[2]

شیخ فرید الدین گنجشکر قصبہ اجودھن کے ابتدائی زمانے میں باوجود اہل وعیال کے جنگل میں پیدا ہونے والے پھل پیلو اور ڈیلہ پر بڑی گذارہ کرتے تھے آخری دنوں میں متواتر فتوحات کے آنے کے باوجود بھی یہ جنگلی پھل ہی آپ کی خوراک تھی آپ اسی پر قناعت کرتے اور فتوحات لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔[3] اکثر وبیشتر فاقہ رہتا آپ نے کئی شادیاں کی تھیں بچے بھی کئی تھے کنیز آتی اور کہتی خواجہ آج فلاں بچہ کا ایک فاقہ ہے یا فلاں بچی کا دو فاقہ ہے لیکن شیخ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا ایک روز انکی زوجہ آئی اور کہا کہ آج فلاں لڑکا بھوک کی وجہ سے مرنے کے قریب ہے آپنے فرمایا مسعود بندہ کیا کرے اگر تقدیر میں یہی ہے کہ اس جہاں سے سفر کرے تو اسکے پاؤں میں رسی باندھ کر باہر پھینکدو۔[4] آپ خود ہمیشہ روزہ رکھتے اگر بیمار بھی ہو جاتے جب بھی روزہ کا سلسلہ جاری رہتا اکثر شربت سے روزہ افطار کرتے

۱۔ فوائد الفواد ص ۷۵ ۲۔ شجرۃ الانوار یہ فخریہ قلمی ۸ / ۱۱۵

۳۔ سیر العارفین قلمی ۶۸ ۴۔ سیر الاولیاء ص ۷۷-۷۶

ایک پیالہ میں شربت لایا جاتا اس میں تھوڑا منقی ڈال دیتے اس شربت میں سے نصف یا ایک تہائی
حاضرین میں تقسیم کر دیتے بقیہ خود استعمال کرتے انکے استعمال کے بعد اگر کچھ بچ جاتا اسے
بھی حاضرین میں تقسیم کر دیتے اسکے بعد روغن میں چرب کی ہوئی دو روٹی لائی جاتی ان میں سے
ایک حاضرین میں تقسیم کر دیتے دوسری خود استعمال کرتے اور اگر اس میں سے بھی کوئی مانگتا تو دے
دیتے مغرب کی نماز کے بعد تھوڑا کھاتے اسکے بعد دوسرے دن افطار کے وقت تک کچھ نہ کھاتے۔[1]
سونے کے لئے ایک چارپائی تھی جس پر وہی کمبل بچھا لیتے جس پر دن میں بیٹھتے کمبل اتنا چھوٹا تھا
کہ لیٹتے وقت پاؤں اس سے باہر ہی رہتا۔[2] سر کی طرف اس عصا سے ٹیک لگا لیتے جو انہیں
قطب الدین بختیار کاکی سے ملا تھا۔[3]

ایک دن دیکھا، گھر میں نمک موجود نہ تھا خادم نے نمک ادھار لے لیا جب آپ کے
سامنے کھانا لایا گیا تو آپ کو نور باطن سے معلوم ہو گیا، فرمایا اس طعام سے تصرف کی بو آتی ہے
خادم نے عرض کیا کہ گھر میں نمک نہیں تھا ادھار لے آیا غرض آپ نے اس کھانے کو نہیں کھایا[4] اور فرمایا
کہ درویشوں کو بھوک میں موت بھی آ جائے تو وہ بہتر ہے بجائے اسکے کہ وہ لذت نفسانی کے لئے
مقروض ہوں، اگر مقروض درویش کو موت آ جائے تو قیامت کے دن اسکی گردن قرض کے بار

۱ـ فوائد الفواد ص ۵۱ نیز سیر الاولیا ص ۷۵ ۲ـ سیر الاولیا ص ۷۵
۳ـ سیر الاولیا ص ۷۵
۴ـ سیر العا ص ۷۶

سے جھلکی رہیگی ۔[1]

سلطان ناصرالدین محمود نے الغ خان کی معرفت کچھ نقدی اور چار دیہات کا شاہی فرمان آپ کے پاس بھجوایا آپ نے نقدی تو درویشوں میں تقسیم کرنے کے لئے قبول کرلی لیکن معافی کا فرمان یہ کہتے ہوئے واپس کردیا کہ اسکے بہت سے طالب ہیں انہیں دیدو ۔[2]

درویشی کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ درویشی پردہ پوشی ہے درویش کے اندر چار چیزیں ہونی چاہئے پہلی یہ کہ وہ اپنی آنکھ کو اندھا بنالے تاکہ لوگوں کے عیب نہ دیکھے کان کو بہرا کرلے تاکہ کوئی ایسی بات نہ سنے جو سننے کے لائق نہ ہو زبان کو گنگ کرلے تاکہ کوئی ایسی بات نہ کہے جو کہنے والی نہ ہو پاؤں کو لنگڑا بنالے تاکہ نفس کی خواہش پر کسی جگہ نہ جائے جن میں یہ چار خوبیاں ہیں وہی درویش ہے[3] کہا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی ایک بیٹی بی بی ہریرہ آپ کے نکاح میں تھی آپ نے اسے بھی فقر وفاقہ کی زندگی گذارنے کی تلقین کی[4] اور سلطان غیاث الدین کے بادشاہ ہوجانے کے باوجود آپ نے اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھا اور نہ کبھی اس سے مدد چاہی ۔ آخری عمر میں آپ کو خلے کی تکلیف ہوگئی تھی اور اسی بیماری میں آپ نے وفات پائی ۔[5] نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ محرم کی پانچویں رات تھی بیماری شدت اختیار

---

[1] سیر العارفین بحوالہ بزم صوفیہ ص ۱۶۶
[2] سیر العارفین قلمی ۶۷-۶۸ نیز فوائد الفواد ص ۹۹
[3] سیر الاقطاب ص ۱۷۰
[4] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۰۱
[5] سیر الاولیا ص ۹۹

کر گئی پوچھا عشاء کی نماز پڑھی ہے بتایا گیا کہ پڑھی ہے فرمایا ایک بار اور پڑھ لوں جانے پھر کیا ہو دوسری بار نماز پڑھی پھر بیہوش ہو گئے پھر جب ہوش میں آئے تو پوچھا کہ کیا میں نے عشاء کی نماز پڑھی ہے لوگوں نے بتایا کہ آپ نے دو بار نماز عشاء ادا کی ہے آپ نے فرمایا ایک بار اور پڑھ لوں جانے پھر کیا ہو چنانچہ آپنے تیسری بار نماز عشاء ادا کی اور رحمت حق سے ہمکنار ہو گئے۔[ع۱]

سال وفات ۶۷۰/۱۲۷۱ ہے اور وفات کے وقت عمر ۹۳ سال تھی۔[ع۲] بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ جنازہ کے اوپر ڈالنے کے لئے چادر بھی نہ تھی[ع۳] فوائد الفواد میں ہے کہ آپکے انتقال کے بعد تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا مشکل ہو گیا کچی اینٹیں جو قبر کے اندر لحد کے لئے ہوتی ہیں موجود نہ تھیں اسکے لئے اس دروازے کو توڑا گیا جو کچی اینٹوں کے ذریعہ بنایا گیا تھا اور وہ کچی اینٹیں لحد میں لگائی گئیں[ع۴] نسخہ فردوسیہ میں ہے کہ آخری عمر میں آٹھ دن ادراک عالم تحیر میں رہے کھانے اور پانی کی ضرورت نہ ہوتی۔ صبح سے چاشت کے وقت تک پانچ مرتبہ قرآن شریف ختم کرتے اور اس قدر ذکر کرتے کہ ہر بال سے خون جاری ہو جاتا اور ہر قطرہ جو زمین پر گرتا وہ اللّٰہ کا نقش اختیار کر لیتا[ع۵]

ع۱ فوائد الفواد ص ۲۰۳ مونس الارواح قلمی ۳۸

ع۲ ایضاً ص ۵۳

ع۳ سیر الاولیا ص ۹۹

ع۴ فوائد الفواد ص ۱۱۲

ع۵ نسخہ فردوسیہ قلمی ۱۱

شیخ نجیب الدین متوکل

شیخ نجیب الدین متوکل شیخ فریدالدین گنجشکر کے حقیقی بھائی مرید اور خلیفہ
تھے[1] خرقۂ خلافت پانے کے بعد اپنے بھائی اور مرشد کے حکم سے دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی[2]
فوائد الفواد میں ہے کہ ابتدا میں جب آپ حصول تعلیم کی غرض سے مدرسہ میں داخل ہوئے تو
مدرس نے آپ سے پوچھا کہ تم ہی نجیب الدین متوکل ہو آپ نے فرمایا میں تو نجیب الدین متأکل (کھانے والا)
ہوں متوکل ہونا کس کے بس کی بات ہے پھر مدرس نے پوچھا کہ تم ہی شیخ فریدالدین کے بھائی ہو تو
جواب دیا کہ میں برادر صوری ہوں برادر معنوی جانے کون ہوگا[3] دہلی میں آپ کا قیام منڈی
دروازے کے پاس تھا ستر برس کی عمر تک شہر میں رہے بیوی اور بچے بھی تھے پھر بھی آپ خوش وخرم
رہے[4] نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ شیخ نجیب الدین متوکل ہمیشہ یادالٰہی میں اس قدر مستغرق
رہتے کہ انہیں یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ آج کونسا دن ہے کون سا مہینہ ہے یا گوشت کس داموں بک
رہا ہے[5]

ایک مرتبہ عید کے موقع سے بعد نماز عید لوگ آپ کے پاس جمع ہوگئے اور آپ
کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگے اسی دوران درویشوں کی ایک جماعت پہونچی ان لوگوں نے سوچا کہ آپ

---

۱ سیر الاولیا ص ۱۷۷ ۲ سیر العارفین قلمی ۱۳۱

۳ فوائد الفواد ص ۱۴ - سیر العارفین میں ہے کہ شیخ نورالدین مبارک نے آپ سے دریافت کیا سیر العارفین قلمی

۴ سیر الاولیا ص ۱۷۷

۵ فوائد الفواد ص ۱۱۶

بڑے بزرگ ہیں اس لئے ہمیں انکا مہمان ہونا چاہیئے ان لوگوں نے شیخ سے عرض مدعا کیا شیخ نجیب الدین ان لوگوں کو لیکر اپنے گھر پہونچے اور اپنی زوجہ کے پاس پہونچکر ان لوگوں کو کھلانے کے لئے کھانا مانگا۔ معلوم ہوا کہ گھر میں کھانے کو کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ آپنے اپنی زوجہ سے اسکی چادر مانگی تاکہ بازار میں اسے بیچکر کھانے کا کچھ سامان لے آئیں لیکن جب چادر دیکھی تو معلوم ہوا کہ اس میں لئی۔ پیوند لگے ہوئے ہیں اس وقت یہ رسم تھی کہ جب درویش کے پاس کچھ نہ ہوتا تو پانی کا کوزہ لیکر مجلس کے کنارے کھڑے ہوجاتے شیخ نجیب الدین نے بھی ایسا ہی کیا۔ درویشوں کو حالات کا علم ہو گیا اس لئے کوزہ سے پانی پیکر باہر چلے گئے اسکے بعد شیخ نجیب الدین حجرہ میں آکر عبادت میں مشغول ہو گئے اور سوچا کہ آج عید کا دن گذر رہا ہے اور میرے بچوں کے حلق میں کھانا بھی نہیں پہونچا مسافر آئے اور نامراد واپس لوٹ گئے وہ اسی خیال میں تھے کہ یہ شعر سنائی دیا ؎

بادل گفتم دلا خضر را بینی دل گفت اگر مرا بنمائی بینم

شیخ نے خضر سمجھ کر انکی تعظیم کی انہوں نے کہا کہ یہ کیا ہے کہ تم اپنے دل سے جنگ کر رہے تھے کہ عید کا دن گذر رہا ہے اور میرے بچوں کے حلق میں کھانا نہ پہونچا جاؤ اور میرے لئے کھانا لاؤ شیخ نجیب الدین نے عرض کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میرے دل سے جنگ اسی وجہ سے تھی کہ گھر میں کچھ بھی موجود نہیں خواجہ نے کہا اٹھو وہ اٹھکر پیچھے گئے تو صحن میں کھانے کا خوان موجود تھا زوجہ سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک شخص آیا تھا اور وہ کھانا رکھکر چلا گیا وہ جب حجرہ میں پہونچے تو دیکھا کہ خضر موجود نہیں ہیں[1]

---

[1] خیر المجالس ص ۷۶-۷۵ - سیر العارفین قلمی ۱۳۱

ایک مرتبہ قلندروں کا ایک گروہ آپکی خدمت میں پہونچا اور آپ کا مہمان ہوا آپ کے پاس گھر میں کچھ بھی موجود نہ تھا آپنے ان لوگوں کو پانی پلایا اور عذر کیا قلندروں نے سونچا کہ اگر انکے پاس کوئی چیز ہوتی تو ضرور کھلاتے اب اگر ہملوگوں کے پاس کچھ ہے تو انہیں دیدیں چنانچہ قلندروں نے پانچ سو سفید تنکے شیخ نجیب الدین کی نذر کئے اور چلے گئے شیخ نجیب الدین نے وہ تنکے اسی روز صرف کردئے لوگوں نے کہا کہ آپکو اسے چند روز کے خرچ کے لئے رکھ لینا چاہئے فرمایا کہ جب آئے تو دیدو کہ کم نہ ہوگا اور جب جائے تو خیال رکھو کہ نہ آئے۔[۱]

آپ کے گھر میں اکثر فاقہ رہتا بی بی فاطمہ سام کو جو خود بھی صاحب کشف وکرامت خاتون تھیں نور باطن سے یہ بات معلوم ہوجاتی ان دونوں کے درمیان بھائی بہن جیسی محبت تھی بارہا ایسا ہوا کہ جب کئی راتیں فاقہ سے گذرجاتیں تو دوسرے دن صبح کے وقت بی بی فاطمہ کھانا بھجواتیں ایک روز وہ کہنے لگے" جیسے فاطمہ کو درویشوں کے حال سے آگاہی ہوجاتی ہے بادشاہ وقت کو بھی ہوجاتی تو وہ کوئی بابرکت چیز بھجواتا؛ پھر مسکراتے ہوئے خودی فرمایا بادشاہوں کو یہ کشف کہاں"[۲]

شیخ نجیب الدین متوکل نے جب اپنے بھائی اور پیر کے حکم سے دہلی میں اقامت اختیار کی تو انکی اقامت گاہ کے نزدیک ہی ایک ترک ایتمر نامی رہا کرتا تھا اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی اور اسکے پہلو میں اپنا مکان بھی بنوایا شیخ نجیب الدین متوکل کو اس مسجد کی امامت کا کام

۱۔ سیر العارفین قلمی ص ۲-۱۲۳

۲۔ فوائد الفواد ص ۲۴۵ نیز سیر الاولیا ص ۱۷۸

سونپا اور مکان بھی رہنے کو دیا جب اس نے اپنی لڑکی کی شادی کی تو اس میں ایک لاکھ جیتل سے زیادہ خرچ کیا شیخ نجیب الدین متوکل نے ایک موقع پر اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ مومن کامل وہ ہے جس کے یہاں حق کی محبت اولاد کی محبت سے زیادہ ہو تم نے ایک لاکھ سے زیادہ جیتل اپنی لڑکی کی شادی پر خرچ کیا ہے اگر تم اس سے دوگونی رقم راہ حق میں خرچ کرو تو تم مومن کامل ہو سکتے ہو ترک کو یہ بات بری لگی اس نے مسجد کی امامت کا عہدہ اور وہ مکان جو آپ کے رہنے کو دیا تھا واپس لے لیا شیخ نجیب الدین متوکل نے اس واقعہ کی ساری تفصیلات اجودھن جاکر خواجہ فریدالدین گنجشکر کو بتائی خواجہ فرید نے فرمایا کہ اگر ایتمر مر گیا تو خدائے تعالی ایتکر پیدا کر دیگا انہیں دنوں ایتکر نامی ایک شخص اس جگہ پہونچا اور اس نے شیخ نجیب الدین متوکل کے قریب ہی مکان بنوایا انکا مرید ہوا اور اس بلند مرتبہ خاندان کی بڑی خدمت کی ۔[1]

شیخ نجیب الدین متوکل ہر سال فریدالدین گنجشکر کی زیارت کے لئے اجودھن تشریف لے جاتے جب آپ کے پاس سے پہلی بار واپس آنے لگے تو دعاء کی درخواست کی کہ آپ کی خدمت میں پھر آؤں شیخ فرید نے فرمایا کہ دعاء کرنے کی ضرورت نہیں تم بارہا آؤگے غرض اسی طرح آپ انیس ۱۹ مرتبہ شیخ فرید کی خدمت میں پہونچے انیسویں مرتبہ جب واپس جانے لگے تو پھر دعاء کی درخواست کی تاکہ بیس مرتبہ پورا ہو جائے شیخ فرید یہ سنکر خاموش ہو گئے شیخ نجیب الدین

---

[1] فوائد الفواد ص ۷۹

نے سمجھا کہ شاید شیخ فرید نے سنا نہیں چنانچہ دوبارہ یہ بات کہی اس بار بھی وہ خاموش رہے

نجیب الدین متوکل واپس دہلی چلے گئے اور پھر ان دونوں کے درمیان ملاقات نہیں ہوئی ع[1]

شیخ نجیب الدین متوکل اپنے ایک دوسرے بھائی سے ملاقات کی غرض سے

ہر سال بدایون بھی جایا کرتے تھے ایک دن دونوں بھائی وہاں کے ایک بزرگ شیخ[2] علی کے پاس

ملاقات کی غرض سے پہونچے اور اس بورئیے جس پر شیخ علی تشریف فرما تھے دو تین قدم

پہلے ہی ادب کی وجہ سے جوتے اپنے پاؤں سے نکال لئے جوتے نکال لینے کی وجہ سے انکا پاؤں

زمین پر پڑا اور پھر اسی پاؤں سے وہ اس بورئیے پر پہونچے شیخ علی کو یہ بات ناگوار گذری کہا

یہ بوریا مقفلا ہے دونوں بھائی بیٹھ گئے شیخ علی کے سامنے ایک کتاب تھی نجیب الدین نے پوچھا کہ

یہ کون سی کتاب ہے چونکہ رنجش باقی تھی اس وجہ سے شیخ علی نے جواب نہ دیا شیخ نجیب الدین

نے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو کتاب کو دیکھیں اجازت مل گئی جب کتاب کھولی تو

دیکھا لکھا تھا "در آخر زمان ایچنین مشائخ باشند کہ در خلا نعمت کنند و در بلا

چون بر بوریای ایشان کسے پای نہد قیامت قائم کنند" اسے دیکھتے ہی فوراً کتاب شیخ علی

کو واپس کردی اور کہا آپ کی کتاب ہے اور بغیر ارادہ میری نظر پڑ گئی شیخ علی

پشیمان ہوئے اور معذرت کی[3]

ع[1] فوائد الفواد ص ۲۱م-۳م سیر العارفین قلمی ۳۶ - ۱۳۵

ع[2] سیر العارفین بن وجیہ الدین بدایونی للعماء سیر العارفین قلمی لم ۱۴

ع[3] سیر الاولیا ص ۸۷-۱۷۷

شیخ نظام الدین اولیاء فوائد الفواد میں شیخ فرید الدین گنجشکر سے ارادت کے قبل کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک دن نجیب الدین متوکل کی خدمت میں حاضر تھا اس وقت میرے سر پر گھونگھریالے بال تھے میں نے عرض کیا کہ حضرت ایک بار اس نیت سے سورۂ فاتحہ پڑھئے کہ میں قاضی ہو جاؤں نجیب الدین متوکل خاموش رہے میں نے سمجھا کہ شاید نجیب الدین متوکل نے سنا نہیں دوبارہ یہی بات کہی کوئی جواب نہ ملا جب تیسری بار یہی بات کہی تو نجیب الدین متوکل نے مسکراتے ہوئے فرمایا تم قاضی نہ ہو کوئی اور چیز ہو۔[۱]

شیخ نجیب الدین نے ۶۶۹ھ/ ۱۲۷۰ء میں وفات پائی۔[۲]

---

[۱] فوائد الفواد ص ۲۸ سیر الاولیاء ص ۱۷۸

[۲] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۲۳۵

مخدوم علاء الدین علی صابر

مخدوم علاء الدین علی صابر خواجہ فرید الدین گنج شکر کے حقیقی بھانجے خلیفہ اور داماد تھے[1] نیز آپ سلسلہ صابریہ کے موسس اور بانی ہیں آپکی ولادت ۵۹۲/۱۱۹۵ میں قصبہ کھوتوال میں ہوئی۔ فرید الدین گنج شکر نے بڑی محنت اور محبت سے اپنی تعلیم دی[2]۔ قدیم اور مستند تذکروں میں شیخ علاء الدین علی صابر کا ذکر یا تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا بھی ہے تو بہت کم سیر الاولیاء کے مصنف امیر خورد کرمانی نے اپنے والد سے سنکر شیخ علاء الدین علی صابر کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے۔

"درویشے بود بزرگ صاحب نعمت کہ او را شیخ علی صابر گفتندے در درویشی قدمے ثابت و نفسے گیرا داشت و ساکن قصبہ دیگری بود و پیوند بخدمت شیخ شیوخ عالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز داشت او را از حضرت شیخ الشیوخ عالم اجازت بیعت بود الغرض در آنچہ بعضی یاران بزرگ کہ بدولت خلافت شیخ شیوخ العالم مشرف شدہ بودند ہر یکے را وداع می شد و بموضعے مخصوص می گردانید و نفسی ہمراہ او می کرد دریں میان شیخ علی صابر عرضداشت کرد کہ درباب بندہ چہ فرمان می شود شیخ شیوخ العالم درباب او فرمود کہ ای صابر برو بھوکلہا خواہی کرد یعنی ترا عیش خوش خواہی گذشت الغرض تا آخر عمر شیخ علی صابر را عیشی خوش گذشت و او مردے خوش باش و کشادہ ابرو بود[3]"

شیخ محدث دہلوی اپنی کتاب اخبار الاخیار میں سیر الاولیاء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ ایک مضبوط اور صاحب نعمت بزرگ تھے شیخ فرید الدین گنج شکر کے مرید تھے جب شیخ نے اپنی

۱۔ سیر الاقطاب ص ۱۷۸ ۲۔ آب کوثر ص ۲۲۶

۳۔ سیر الاولیاء ص ۱۹۵

بیعت لی اجازت دی تو فرمایا صابر تم عیش وعشرت کی زندگی بسر کروگے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ تمام عمر خوش عیش رہے پھر شیخ عبدالحق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حقیقت بھی یہی ہے شیخ صابر خوش باش اور ہنس مکھ بزرگ تھے اور غالباً شیخ صابر ان شیخ علی صابر کے علاوہ ہیں جو شیخ فریدالدین گنجشکر کے داماد اور خلیفہ تھے اور جن کا مزار کلیر شریف میں ہے اور جن تک شیخ عبدالقدوس وغیرہ مشائخ کا سلسلہ پہونچتا ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ شیخ علی صابر کا سیرالاولیاء میں کوئی ذکر نہیں بلکہ اس میں شیخ صابر کا ہی ذکر کیا گیا ہے انکے ذکر کا ترک تعجب اور حیرت سے خالی نہیں ۔[1]

صاحب تاریخ فرشتہ نے دہلی میں انکی سجادہ نشینی کے سلسلے میں صرف اتنا لکھا ہے ؛

ہمشیرہ شیخ (فریدالدین گنجشکر) بسیار سعی کرد کہ سجادہ نشینی بہ پسرم عنایت نمود شیخ حرمت او نگاہداشتہ مثال نوشت و بخواہرزادہ گفت کہ بہ ہانسی پیش شیخ جمال الدین رفتہ صحیح کن مولانا جمال الدین ہانسوی آں مثال را صحیح نکرد و او برگشتہ شکایت نمود بالآخر شیخ باز حسب التماس خواہر مثال دیگر نوشتہ فرستاد و در ایں کرد مولانا جمال الدین ہانسوی اعراضی شدہ را پارہ کرد و گفت پارہ کردہ جمال الدین ہانسوی را شیخ نمی تواں دوخت ۔[2]

قدیم تذکروں میں شیخ علی صابر کے حالات نہ لکھے جانے کے سلسلے میں صاحب سیرالاقطاب لکھتے ہیں ۔

۱۔ اخبارالاخیار ص ۷۵
۲۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۹۱

"نقلست چون در ملفوظات حضرت شیخ فریدالدین گنجشکر قدس اللہ تعالی سرہ العزیز ذکر تاج الاولیا غوث صمدانی حضرت خواجہ علاء الحق والدین علی احمد صابر قدس اللہ تعالی سرہ العزیز سوائے این کم واقع شدہ و حال ایشان تمام و کمال ثبت نیست سبب او این کہ ملفوظات حضرت گنجشکر اکثر باتفاق شیخ جمال الدین ہانسوی جمع گشتہ اند وسوای آن ہر کہ نوشتہ اورا خاطر داشت شیخ مذکور لازم وغبار خاطر آنحضرت و شیخ ہانسوی خود روشن است بناء بر آن ذکر آنحضرت چنانکہ بایستی واقع نشدہ و محبت کمالیت و ولایت و عظمت آن غوث صمدانی ہمچو ماہ شہیر آفاق است و از نام آوران سلسلہ عالیہ آنحضرت کہ بعد ایشان تا حال جاری است ظاہر است کہ ہمہ عالم را بنور ولایت منور ساختہ اند و فیض ایشان بہر ملک و بہر شہر ہندوستان و ایران و توران و عرب و عجم مالامال است و تا قیامت ہمیشہ در ترقی و تزاید بکرم حق سبحانہ تعالی خواہد بود"۔ ع[1]

خواجہ علاء الدین علی احمد صابر صاحب کشف و کرامت اور عدیم النظیر بزرگ تھے انہوں نے اپنے پیر خواجہ فریدالدین گنجشکر کی بڑی خدمت کی انکے بارے میں فریدالدین گنجشکر فرمایا کرتے تھے کہ میرا علم ظاہری اور باطنی شیخ علاء الدین علی صابر میں اور شیخ نظام الدین بدایونی میں سرایت کئے ہوئے ہے اور کبھی فرماتے کہ میرے سینے کا علم نظام الدین بدایونی کو اور میرے دل کا علم شیخ علاء الدین علی صابر کو ملا ہے۔ ع[2]

ع[1] سیر الاقطاب ص ۱۸۲-۸۳

ع[2] الفنا ص ۱۷۹

شیخ علاء الدین علی صابر کو صابر کا خطاب شیخ فریدالدین گنجشکر کی طرف

سے ملا تھا کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں آپ کے سپرد مطبخ سے فقراء کو کھانا تقسیم کرنے کا

کام تھا آپ بارہ سال تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے اس مدت میں آپ نے خود کچھ بھی

نہ کھایا ایک دن شیخ فریدالدین گنجشکر کو نور باطن سے اس بات کی اطلاع ہوئی آپ نے

علاء الدین علی صابر کو بلوا کر ان سے پوچھا کہ تم مطبخ سے کھانا تقسیم کرتے ہو خود کچھ کھاتے ہو

یا نہیں آپ نے جواب دیا بغیر پیر دستگیر کی اجازت کے میری کیا مجال کہ اس میں سے ایک دانہ

بھی کھاؤں شیخ فریدالدین نے فرمایا میرا علاء الدین علی احمد صابر ہے اسی دن کے بعد سے

آپ صابر کے خطاب سے مخاطب کئے جانے لگے۔[۱]

ایک روایت ہے جو سراسر غیر منطقی خلاف عقل اور بے بنیاد معلوم

ہوتی ہے کہ جب شیخ فریدالدین گنجشکر نے شیخ علی صابر کی والدہ اور اپنی بہن کے اصرار پر اپنی

لڑکی سے شیخ علی صابر کا نکاح کر دیا تھا۔ نکاح کے بعد آپ کی والدہ نے دلھن کو لا کر آپ

کے حجرہ میں بٹھا دیا جب شیخ علی صابر حجرہ میں تشریف لائے تو دلھن سے پوچھا کہ تم کون

ہو؟ جواب ملا آپ کی دلہن آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دل میں دو کی محبت

کو جگہ دوں ایک کو دل میں جگہ دے چکا ہوں دوسرے کی قطعاً گنجائش نہیں آپ کے یہ فرماتے

۱۔ سیرالاقطاب ص ۷۹-۱۷۸

ہی حجرہ میں سے ایک آگ نمودار ہوئی جس نے دلہن کو جلا کر خاک کر دیا۔[1]

خواجہ فرید الدین گنج شکر نے آپ کو دہلی کی ولایت سپرد کی اور خلافت نامہ عطا فرمایا۔ روانہ کرتے وقت فرمایا کہ ہانسی جاکر شیخ جمال الدین ہانسوی کے پاس خلافت نامہ پر مہر تصدیق لگوالیں جب آپ ہانسی پہونچے تو جمال الدین ہانسوی کی خانقاہ کے اندر چنڈول پر سوار ہوکر داخل ہوئے اور فرش کے کنارے اترے شیخ جمال الدین ہانسوی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اسکے باوجود انہوں نے علاء الدین علی صابر کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی نہ کی مغرب کی نماز کے بعد شیخ علی صابر نے مثال نکالی اور شیخ جمال الدین ہانسوی سے مہر لگانے کو کہا شیخ جمال الدین ہانسوی نے چراغ منگوایا اور مثال کو کھولا ہوا چل رہی تھی جس سے چراغ بجھ گیا علاء الدین علی صابر نے پھونک ماری جس سے پھر چراغ روشن ہوگیا اس پر شیخ جمال الدین ہانسوی نے مثال کو پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے فرمایا: "تاب زدن شما دہلی کجا دارد کہ یک دم زدن تمام دہلی را خواہد سوخت" شیخ علاء الدین علی صابر نے اپنے مثال کو پارہ پارہ دیکھ کر غصے کی حالت میں فرمایا "چون تو مثال من پارہ کردی من سلسلہ تو پارہ کردم" اسکے بعد شیخ علاء الدین علی صابر ہانسی سے اجودھن کے لئے روانہ ہوگئے اجودھن پہونچکر شیخ فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارے واقعات بتائے جسے سننے کے بعد

[1] تذکرہ اولیای ہند و پاک ص ۷۹-۷۸

شیخ فرید الدین نے فرمایا

"پارہ کردۂ جمال را فرید نتوان دوخت"

پھر آپ کو کلیر کی ولایت سپرد فرمائی اور شال پر خود اپنے دستخط کئے۔[1]

کہا جاتا ہے کہ جس وقت کلیر کی ولایت آپ کو ملی اور آپ کلیر پہونچے اس وقت وہ شہر بہت آباد تھا اور وہاں بہت سارے علماء اور مشائخ کرام موجود تھے آپ کے شہر میں قیام کے بعد عقیدتمند آپ کے پاس آنے لگے یہ دیکھ کر وہاں کے علماء اور مشائخ کو آپ سے حسد پیدا ہوا ایک دن شیخ علی صابر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے شہر کی جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور مسجد میں منبر کے قریب جاکر بیٹھ گئے جب وہاں کے علماء اور مشائخ کی جماعت نماز کے لئے مسجد میں آئی تو آپ کو منبر کے قریب بیٹھا دیکھ کر آپ سے بڑی سختی سے پیش آئے اور کہا کہ اس جگہ سے اٹھ جاؤ اور دوسری جگہ جاکر بیٹھ جاؤ جب آپ وہاں سے اٹھکر دوسری خالی جگہ پر جاکر بیٹھے تو ان لوگوں نے اور درشتی سے بات کرنی شروع کردی اور اس جگہ سے بھی اٹھ جانے کے لئے کہا کیونکہ یہ جگہ ان کے آباؤ اجداد کے بیٹھنے کی تھی جب بات آگے بڑھی تو اس پر شیخ علاؤالدین علی صابر نے فرمایا کہ میں اس دیار کا صاحب ولایت ہوں لوگوں نے کہا کہ ہم یہ کیسے مان لیں کہ تم صاحب ولایت ہو برہان کیا ہے شیخ علی صابر

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۸۰

مسجد سے اٹھکر باہر آئے اور فرمایا "برہان یہ ہے کہ تم سب آدمی تھوڑی دیر میں مرجاؤگے آپکے اس بات کے کہتے ہی مسجد گر پڑی اور لوگ اس میں دب کر مرگئے جو کچھ بچے وہ آپ کی خدمت میں پہونچے لیکن آپنے فرمایا:

"سود مند نیست من از حق تعالی خواستم اجابت شد، یکیکس از ساکنان این قصبہ زندہ نماند باز ہرگز آباد نشود کہ نزدیک من ویرانی این جا آبادانی است"

پھر اسی سال وبا پھیلی اور اس مقام پر بسنے والے تمام لوگ اس وبا میں مرگئے غرض اس شہر کی ویرانی کے بعد آپ عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہوگئے [1] جب اس واقعہ کی اطلاع شیخ فریدالدین گنجشکر کو ملی تو آپ نے فرمایا کہ میں کیا کروں یہ جگہ انکے تصرف میں ہے۔[2]

شیخ علی صابر کی خوراک ایک جنگلی پھل گولر تھی جسے پانی میں ابال کر بغیر نمک ملائے ہوئے آپ استعمال کرتے تھے لیکن جب کوئی شخص نظام الدین اولیاء کے پاس سے آپ سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوتا تو خادم سے کہکر انکے کھانے میں نمک ملوا دیتے۔[3]

آپ کے صرف ایک مرید اور خلیفہ شمس الدین ترک[4] پانی پتی (وفات ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء)

---

[1] انوار العارفین ص ۳۵۹ [2] سیر الاقطاب ص ۱۸۲ [3] سیر الاقطاب ص ۱۷۹

[4] شمس الدین ترک پانی پتی مرشد کامل کی جستجو میں ترکستان سے ہندوستان تشریف لائے تھے یہاں آکر وہ پہلے فریدالدین گنجشکر کے مرید ہوئے پھر انکے حکم سے شیخ علی صابر کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے خرقہ خلافت پانے کے بعد اپنے مرشد شیخ علی صابر کی ہدایت پر پانی پت چلے گئے اور وہیں آخری وقت تک ارشاد و ہدایت میں مصروف رہکر ۷۲۶ھ/۱۳۲۵ء میں وفات پاگئے۔

تھے ایک بار نظام الدین اولیاء کے ایک مرید جب شیخ علی صابر کی خدمت میں ملاقات کی غرض سے پہونچے تو ان سے کہا کہ آپ نے سوائے شمس الدین کے کسی کو اپنا خلیفہ و مرید نہیں بنایا جبکہ ہمارے پیر دستگیر نے جتنے آسمان پر ستارے ہیں اس سے زیادہ مرید بنائے شیخ علی صابر نے جواب دیا میرا شمس الدین سبھی پر غالب ہے جیسے کہ خورشید انجم پر جب وہ شخص شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس واپس پہونچا تو ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ درست ہے[1] آپ کو بارگاہ ایزدی میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی جو کچھ آپ کی زبان سے نکلتا وہ پورا ہوجاتا آپ دنیا اور اہل دنیا سے تعلق نہ رکھتے اور ہمیشہ روزہ رکھا کرتے[2]۔

کہا جاتا ہے کہ شیخ علاء الدین علی صابر شاعر بھی تھے آپ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے فارسی میں تخلص احمد اور ہندی میں صابر تھا، خدا کی محبت میں آپ پر ہمیشہ استغراق کی کیفیت طاری رہتی ہوش میں کم آتے اور ہمیشہ مشاہدہ حق میں مستغرق رہتے آپ اپنے ایک ہندی شعر میں فرماتے ہیں ؎

اس طرح اس میں ڈوب اے صابر   کہ بحر ہو کے غیر ہو نہ رہے[3]

آپ سماع کے بھی بڑے دلدادہ تھے اکثر سماع سنتے آپ کی وفات بھی عین حالت وجد و سماع

---

[1] سیر الاقطاب ص ۸۰-۱۷۹   [2] سیر الاقطاب ۱-۹

[3] ایضاً ص ۱۷۹

میں ہوئی ہے[1] آپ کی تاریخ وفات صاحب سیر الاقطاب نے ۱۲ ربیع الاول ۶۶۴ھ[2] ۱۲۶۶ء اور صاحب خزینۃ الاصفیاء[3]

نے ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء لکھی ہے آپ کا مزار کلیر شریف ضلع سہارنپور میں ہے کہا جاتا ہے کہ

آپ کی وفات کے بعد ایک شیر آپ کے مزار پر ہمیشہ موجود رہتا اور مزار کی جاروب کشی کرتا اس لئے

لوگوں کا مزار تک پہونچنا مشکل ہوگیا کافی عرصہ بعد جب شیخ عبدالقدوس (وفات

) آپ کے مزار کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے تو مزار سے ایک کروہ کے فاصلہ پر ہی تھے کہ بجلی چمکی شیخ عبدالقدوس

نے کہا کہ میں آپ ہی سے ہوں اور آپ کی زیارت کے لئے آیا ہوں تین بار ایسا ہوا دیکھا آپکے ہی کہتے ہی

بجلی غائب ہوجاتی غرضکہ وہ مخدوم علی صابر کے مزار کے قریب پہونچ گئے تو فرماتے ہیں کہ مخدوم

اپنے جسم کے ساتھ قبر سے باہر آئے اپنی بغل میں بٹھایا اور نہایت مہربانی سے پیش آئے اور

فرمایا کہ تم میرے طریقے کے واسطے سے یہاں تک پہونچے ہو دوسرے اس مقام پر آنے کی طاقت نہیں

رکھتے عبدالقدوس نے عرض کیا کہ تمام لوگ چاہتے ہیں کہ آپکی زیارت سے مشرف ہوں اگر

آپ برق جلال کو سمیٹ لیں تو ایک عالم آپکے مزار کی برکت حاصل کرے مخدوم نے جواب دیا

کہ تیری وجہ سے برق کو ختم کرتا ہوں اسکے بعد خاص وعام آپ کے مزار پر جانے لگے[4]

---

[1] سیر الاقطاب ص ۱۸۴

[2] ایضاً ص "

[3] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۱۹

[4] انوار العارفین ص ۲۶۰

شیخ جمال الدین ہانسوی

شیخ جمال الدین ہانسوی کا نام جمال الدین احمد اور لقب خطیب[1] ہے لیکن بعض تذکروں میں آپ کا لقب خطیب کے ساتھ قطب بھی ملتا ہے۔[2] آپ کا سلسلہ نسب امام اعظم ابوحنیفہ کوفی (۸۰ تا ۱۵۰ھ) سے ملتا ہے۔[3] آپ شیخ فرید الدین گنجشکر کے بڑے ہی محبوب مرید اور خلیفہ تھے[4] اور یہی وجہ تھی کہ شیخ فرید الدین گنجشکر نے ہانسی میں جمال الدین ہانسوی کے ساتھ بارہ سال کا عرصہ گذارا۔[5] خواجہ فرید انکے متعلق اکثر فرمایا کرتے "جمال ہمارا جمال ہے" اور کبھی یوں فرماتے "جمال میری خواہش ہے کہ تمہارے ارد گرد چکر لگایا کروں۔"[6] شیخ فرید جب بھی کسی کو خلافت نامہ عطا فرماتے تو اسے تاکید کر دیتے کہ ہانسی جاکر اس خلافت نامہ پر جمال الدین ہانسوی سے مہر لگوالے اگر وہ اس خلافت نامہ پر مہر لگا دیتے تو خلافت نامہ مستند سمجھا جاتا اور اگر شیخ جمال الدین اسے ناپسند کرتے تو اسکی خلافت ختم کر دی جاتی شیخ علی مخدوم صابر کلیری کے خلافت نامہ کو پھاڑے جانے کا ذکر ہم مخدوم علی صابر کے حالات کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ شیخ فرید الدین گنجشکر نے نظام الدین اولیاء کو بھی خلافت نامہ عطا کرنے کے بعد شیخ جمال الدین ہانسوی سے مہر تصدیق لگوانے کے لئے انہیں ہانسی بھیجا تھا نظام الدین اولیاء

---

۱ تاریخ فرشتہ ج۲ ص

۲ خزینۃ الاصفیا ج۱ ص

۳ تذکرہ علمائے ہند اردو ص ۱۵۰

۴ نزہتہ الخواطر ص ۱۲۲ نیز اخبار الاخیار ص ۴۲

۵ سیر الاولیا ص ۱۸۸

۶ [illegible]

کے خلافت نامہ پر انہوں نے بڑی خوشی سے توثیق کی اور فرمایا

خدای جہان را ہزاران سپاس که گوہر سپردہ بگوہر شناس [۱]

شیخ جمال الدین ہانسوی سے شیخ فرید الدین گنجشکر کی محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے گنجشکر سے درخواست کی کہ وہ جمال الدین کو کچھ دنوں کے لئے انکے پاس بھیج دیں تو شیخ فرید الدین گنجشکر اسکے لئے تیار نہ ہوئے اور آپ کو انکے پاس نہ بھیجا۔ [۲]

فوائد الفواد میں ہے کہ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ جمال الدین ہانسوی کو بھی اپنے مرشد سے بے انتہا لگاؤ اور محبت تھی اور اسی محبت کی وجہ سے جب فرید الدین نے ہانسی سے اجودھن جاکر قیام کیا تو شیخ جمال الدین شیخ فرید الدین سے ملاقات کے لئے سات مرتبہ ہانسی سے اجودھن پہونچے۔ [۳]

جمال الدین ہانسوی شیخ فرید گنجشکر سے بیعت سے پہلے بہت بڑے خطیب اور مقرر تھے لیکن شیخ فرید سے بیعت کے بعد انہوں نے اپنے پچھلے تمام مشاغل کو ترک کر دیا حتی کہ بیشتر اوقات کھانا تک چھوڑ دیا جمال الدین ہانسوی کی ایک کنیز جو خود بھی بڑی صالحہ اور عابدہ خاتون تھیں اور جنہیں شیخ فرید الدین گنجشکر مادر مومنان کہکر مخاطب کرتے تھے ایک بار

۱۔ سیر الاولیا ص ۱۸۷ ۲۔ تحفۃ الابرار ص ۴۴

۳۔ فوائد الفواد ص ۲۴

شیخ فرید کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آپ نے ان سے پوچھا ہمارا جمال کیا کرتا ہے اس
نے جواب دیا کہ جس روز سے آپ سے تعلق قائم کیا ہے گاؤں اسباب اور خطابت کا
کام بالکل چھوڑ دیا ہے اور فاقہ کشی اور پریشانیاں اٹھاتے ہیں۔ شیخ فرید اس بات کو سنکر
بہت خوش ہوئے اور فرمایا "الحمد اللہ خوش می باشد" [1] صاحب اخبار الاخیار [2] اور
تقصار جیود الاحرار من تذکار [3] نے بھی اسی قسم کا ایک واقعہ نقل کیا ہے یہ واقعہ مندرجہ بالا
واقعہ سے ملتا جلتا ہے بلکہ یہ کہیں کہ اسکی دوسری شکل ہے لیکن اس میں جمال الدین ہانسوی کی
کنیز کا ذکر نہیں بلکہ کہا گیا ہے کہ ایک شخص ہانسی سے فرید الدین گنجشکر کی خدمت حاضر ہوا۔

شیخ فرید الدین گنجشکر نے جمال الدین ہانسوی کو ہانسی سے اجودھن جانے سے
پہلے اور اپنے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے بعد دہلی سے ہانسی آنے کے بعد خرقہ
خلافت عطا فرمایا تھا [4] اور اجودھن جاتے ہوئے انہیں ہانسی میں ہی رہنے کی تاکید کی تھی [5]
خواجہ فرید الدین گنجشکر کے قیام ہانسی کے دوران جمال الدین ہانسوی کے ذمہ اپنے مرشد کے لنگر خانے
کے لئے جنگل سے ڈیلہ لانے کا کام تھا جس میں نمک مرچ لگاکر اچار بنایا جاتا تھا [6]

شیخ جمال الدین ہانسوی کے مرتبے کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے

---

۱ سیر الاولیاء ص ۱۹۰-۱۹۱   ۲ اخبار الاخیار ص ۴۲   ۳ تقصار جیود الاحرار من تذکار ص ۱۳۹

۴ سیر العارفین قلمی ۵۶ - چونکہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ۶۳۳ / ۱۲۳۵ میں وفات پائی اس لئے اندازہ یہ ہے کہ جمال الدین ہانسوی کو خلافت نامہ بھی اسی سال یا ایک سال بعد ملا ہوگا۔

۵ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۴   ۶ معارف ستمبر ۱۹۲۵ء

کہ جب آپ ایک مرتبہ اپنے مرشد سے ملاقات کی غرض سے اجودھن پہونچے تو مرشد کے جسم مبارک میں سخت تکلیف تھی اور وہ علیل تھے شیخ فرید الدین گنجشکر نے جمال الدین سے اپنی صحت کے لئے دعاء کی درخواست کی اور فرمایا کہ فلاں قبرستان میں جاکر انکی صحت کے لئے دعاء کریں[1]

شیخ نظام الدین اولیاء اور جمال الدین ہانسوی کے درمیان بہت بہتر تعلقات تھے شیخ نظام الدین اولیا ان سے ملاقات کی غرض سے اکثر ہانسی جایا کرتے تھے اسی سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ:

> پیش از خلافت وقتی کہ من بخدمت جمال الدین می رفتم مرا تعظیم کردے وقیام آوردے چون بعد از خلافت یکروز برو رفتہ شد نشستہ ماند مرا در خواطر گذشت مگر اینمعنی موافق ایشان نیست برفور فرمود مولانا نظام الدین تا تو بدانی کہ من پیش تو نہ ایستادہ ام سبب چیزے دیگر است فاما ہرگاہ کہ محبت درمیان آمد من و تو یکے شدیم پیش خود برخاستن چگونہ روا باشد ۔[2]

نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ شیخ جمال الدین ہانسوی کے پاس گیا صبح کا وقت تھا اور سردی کا موسم شیخ جمال الدین میری طرف متوجہ ہوئے اور یہ دو مصرعے کہے ۔

بار وغن گاؤ اندرین روز تنک نیکو باشد ہریسہ[3] و نان تنک

---

[1] سیر الاولیا ص ۱۸۹

[2] سیر الاولیا ص ۱۸۹

[3] یہ ایک قسم کا کھانا ہے جسے گیہوں کے دلئے میں گوشت گھی اور نمک ملاکر پکاتے ہیں

میں نے عرض کیا جو چیز موجود نہیں اسکا ذکر غیبت ہے شیخ جمال الدین نے جواب دیا کہ میں نے اسے لا رکھا ہے اسی لئے تو ذکر کر رہا ہوں پھر جو کچھ کیا تھا وہی لا کر سامنے رکھ دیا۔[1]

فوائد الفواد[2] میں ایک جگہ اجودھن سے ہانسی جاتے ہوئے شیخ فرید الدین گنجشکر کے ارشاد پر ان دونوں کے ہمسفر ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے اس سفر میں ان لوگوں کے ہمراہ شمس دبیر بھی تھے۔

صاحب سیر الاولیا[3] اور اخبار الاخیار[4] نے لکھا ہے کہ جس روز سے شیخ جمال الدین نے یہ حدیث سنی " القبر روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النیران " (قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوتی ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا) حدیث کے اس تتمہ کو سنکر آپ بہت پریشان ہوئے اور بیقرار رہنے لگے آپ کی وفات کے بعد آپ کے دوستوں اور عزیزوں کو بھی اس بات کی تشویش تھی کہ قبر میں آپ کس حال میں ہیں کچھ عرصہ بعد جب لوگوں نے آپ کی قبر پر گنبد بنانا چاہا تو قبر کی کھدائی کرتے ہوئے جب لحد کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ قبلہ کی جانب ایک کھڑکی ہے جس سے جنت کی خوشبو آرہی ہے[5] چنانچہ لوگ وہاں سے ہٹ گئے اور پھر قبر کو اوپر سے بند کر کے گنبد کی عمارت تعمیر کردی گئی۔[6]

۱۔ فوائد الفواد ص ۵۴ نیز سیر الاولیا ص ۱۹۱

۲۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۲۸

۳۔ سیر الاولیا ۱۹۲ ۴۔ اخبار الاخیار ص ۴۷

۵۔ کرامات اولیا قلمی ۲۳۷

۶۔ اخبار الاخیار ص ۴۷

نظام الدین اولیاء سے منقول ہے کہ انکی وفات کے بعد لوگوں نے اپنے خواب میں دیکھا

جب ان سے انکے حالات پوچھے تو انہوں نے فرمایا قبر میں دفن کردئے جانے کے بعد عذاب کے دو فرشتے

میرے پاس پہونچے پھر اسکے فوراً بعد دوسرے فرشتے آئے اور وہ اپنے ساتھ خدا کا فرمان لائے کہ

میں نے اسے اس وجہ سے بخش دیا کہ یہ مغرب کی نماز کے بعد دو رکعت صلواۃ بروج اور ہر

فرض نماز کے ساتھ آیتہ الکرسی پڑھتے تھے[۱] آپ نے ہانسی میں ہی وفات پائی اور وہیں دفن کئے گئے[۲]

سال وفات ۶۵۹ / ۱۲۶۱ ہے خاندان چشتیہ جمالیہ آپ کی طرف ہی منسوب ہے۔[۳]

جمال الدین ہانسوی کے دو صاحبزادے تھے بڑے صاحبزادے دیوانے ہو گئے

تھے کبھی کبھی ہوش میں آتے تو عقلمندی کی باتیں کرتے نظام الدین اولیاء بتاتے ہیں کہ:

"اگر دیوانہ شدہ بود فاما از ہزار ہوشیار نشنیدم .... دانستم کہ
این دیوانہ معنوی است"

ایک بار ہوش میں آنے پر فرمایا العلم حجاب اللہ الاکبر (علم اللہ کا بہت بڑا حجاب ہے)

جب اسکی وضاحت پوچھی تو جواب دیا علم دون حق است و ہر چہ دون حق است

حجاب حق است[۴] (علم غیر حق ہے اور جو کچھ غیر حق ہے وہی حجاب حق ہے)

---

۱ سیر الاولیا ص ۱۹۲ اخبار الاخیار ص ۴۷

۲ آئین اکبری ص ۱۷۳ ۳ مراۃ الانساب ص ۱۳۹

۴ سیر الاولیا ص ۱۹۴

شیخ جمال الدین ہانسوی عالی مرتبہ صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے آپکے غزلیات اور رباعیات کا دیوان شائع ہو چکا ہے اپنے اشعار میں کہیں آپ اپنا تخلص جمال اور کہیں احمد کرتے ہیں جیسے

روزی تو دہی فرمان کا ہے احمد سرگردان
بار است ترا بر من ہر گاہ کہ می آئی ¹

یا

آواز جمال خستہ بشنو کز آرزو بت بیار ب آمد ²

اپنے کلام میں انہوں نے تصوف کے بھی مختلف پہلوؤں کو لیا ہے ۔

---

۱ دیوان جمال الدین ہانسوی ص ۲۹۵ بحوالہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۶۰ء
۲ ایضاً ص ۲۹۶ " "

شیخ بدرالدین غزنوی

شیخ بدرالدین غزنوی قطب الدین بختیار کاکی کے خلیفہ اور مرید تھے

اسکے علاوہ وہ اپنے زمانہ کے مشہور شاعر اور صاحب تاثیر واعظ بھی تھے انکے طرز بیان
کی دلکشی پر سننے والے رشک کرتے تھے اور انکی وعظ کی مجلسوں میں دیگر شرکاء کے علاوہ
شیخ فریدالدین گنجشکر، قاضی حمیدالدین ناگوری، قاضی منہاج سراج، سید نورالدین مبارک غزنوی
اور مولانا مجدالدین جیسے پایہ کے بزرگان کرام بھی شریک ہوتے تھے[1] اخبار الاخیار میں ہے کہ
انکی وعظ کی مجلسوں میں خواجہ خضر بھی حاضر ہوا کرتے تھے ایک مرتبہ آپ کے والد نے
خواہش ظاہر کی کہ وہ انکی ملاقات خواجہ خضر سے کرادیں ایک مرتبہ آپ وعظ فرمارہے
تھے اس مجلس میں خواجہ خضر بھی موجود تھے آپنے اپنے والد سے اشارتاً فرمایا کہ خضر فلاں
جگہ بیٹھے ہیں آپ کے والد نے سوچا کہ وعظ ختم ہوجانے پر وہ خضر سے ملاقات کرینگے لیکن
وعظ کے ختم ہوتے ہی خضر روپوش ہوگئے[2]

فوائد الفواد میں ہے کہ شیخ بدرالدین غزنوی فرماتے ہیں کہ جب وہ غزنی
سے لاہور آئے تو اس وقت لاہور بڑا آباد شہر تھا انہوں نے کچھ دنوں تک لاہور میں
قیام کے بعد واپس غزنی جانے کا ارادہ کیا کبھی خیال ہوتا کہ دہلی کی طرف جاؤں اور کبھی

1- تاریخ مشائخ چشت ص 155
2- اخبار الاخیار ص 57 نیز مراۃ الاسرار قلمی 200

خیال ہوا کہ غزنی لوٹ جاؤں طبیعت کا زیادہ میلان غزنی کی طرف لوٹ جانے کا تھا کیونکہ میرے والدین دوست و احباب عزیز و اقارب سب وہیں تھے دہلی میں صرف میرا داماد تھا کئی روز اسی کشمکش کے عالم میں گذرے پھر پہلے غزنی جانے کے ارادے سے قرآن سے فال نکالی تو اس ارادہ پر عذاب کی آیت نکلی پھر جب دہلی کی نیت کرکے فال نکالی تو بہشت اور اسکی نہریں اور اسکے دوسرے اوصاف والی آیت نکلی اس فال کے مطابق دہلی کا ارادہ کیا جب شہر میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ میرا داماد قیدخانہ میں بند ہے اپنے داماد کے متعلق معلوم کرنے کے لئے جب سلطان کے محل کی طرف روانہ ہوا تو دیکھا کہ میرا داماد محل سے واپس آرہا ہے اور اسکے ہاتھ میں چادر ہے اور اس چادر میں چاندی کے سکے جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا بہت خوش ہوا اور بغلگیر ہوا اور مجھے اپنے گھر لے گیا اسکے چند دنوں بعد ہی غزنی سے خبر آئی کہ مغلوں نے غزنی میں داخل ہوکر غزنی کو تباہ کردیا اور میرے ماں باپ اور سارے اعزہ و اقربا کو شہید کردیا ۔[1]

شیخ بدرالدین غزنوی نے دہلی میں قیام کے کچھ عرصہ بعد ہی قطب الدین بختیار کاکی کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے وہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے

---

[1] فوائد الفواد ص ۷۲-۷۳ سیر الاولیاء میں بھی یہ واقعہ موجود ہے لیکن انکے داماد کے قید ہونے کا ذکر نہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیر الاولیا ص ۱۷۵

اور آخری وقت تک انکے ساتھ رہے[1] بدرالدین غزنوی قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے وقت بھی انکے پاس موجود تھے[2] آپ کی خواہش تھی کہ شیخ کی وفات کے بعد وہ انکے جانشین ہوں لیکن قطب الدین بختیار کاکی نے وفات سے قبل ہی اپنی جانشینی کے لئے فریدالدین گنجشکر کا انتخاب کر لیا تھا[3] آپ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے بعد بھی دہلی میں ہی مقیم رہے آپ بعد میں دارالسلطنت دہلی کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے آپ کا بیشتر وقت امراء کی محفلوں میں گذرنے لگا اس لئے انکے ہاتھوں اس سلسلے کا نشوونما نہ ہو سکا نظام الدین اولیا انکے متعلق فرماتے ہیں۔

"شیخ بدرالدین سخت بزرگ بود فاما ہرگاہ کہ در شہر درآمدہ بخلق مشغول شد کار او چگونہ پیش رود"[4]

شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے بعد ملک نظام الدین خریطہ دار نے آپ کے لئے ایک خانقاہ بنوادی تھی اور آپ اس خانقاہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے خانقاہ میں انکے لئے تمام سہولیات مہیا کر دی گئی تھیں لیکن کچھ ہی عرصہ بعد نظام الدین خریطہ دار سے حساب طلب کیا انکے ذمے عدالت کا کچھ روپیہ نکلا چنانچہ بدرالدین غزنوی نے شیخ فریدالدین گنجشکر

---

[1] سیرالاولیا ص ۱۷۵ - کرامات اولیا میں ہے کہ "پیغمبر صلعم در واقعہ داشت او را بخواجہ قطب الدین سپردہ بود ند...... شیخ از شہر بہ شہر می گشت و از خواجہ نشان می جست تا بالہام غیبی بدینجا رسید وشرف خدمت خواجہ دریافتہ مرید گشت"۔ کرامات اولیا قلمی ۲۱۶

[2] فوائدالفواد ص ۱۸۵ [3] فوائدالفواد ص ۱۸۷

[4] سیرالاولیا ص ۱۷۶

کے نام ایک خط لکھا جس کی ابتدا میں یہ اشعار تحریر کئے ؎

فریدون ملت یار مہتر / کہ بادش در کرامت زندگانی

دریغا خاطرم گر جمع بودی / بمدحش کردمی گوہر فشانی [۱]

اور پھر عرض کیا

"شخصی از عہدیداران دیوان برای من خانقاہ بناء نمودہ بر تفقد حال درویشان میکرد و اکنون اورا حساب کشیدہ اند ازین جہت خاطرم پریشانست ملتمس آنکہ بدعای استمداد فرمایند کہ خلاصی او شود و برکاروبار درویشان سامان بپزیرد والسلام"

خواجہ فریدالدین گنجشکر نے خط پڑھکر اسکا جواب لکھا :

رقعہ عزیزالوجودی رسید بمطالعہ آن فرحت انجامید بدانچہ مندرج بود برین گردید ہر آئینہ کہ بر نہج پیران خویش روش بنماید ضرورتش ہمین پیش آید کہ خاطراو از غم نیاساید چون معتقدان پیران پاک بود چرا بخلاف روش ایشان خانقاہی بنا نمودہ دروی جلوس کرد چرا کہ خواجہ فریدالدین و پیر بی نظیر ایشان خواجہ قطب الدین و پیر بی نظیر ایشان خواجہ معین الدین را روشی و عادتی نبود کہ برای خود خانقاہی سازند و دوکانی آرایند بلکہ قصد ایشان گمنامی و بی نشانی بود [۲]

شیخ فریدالدین گنجشکر اپنے دہلی کے دوران قیام ایک بار ملاقات کی غرض سے بدرالدین غزنوی کے پاس پہونچے اس وقت بدرالدین غزنوی ایک پرانے کمبل پر تشریف فرما تھے گھر میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی اس لئے خواجہ عبدالکریم کو (جو آپکے داماد تھے)

۱۔ فوائدالفواد ص ۱۵۰

۲۔ سیرالعارفین قلمی ۱۷۰ء

وہ کمبل دیا اور کہا کہ اسے بازار میں فروخت کرکے روٹی اور شوربا لے آؤ خواجہ کریم جب بازار کی طرف جانے لگے تو فرمایا کہ کمبل فقیرانہ طریقے سے فروخت کرنا جب فرید الدین گنجشکر نے پوچھا کہ فقیرانہ طریقے سے فروخت کرنے کا کیا مطلب ہے تو بدرالدین غزنوی نے مسکراتے ہوئے فرمایا فقیرانہ طریقے کا یہ مطلب ہے کہ جو قیمت بھی اسکا لینے والا دے اس میں مضائقہ نہ کیا جائے [۱]

شیخ بدرالدین غزنوی اپنے زمانے کے مشہور شاعر بھی تھے آپ کو سماع سے بھی بڑی انسیت تھی اکثر انکے گھر پر مجلس سماع منعقد ہوا کرتی ایک موقع پر مجلس سماع میں انکی ایک نظم گائی جارہی تھی یہ نظم آتش گرفت کی ردیف میں تھی جب قوال اس شعر پر پہونچا کہ

نوحہ می کرد بر من نوحہ گر در مجمعی　　　آہ ازیں سوزم برآمد نوحہ گر آتش گرفت

تو قاضی منہاج الدین ابن سراج نے اپنی دستار و ورع کو تار تار کردیا [۲] خود شیخ بدرالدین غزنوی آخری عمر میں بڑھاپے کی وجہ سے بے حد کمزور اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہوگئے تھے پھر بھی سماع کی مجلسوں میں اشعار سنکر بے قابو ہوجاتے اور اٹھکر رقص کرنے لگتے لوگوں نے جب آپ سے پوچھا کہ آپ بوڑھے ہوگئے ہیں تعجب ہے رقص کیسے کرلیتے ہیں تو آپ

---

[۱] سیر العارفین قلمی ۷۱ فوائد الفواد میں بھی یہ واقعہ موجود ہے لیکن اس میں فرید الدین گنجشکر کا ذکر نہیں اور درویشانہ طریقے سے بیچنے کا واقعہ بدرالدین اسحاق سے منسوب کیا ہے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۳۹

[۲] فوائد الفواد ص ۹۲-۱۹۱

نے جواب دیا

"شیخ نمی رقصد عشق می رقصد ہر جا کہ عشق است او را رقص است" [1]

فوائد الفواد میں نظام الدین اولیاء شیخ بدر الدین غزنوی کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ ہر ماہ رجب کے آخر میں درازی عمر کے لئے ایک نماز پڑھا کرتے تھے پھر شیخ نظام الدین بستر شیخ ضیاء الدین پانی پتی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ میں نے اس سے سنا کہ جس سال بدر الدین نے وفات پائی اس سال انہوں نے یہ نماز نہیں پڑھی تھی جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس سال یہ نماز کیوں نہ پڑھی تو آپ نے فرمایا اس لئے کہ میری عمر میں سے اب کچھ بھی باقی نہ رہا اسی سال آپ نے وفات پائی۔ [2] سال وفات ۶۵۷ / ۱۲۵۸-۵۹ ہے۔ آپ کا مزار قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے پائین میں ہے۔ [3]

کہا جاتا ہے کہ ایک بار دہلی میں بارش کی کمی ہوئی اور قحط کے آثار نظر آنے لگے تو سلطان شمس الدین التمش نے آپ سے کہا کہ آپ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی جگہ پر بیٹھے ہیں دعا کریں کہ بارش ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک بدر الدین زندہ ہے دہلی میں قحط نہیں ہوگا اسکے بعد ضرورت کے مطابق بارش ہوئی۔ [4]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۵۷
[2] فوائد الفواد ص ۲۳ نیز سیر الاولیا ص ۱۲۶
[3] اخبار الاخیار ص ۵۷
[4] کرامات اولیا قلمی ۲۱۶

شیخ بدرالدین اسحاق

مولانا بدرالدین اسحاق بن علی[۱] بن اسحاق دہلوی فریدالدین گنجشکر

کے خادم خاص ہیں[۲] خلیفہ اور داماد تھے[۳] - نظام الدین اولیاء سے منقول ہے کہ بدرالدین اسحاق

کہتے تھے کہ میں فریدالدین گنجشکر کا خادم محرم تھا جو بات ہوتی وہ مجھ سے فرماتے اور جو کام

ہوتا وہ میرے سپرد کرتے[۴] آپ کے ذمہ اپنے مرشد کے لنگرخانہ کے لئے ایندھن کی لکڑی

لانا تھی چنانچہ آپ ایک پشتارہ ایندھن کی لکڑی جنگل سے اپنے سر پر رکھ کر لاتے[۵] - آپ

نے دہلی میں ہی تعلیم حاصل کی دوران طالب العلمی میں بھی طلبا کے درمیان اپنی خوش طبعی اور

تیزی ذہن کے لئے مشہور تھے[۶] تعلیم سے فراغت کے بعد علم وفضل کی اس منزل پر فائز ہوئے

کہ دہلی کے علماء میں کوئی آپ کا مد مقابل نہ تھا آپ نے تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی کے ہی

مدرسہ معزی میں درس دینا شروع کر دیا[۷] اسی دوران بعض علمی مسائل اور اشغال ایسے پیش

آئے جو دہلی کے معاصر علماء سے بھی حل نہ ہو سکے چنانچہ آپ نے اس ضروری مسائل کے حل کے لئے

دہلی سے بخارا جانے کا ارادہ کر لیا جب دہلی سے بخارا کے لئے روانہ ہوئے تو اجودھن کے

ع[۱] سیر الاولیاء ص ۱۷۹ مع سیر العارفین نے بدرالدین اسحاق بن منہاج الدین بخاری لکھا سیر العارفین ص ...

ع[۲] خیر المجالس ص ۱۳۰ ع[۳] کرامات اولیا قلمی ۲۳۵

ع[۴] فوائد الفواد ص ۴۷ ع[۵] سیر العارفین قلمی ۷۵ نیز تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۷

ع[۶] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۷ ع[۷] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۷

قریب پہونچنے پر آپ کے ہمراہی فریدالدین گنجشکر کی زیارت کے لئے جو اس وقت اجودھن میں مقیم تھے ان کے پاس جانے لگے ہمراہیوں نے شیخ بدرالدین اسحاق سے بھی فریدالدین گنجشکر کے پاس چلنے کی درخواست کی لیکن چونکہ بدرالدین اسحاق کا اعتقاد درویشوں پر نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنے ہمراہیوں کو منع کرتے ہوئے فرمایا

"شما بروید من اینطور شیخانرا بسیار دیده ام بدان نمی ارزند که کسی در صحبت آنھا تضیع اوقات کند" ع[۱]

اس کے بعد میں اپنے ہمراہیوں کے اصرار اور انکی خوشامد پر وہ انکے ساتھ شیخ فریدالدین گنجشکر کی خدمت میں جانے کے لئے تیار ہوئے اور جب وہ انکی خدمت میں پہونچے تو گنجشکر نے گفتگو کے دوران ہی ان تمام مسائل اور مشکلات کا حل جو بدرالدین اسحاق کے دل میں تھا اور جسکے جاننے کے لئے وہ بخارا جا رہے تھے مختلف انداز میں بیان کر دیا۔ ع[۲] مولانا بدرالدین اسحاق کو تعجب ہوا اور انہوں نے سوچا

"این بزرگ کتابے نزدیک خود ندارد و جامہای چادر پوشیدہ از علم من الدنی خبر می دہد این علم کسبی نیست بجہت چیزی کہ در بخارا میرفتم صد چندان ہمین جا یافتم" ع[۳]

چنانچہ انہوں نے بخارا کا ارادہ ملتوی کر دیا اور گنجشکر کے معتقد ہو گئے پھر انکی خدمت میں ہی رہنے لگے شیخ فریدالدین گنجشکر بھی آپ سے نہایت الفت رکھتے اور اپنے قریب

ع[۱] سیر العارفین قلمی ص ۷۵ ع[۲] کرامات اولیا قلمی ۲۳۵ - تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۷

ع[۳] سیر الاولیا ص ۱۸۰

سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں فرماتے [1] آپ نے شیخ بدرالدین اسحاق کی قابلیت اور صلاحیت کو دیکھ کر انہیں خلافت سے سرفراز فرمایا اور اپنی لڑکی بی بی فاطمہ سے انکی شادی کر کے شرف دامادی سے بھی مشرف کیا۔ [2]

شیخ بدرالدین اسحاق نے اپنے مرشد شیخ فرید کی موجودگی میں ہی لوگوں کو انکی اجازت سے بیعت کرنا شروع کر دیا چنانچہ اس سلسلے کا ایک واقعہ سیرالاولیاء میں ملتا ہے واقعہ یہ ہے کہ شرف الدین کبری جو دیوپال پور کا حاکم تھا فریدالدین گنجشکر کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوا گنجشکر نے بدرالدین اسحاق کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ انکے ہاتھ پر بیعت کرو اور بدرالدین اسحاق نے بھی شیخ کے حکم پر اسکو بیعت کیا۔ [3] فوائد الفواد میں ہے کہ فرید گنجشکر نے شیخ بدرالدین اسحاق کے ذمے تعویز لکھنے کا کام بھی سونپ رکھا تھا۔ [4]

نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ شیخ بدرالدین اسحاق شیخ فرید کی اس قدر خدمت کرتے تھے کہ ایسی خدمت دس آدمی سے بھی ممکن نہیں باوجود اسکے کہ وہ یاد الٰہی میں اس قدر مستغرق رہتے کہ انہیں اپنی خبر نہ ہوتی۔ [5] شاید ایسی ہی حالت میں ایک روز بار بار یہ شعر پڑھ رہے تھے ؂

پیش سیاست غمش روح چہ نطق نمیزند ای زہزار صعوہ کم لیس تو نواچہ کازنی [6]

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۱ حصہ اول ص ۱۸۰ [2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۶ نیز سیرالاولیا ۱۸۰

[3] سیرالاولیا ص ۱۸۵ [4] فوائد الفواد ص ۲۰۰

[5] سیرالاولیا ص ۱۸۷ [6] اخبار الاخیار میں اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح ہے پیش صلابت غمش روح

نطق نمی زند اخبار الاخیار ص ۳۷

اور عالم تحیر میں تھے جب شام (مغرب) کا وقت ہوا تو فریدالدین گنجشکر نے آپ کو امامت کرنے کے لئے کہا آپ نے نماز شروع کی تو تحریمہ کے بعد قرات کے بجائے یہی شعر پڑھنا شروع کردیا پھر بیہوش ہوگئے جب ہوش میں آئے تو فریدالدین گنجشکر نے دوبارہ آپ سے ہی امامت کے لئے فرمایا یہ تاکید ضرور کردی کہ وہ آپے میں رہکر نماز پڑھائیں چنانچہ اس بار آپ نے نماز ختم کی۔[1]

شیخ بدرالدین اسحاق اکثر و بیشتر اوقات روتے ہوئے نظر آتے کبھی ایسا نہ ہوتا کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو نہ ہو اور کثرت گریہ کی وجہ سے آپ کی دونوں آنکھیں

ہردو چشم مبارک او گل افتادہ بود ایک دن امیر خورد کرمانی کی دادی نے جو فریدالدین گنجشکر سے بیعت تھیں شیخ بدرالدین اسحاق سے کہا کہ اے بھائی اگر تم تھوڑی دیر کے لئے اپنے آنسو روک لو تو میں سرمہ سے اسکا علاج کردوں اس پر بدرالدین اسحاق نے روتے ہوئے جواب دیا کہ اے بہن میرے آنسو میرے اختیار میں نہیں ہیں۔[2] امیر خورد کرمانی نے اپنے والد سے سنکر یہ روایت بیان کی ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاق اجودھن کی مسجد میں قیام کے دوران نماز چاشت میں مشغول ہوتے تو سجدہ کے دوران اس قدر روتے کہ سجدہ کی جگہ انکے آنسو سے تر ہوجاتی۔[3]

---

1. سیرالاولیا ص ۱۸۲
2. ایضاً ص ۸۳-۱۸۲

شیخ بدرالدین اسحاق کے اجودھن کی جامع مسجد میں قیام کے سلسلے میں

امیر خورد کرمانی اپنے والد سے سنکر یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے فریدالدین گنجشکر کی وفات کے

بعد اجودھن کی جامع مسجد میں قیام کیا اور اسکی وجہ یہ تھی کہ جب شیخ گنجشکر کی وفات کے

بعد انکے منجھلے لڑکے بدرالدین سلیمان اپنے بھائیوں اور بعض عقیدتمندوں کے مشورہ سے

سجادہ نشین ہوئے تو شیخ بدرالدین اسحاق انکی خدمت میں اسی طرح لگے رہے جس طرح

انکے والد اور اپنے مرشد کی خدمت میں لگے رہتے تھے تھوڑی ہی مدت بعد اوچھے حاسدوں نے

ان دونوں کے درمیان عداوت پیدا کردی جس کے نتیجے میں بدرالدین اسحاق نے امیر خورد کرمانی

کے جد بزرگوار سید علی کرمانی کے مشورہ پر بدرالدین سلیمان سے الگ ہوکر جامع مسجد

میں قیام کیا اور وہاں قرآن مجید کا درس دینے لگے آپ کے درس میں شرکت کرنے والے

لوگوں میں امیر خورد کے والد، شیخ فریدالدین گنجشکر کے صاحبزادے شیخ یعقوب اور شیخ

علاءالدین وغیرہ بھی تھے ۔[1]

نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ مجھے مولانا بدرالدین اسحاق سے بڑی

محبت تھی اور وہ کل امور جو مجھے فریدالدین گنجشکر کے پاس پیش آتے مولانا اس میں

میری مدد کرتے اور وہ خود بھی میری تربیت کرتے اور شاید یہی وجہ تھی کہ نظام الدین اولیاء

---

[1] سیرالاولیا ص ۸۲ - ۱۸۱

نے انکی عظمت اور احترام کی وجہ سے انکی زندگی میں کسی کو بیعت نہیں کیا۔[1] ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ مولانا بڑے بزرگ تھے ایک دن میں نے ان سے کہا کہ تنگی کی حالت میں میں پہلے شیخ فرید کو یاد کرتا ہوں پھر آپ کو انہوں نے فرمایا کہ میں جو نعمت رکھتا تھا وہ مجھ سے سلب ہوگئی ہے اسکی تعزیت میں ہوں نظام الدین اولیاء نے پوچھا کہ اس سے قبل کیسی نعمت تھی جواب اس قدر ہے پھر واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن فریدالدین گنجشکر نے بدرالدین اسحاق کو سزا دی وجہ یہ تھی کہ فریدالدین گنجشکر نے کسی وقت بدرالدین اسحاق کو آواز دی بدرالدین اسحاق کام میں اس قدر مشغول تھے کہ جواب نہ دے سکے اسکی وجہ سے فریدالدین گنجشکر ان سے رنجیدہ ہوگئے۔[2]

اور شاید اس واقعہ کے بعد ہی آپ کی یہ حالت ہوگئی کہ آپ ہر حالت میں فریدالدین گنجشکر کی طرف سے پکارے جانے پر فوراً جواب دیتے یا حاضر ہو جاتے۔ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک مرتبہ فریدالدین گنجشکر نے آپ کو آواز دی اس وقت آپ نماز میں مشغول تھے لیکن اسی حالت میں آپنے لبیک کہا اور حاضر ہوگئے گنجشکر نے فرمایا کہ ایک بار رسول اللہ صلعم کھانا کھا رہے تھے آپ نے کسی ضرورت سے ایک صحابی کو آواز دی جو نماز میں مصروف تھے نماز میں مصروفیت کی وجہ سے صحابی کے آنے میں دیر ہوگئی حضور نے جلد نہ آنے کی وجہ پوچھی اور فرمایا کہ خدا اور خدا کا رسول بلانے کو

---

[1] سیرالاولیاء ص ۱۸۲
[2] ایضاً ص ۱۸۷

فوراً آجانا چاہئے[1] شاید فریدالدین گنجشکر کے اس واقعہ کے بتانے کا مقصد یہ تھا کہ شیخ کا فرمان رسول کے فرمان کے برابر ہوتا ہے اس لئے مرید شیخ کے فرمان پر بھی اسی طرح عمل کرے جس طرح وہ رسول کے فرمان پر کرتا ہے۔

صاحب خیر المجالس نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ چند قلندر شیخ فریدالدین کی خانقاہ میں ان سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئے شیخ حجرہ کے اندر عبادت میں مشغول تھے درویش (قلندر) ایک گلیم اور سجادہ کے اوپر بیٹھ گئے شیخ بدرالدین اسحاق نے ادب کی وجہ سے قلندروں کو کچھ نہ کہا کھانا لاکر قلندروں کے سامنے رکھ دیا قلندروں نے کھانے سے فراغت کے بعد گھاس نکالی اور اسے کچکول میں رکھ کر خمیر کرنے لگے اسکا شربت شیخ کے سجادہ پر گرنے لگا بدرالدین اسحاق کے منع کرنے پر قلندروں نے ہنگامہ کرنا شروع کردیا اور کچکول بدرالدین کو مارنے کے لئے اٹھالیا شیخ فرید کو نور باطن سے یہ بات معلوم ہوگئی وہ فوراً حجرے سے باہر نکلے اور قلندر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ اسے چھوڑدے قلندروں نے جواب دیا کہ درویش ہاتھ نہیں اٹھاتے ہیں اور اگر اٹھاتے ہیں تو نیچے نہیں لاتے شیخ نے قلندروں سے کچکول دیوار پر مارنے کو کہا قلندر نے کچکول دیوار پر مارا تو دیوار گر گئی[2] پھر شیخ فرید نے

---

[1] فوائدالفواد ص ۲۳۱

[2] خیر المجالس ص ۳۱-۱۳۰

بدرالدین اسحاق کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ کبھی کبھی عام کے لباس میں خاص بھی ہوتے ہیں اور وہ گھاس جنکا وہ خمیر بنارہے تھے وہ بھنگ تھی جو قلندر کھاتے ہیں[1]۔

شیخ بدرالدین اسحاق نے ۶۹۰/۱۲۹۱ میں وفات پائی نظام الدین اولیاء شیخ بدرالدین کی وفات کے وقت انکے پاس موجود تھے فرماتے ہیں کہ جس دن انہوں نے وفات پائی اس روز صبح کی نماز باجماعت ادا کی اور اوراد پورے کئے پھر پوچھا کیا اشراق کا وقت ہے پھر انہوں نے اشراق کی نماز ادا کی پھر اوراد میں مشغول ہوگئے پھر پوچھا کیا چاشت کا وقت ہے پھر انہوں نے چاشت کی نماز ادا کی چاشت کی نماز کے بعد سر سجدہ میں رکھا اور رحمت حق سے پیوست ہوگئے۔ اور اجودھن کی اسی جامع مسجد میں جہاں کافی عرصہ سے مقیم تھے اور یاد حق میں مشغول رہا کرتے تھے دفن کئے گئے[2]۔

صاحب سیرالاولیا کے والد سید مبارک کرمانی شیخ بدرالدین اسحاق کے متعلق کہا کرتے تھے کہ مولانا بدرالدین اسحاق جلتی ہوئی مشعل کے مانند تھے جلد ہی مرتبۂ کمالات کو پہونچے اور جب درجہ کمال پر پہونچے تو جلد ہی حضرت گنجشکر سے جا ملے[3]۔

صاحب سیرالاولیا نے آپ کی ایک تصنیف تصرف بدری کا ذکر کیا ہے جو علم تصریف میں منظوم کتاب تھی[4]۔

۱۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۳۸۷

۲۔ سیرالاولیا ص ۱۸۸

۳۔ ایضاً ص ۱۸۲

۴۔ ایضاً ص ۱۸۲

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی

شیخ بہاء الدین ملتانی کو ہندوستان میں سہروردی سلسلے کے بانی اور اس سلسلے کو نشو و نما دینے والے کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے روایت یہ ہے کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے جد بزرگوار مکہ کے رہنے والے تھے وہاں سے ہجرت کرکے خوارزم آئے پھر خوارزم سے ملتان پہونچے اور وہاں سکونت اختیار کرلی[1] بہاء الدین زکریا کی پیدائش ملتان کے نزدیک ایک چھوٹے سے مقام قلعہ کوٹ کرور میں ۵۶۶/۱۱۷۰ میں واقع ہوئی۔[2] انہوں نے سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا اور جب وہ بارہ برس کی عمر کے تھے تو انکے والد وجیہ الدین بن کمال الدین علی شاہ قریشی نے وفات پائی۔[3] خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے ہی وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے بعد مزید کسب علم کی خاطر خراسان کی طرف روانہ ہوگئے اور وہاں سات برس مقیم رہے اور مختلف شہروں کی گردش کرنے کے بعد بخارا کی جانب روانہ ہوئے۔
بخارا پہونچنے کے بعد یہاں بھی انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا کچھ ہی عرصہ بعد بخارا میں انکی پاکیزگی اور تقوی کے بدولت انہیں بڑی شہرت نصیب ہوئی تھیں وہ زیادہ دنوں تک بخارا میں بھی مقیم نہ رہ سکے حج اور زیارت مدینہ کے شوق میں وہ وہاں سے روانہ ہوکر مدینہ پہونچے جہاں مزار رسول صلعم کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد وہ حج کی غرض سے مکہ کے لئے روانہ ہوگئے، حج سے فراغت

۱۔ سلسلہ عالیہ ص ۸
۲۔ سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۷
۳۔ سیر العارفین قلمی ۱۶

مکہ میں کے بعد بھی تقریباً پانچ سال مقیم رہکر وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کرتے رہے[1] خصوصاً علم حدیث میں اس زمانے کے سب سے بڑے عالم شیخ کمال الدین محمد یمنی سے انہوں نے سند حدیث حاصل کی۔[2] پھر بیت المقدس اور دوسرے شہروں کی زیارت کرتے ہوئے بالآخر بغداد میں وارد ہوئے جہاں شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہکر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کرنے کی غرض سے وہیں رک گئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی نے انکی باطنی تربیت جلد ہی مکمل کرادی اور ان کو خرقۂ خلافت عطا کرتے ہوئے فرمایا

"ای بابا این خرقہ ترا بواسطہ از جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مرحمت شدہ من بمیان بیش از نام واسطہ نیم"[3]

پھر حکم دیا کہ وہ بغداد سے اپنے وطن ملتان واپس چلے جائیں اور ملتان میں انکے خلیفہ کی حیثیت سے اقامت اختیار کریں اور وہاں کے لوگوں کو منزل مقصود تک پہونچائیں۔[4] فرمانبردار مرید نے اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل کی اور ملتان آکر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اسی شہر کو اپنی روحانی سرگرمی کا مرکز بنائے رکھا۔ روایت یہ ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں انکی روحانی تربیت کا عرصہ سترہ[5] دن سے زیادہ نہیں رہا اس پر بغداد میں موجود دوسرے صوفیوں نے جو عرصہ دراز سے امیدوار خلافت تھے شیخ شہاب الدین سہروردی سے شکایت

ع۱ کرامات اولیاء قلمی ۲۹م
ع۲ سیر العارفین قلمی ۱۶
ع۳ سلسلۂ عالیہ ص ۹
ع۴ اسرار الاولیاء ص ۱۸ نیز سیر العارفین قلمی ۱۹

کی کہ ہم آپ کی خدمت میں برسوں سے مقیم ہیں مگر اس نووارد ہندی کو آپ نے اتنے مختصر عرصہ میں خرقۂ خلافت عنایت فرمادیا۔ اسکے جواب میں شیخ شہاب الدین سہروردی کا وہ جملہ مشہور ہے کہ انہوں نے ان صوفیوں کو چوب تر اور بہاءالدین کو چوب خشک سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ :

"شما ہیزم تر آوردہ بودید در ہیزم تر کی باید کہ آتش درگیرد ذکریا ہیزم خشک آوردہ بود بیک نفخ درگرفت"۔ [1]

صاحب آب کوثر نے انوار غوثیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ خواجہ بہاءالدین زکریا نے بلاد اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آنے کے بعد عرصۂ دراز تک صوبہ سرحد کی پہاڑی پر بھی عبادت کی اس پہاڑی کو اب شیخ بوذین (کوہ شیخ بہاءالدین) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے [2] جب بہاءالدین زکریا نے ملتان میں مستقل سکونت اختیار کرلی تو وہاں کے درویشوں کو یہ بات ناگوار گزری انہوں نے سوچا کہ انکی مستقل سکونت کے بعد ہمارے وقار تقدس پر زد پڑ جائیگی چنانچہ وہاں کے علماء کی خواہش ہوئی کہ وہ کسی طرح ملتان چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور یہاں قیام نہ کریں چنانچہ ملتان کے مشائخ نے متفقہ طور پر دودھ سے بھرا ہوا پیالہ آپ کی خدمت میں بھیجا جس سے مراد یہ تھی کہ

ع۱ سیر العارفین قلمی ۱۹

ع۲ انوار غوثیہ بحوالہ آب کوثر ص ۲۵۶

یہ شہر پہلے ہی سے اولیاءاللہ اور مشائخ کی کثرت سے ایسا لبریز ہے جیسا کہ یہ پیالہ دودھ سے لبریز ہے اس کنایہ کا مطلب آپ سمجھ گئے اور آپ نے گلاب کا ایک پھول اس دودھ سے لبریز پیالہ میں رکھ کر پیالہ ان لوگوں کے پاس واپس لوٹا دیا جسکا مطلب یہ تھا کہ میری حیثیت اس شہر میں ایسی ہوگی جیسے کہ گلاب کا پھول دودھ پر۔ درویشوں کو آپ کے اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی اور وہ لوگ آپ کے معتقد ہو گئے۔[ع۱]

شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی نے جلد ہی ملتان میں بڑا اعتبار اور اثر حاصل کر لیا۔ انکی تعلیم اور تلقین سے بہت سے لوگوں نے ہدایت پائی چنانچہ ملتان اور اسکے اطراف کے لوگ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے۔

شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے تعلقات چشتی سلسلے کے صوفیائے کرام میں قطب الدین بختیار کاکی اور فریدالدین گنجشکر سے بہت زیادہ تھے بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہاءالدین زکریا ملتانی اور فریدالدین گنجشکر خالہ زاد بھائی تھے۔[ع۲] بہاءالدین زکریا کو ان سے بیحد محبت تھی اس خلوص و محبت کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے جو بہاءالدین زکریا نے فریدالدین گنجشکر کو کسی بات کی معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا اخبارالاخیار میں ہے کہ آپنے معذرت کے درمیان یہ جملہ لکھا۔

ع۱ اخبارالاخیار ص ۳۲ نیز انوارالعارفین ۳۵۵
ع۲ ایضا ص ۳۲

"میان ما و شما عشق بازی است"

اسکے جواب میں شیخ فریدالدین گنجشکر نے معذرت کا جواب دیتے ہوئے لکھا۔

"میان ما و شما عشق است بازی نیست" ع[1]

شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے قیام ملتان کے ابتدائی زمانے میں ناصرالدین قباچہ[2] وہاں کا صوبیدار تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد جب اسکا غلام شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ ہوا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ملتان میں قباچہ نے بھی خود مختاری کا ارادہ کرلیا جب یہ بات شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اور قاضی ملتان شرف الدین نے دین کی فلاح اسی میں سمجھی کہ قباچہ کی بغاوت کی تیاریوں سے سلطان التمش کو مطلع کردیں چنانچہ ان دونوں نے التمش کے نام خط لکھا۔ اتفاق سے دونوں کے خطوط ناصرالدین قباچہ کے ہاتھ لگ گئے قباچہ کو بہت غصہ آیا اس نے قاضی ملتان شرف الدین کو تو اس جرم میں فوراً قتل کرادیا اور شیخ بہاؤالدین زکریا سے بھی باز پرس کی اور انکو انکا لکھا ہوا خط دکھایا شیخ نے اقرار کرلیا کہ وہ انکا ہی خط ہے اور اس خط میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے[3] شیخ کی اس صاف گوئی کے

ع[1] اخبارالاخیار ص ۴۳

ع[2] ناصرالدین قباچہ سلطان قطب الدین ایبک کا غلام اور داماد تھا سلطان نے اسے سندھ اور ملتان کا صوبیدار مقرر کیا تھا جب سلطان قطب الدین نے وفات پائی تو شمس الدین التمش بادشاہ ہوا ناصرالدین قباچہ نے اسکے خلاف بغاوت کی اور ۶۲۵ میں دریا میں ڈوب کر وفات پائی

ع[3] فوائدالفواد ص ۱۲۰-۱۱۹

باوجود قباچہ انکے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکا[1] کیونکہ ملتان میں اس وقت تک شیخ بہاءالدین زکریا کا بہت زیادہ اثر پھیل چکا تھا قباچہ نے التتمش کے خلاف بغاوت کی اور ناکام ہوا اور تعاقب کے دوران ہی دریائے سندھ میں ڈوب کر مرگیا۔ اچہ پر التتمش کی فوج کشی کا حال اور قباچہ کی شکست کی جملہ تفصیلات عوفی نے اپنی کتاب جوامع الحکایات کے دیباچہ میں نہایت تفصیل سے لکھی ہیں[2]۔ اس واقعہ کے بعد شیخ بہاءالدین زکریا اور شمس الدین التتمش کے درمیان روابط زیادہ گہرے ہوگئے تھے۔ شیخ نجم الدین صغری جو شیخ الاسلامی کے عہدہ پر فائز تھے انکے اور جلال الدین تبریزی کے درمیان کسی بات پر اختلاف

---

[1] سیر الاولیاء ص ۸۹ ھ

[2] قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد جانشینی کے سلسلے میں التتمش اور ناصرالدین قباچہ دو امیدوار تھے دراصل قطب الدین ایبک وفات ناگہانی سے عین جوانی کے عالم میں مرگیا اور کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی اسکی دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک التتمش اور دوسری قباچہ سے منسوب تھیں گویا دونوں حق دامادی کی بنا پر برابری کا دعوی کرتے تھے۔ البتہ علمائے دہلی نے اس موقع پر ایک اصول وضع کیا جس کو عہد سلطنت کی ایک آئینی روایت تصور کرنی چاہئے وہ یہ تھا کہ جو بھی دہلی کا حاکم ہوگا وہ تمام ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا فرمانروا اور سلطان تسلیم کیا جائیگا قطب الدین ایبک کی وفات کے وقت التتمش بدایوں کا حاکم تھا دہلی سے نزدیک ہونے کی بناء پر سلطان کی وفات کی اطلاع سنکر وہ فوراً دہلی آگیا تھا اور علماء نے متفقہ طور پر فوراً اسکو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا تھا لہذا علمائے دہلی کو ناصرالدین قباچہ کا دعوی قبول نہیں تھا قباچہ مرکز سلطنت یعنی دہلی سے دور سندھ کے صوبے میں صوبیدار تھا اور اچہ میں اقامت پذیر تھا۔ شیخ بہاءالدین زکریا اور ملتان کے دیگر علماء وفضلا کی روش اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ وہ علمای دہلی کے نصب العین سے اتفاق کرتے تھے اور علماء کی قائم کی ہوئی آئینی اور دستوری روایت کی پابندی کرتے تھے اور اس پابندی کو برتنے کی خاطر اپنی جان سے بھی بے پرواہ تھے۔

ہو گیا۔ نجم الدین صغری نے جلال الدین تبریزی پر ایک طوائف یا مطربہ سے جسکا نام گوہر
تھا اخلاقی انحراف کا الزام لگوایا۔ بعد میں اس طوائف نے خود ہی اس الزام کو غلط
بتاتے ہوئے کہا کہ نجم الدین صغری نے اسے پانچ سو اشرفی کا لالچ دیکر الزام لگوایا ہے
نجم الدین صغری کا پول کھل جانے کے بعد اس جھوٹے الزام کی سزا میں اسے اپنے عہدہ
شیخ الاسلامی سے ہاتھ دھونا پڑا[1] اور شمس الدین التمش نے شیخ الاسلامی کا عہدہ
بہاء الدین زکریا ملتانی کو سونپ دیا۔[2] شیخ بہاء الدین زکریا شیخ الاسلامی کے لقب
سے ممتاز ہونے کے بعد ہمیشہ اپنے مرکز ملتان میں ہی رہے البتہ انہوں نے ایک سودمند
خدمت خلق خدا کی ضرور انجام دی وہ یہ کہ وہ بحیثیت شیخ الاسلام بے شمار لوگوں کی عرضیاں
قبول کرکے اپنی سفارش کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیجتے تھے اور بادشاہ انکی سفارش دیکھ کر
اہل حاجت کی مشکلات ضرور پوری کردیتا تھا۔ وہ زمانہ تاتاریوں کی خونریزی اور تباہ کاری

ع۱ شیخ بہاء الدین زکریا سے قبل اور انکے بعد تک روایت یہ تھی کہ شیخ الاسلامی کا
عہدہ کسی مستقل ملازمت کے زمرہ میں نہیں آتا تھا جس طرح کہ صدور الصدور یا قاضی القضاۃ
کے عہدے ہوتے تھے شیخ الاسلام در اصل ایک اعزازی لقب یا خطاب ہوتا تھا جو کسی عظیم
دینی شخصیت کو انکے زہد اور پرہیزگاری اور علم وفضل کے اعتراف کی بناء پر بادشاہ کی طرف سے ملتا
تھا۔ البتہ بعض بزرگ جنکو شیخ الاسلام کا لقب ملا انہوں نے اپنے زمانے کے سیاسی معاملات میں
بھی خاصی سرگرمی سے حصہ لیا۔ عام طور پر شیخ الاسلام پر دربار میں حاضری کی پابندی عائد نہیں
ہوتی تھی اور یہ بھی لازم نہیں تھا کہ وہ دارالسلطنت میں یا سلطان وقت کے نزدیک رہے۔
ع۲ سیر العارفین قلمی ۱۴۲

کا تھا ملتان پر بھی تاتاری فوج نے مسلسل حملے کئے لیکن شیخ بہاء الدین زکریا کی موجودگی اہل ملتان کے لئے زبردست برکت ثابت ہوئی وہ کبھی کبھی اپنے پاس سے کثیر رقم دیکر منگولوں کو ملتان پر حملے سے باز رکھتے تھے اور خلق خدا کو کشت وخون سے بچا لیتے تھے ایک بار ۶۴۴/۱۲۴۶ میں منگول سپہ سالار سولی نوین نے کثیر لشکر لیکر ملتان کے شہر کا محاصرہ کر لیا مگر شیخ بہاء الدین زکریا کی کوشش سے شہر غارت ہونے سے بچ گیا۔ اس موقع پر شیخ نے ایک مسلمان امیر ملک شمس الدین کو واسطہ بنا کر جو منگولوں کی فوج میں شامل تھا اور ملک شمس الدین کے واسطے سے ایک بڑی رقم اپنے پاس سے منگولوں کو بطور رشوت دی اور وہ یہ زر فدیہ لیکر واپس چلے گئے۔[1]

سہروردیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے جو انہیں چشتیوں سے جدا اور ممتاز کرتی ہے کہ سہروردی شیوخ مال دنیا کو جمع کرنا اور کثیر تعداد میں نقد وجنس کو اپنے پاس محفوظ رکھنا بری بات نہیں سمجھتے تھے خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کا کہنا تھا کہ "صحبت مار کسی را ضرر کند کہ افسوں مار نداند"[2] اسکے برخلاف چشتی سلسلے کے شیوخ کامل فقر اور ترک وتوکل پر زور دیتے تھے شیخ بہاء الدین زکریا کے بارے میں مشہور ہے کہ انکے پاس ہر وقت گنج وافر طلائی اور نقرئی سکوں کا موجود رہتا تھا اسی طرح وہ غلہ کا بھی زبردست انبار اپنے پاس رکھتے تھے سہروردیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ دولت و اسباب دنیوی جمع کرنا ضروری ہے اسکے بغیر خلق خدا کی

[1] تاریخ نامہ ہرات ص ۱۵۸-۱۵۷ بحوالہ A History of sufism in India v.1 P. 192

[2] لقمار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۱۲۰

ضرورت آخر کیسے کی جا سکتی ہے البتہ تاکید یہ تھی کہ نقد و جنس فیاضی کے ساتھ اہل حاجت
کو تقسیم کرنی چاہیے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ پورے صوبہ پنجاب اور سندھ میں غلہ کی کمی
ہو گئی اور قحط کے آثار نمایاں ہونے لگے ملتان کے صوبیدار نے شیخ بہاء الدین زکریا سے
غلہ طلب کیا اس لئے کہ اسکو بتایا گیا تھا کہ شیخ کی خانقاہ میں غلہ کا انبار موجود ہے
شیخ نے فوراً ہی شاہی ملازموں کو غلے کا انبار لے جانے کی اجازت دیدی غلے کے اندر ایک
کلس نقرئی اور طلائی سکوں کا بھی چلا گیا جو صوبیدار نے آپ کے پاس یہ کہکر واپس بھیج
دیا کہ میں نے آپ سے غلہ طلب کیا تھا تاکہ بازار میں غلہ حسب معمول شرح پر بکتا رہے
آپ نے شاید اشتباہ کے طور پر مجھ کو نقرئی سکے بھیج دئے حکومت کو آپ کے پیسے کی ضرورت
نہیں ہے شیخ نے وہ کلس صوبیدار کو واپس بھیج دیا اور کہلوایا کہ میں نے عمداً آپ کے سپرد
کی ہے[1] مقصد یہ تھا کہ اس رقم کو ان محتاجوں میں تقسیم کر دیا جائے جو غلہ خریدنے کی
استطاعت نہیں رکھتے تھے انکے جود و سخا اور فیاضی کے متعلق سیر العارفین[2] اور خزینۃ الاصفیا[3]
میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ ایک مرتبہ آپکے مریدوں اور عقیدتمندوں کا ایک جہاز غرق ہو رہا تھا
وہ لوگ سخت پریشان تھے اس پریشانی کے عالم میں بہاء الدین زکریا سے مدد مانگی خدا کی قدرت

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۴ - ۲۲۳ - سیر العارفین قلمی ۲۶ میں سات کوزہ کا ذکر ہے

[2] سیر العارفین قلمی ۲۸ - ۲۹

[3] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۵ - ۲۴

سے جہاز غرق ہونے سے بچ گیا اس جہاز میں کچھ تاجر بھی سوار تھے جب یہ لوگ صحیح سلامت ساحل پر پہونچے تو سبھی نے مال کا ایک تہائی حصہ خواجہ فرید الدین گیلانی کے موفت بہاء الدین زکریا کی خدمت میں بھیجا اس رقم کی تعداد سترلاکھ تنکے تھی آپ نے یہ رقم وصول کرنے کے بعد صرف تین دنوں کے اندر فقرا اور مساکین میں تقسیم کردی ۔

بہاء الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں جن عظیم شخصیتوں کی تربیت ہوئی ان میں فارسی ادب کے مشہور صوفی شاعر شیخ فخر الدین عراقی کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے تصوف کی شاعری شیخ عراقی کے وقت سے نیا عروج اور نئی فکری بلندی حاصل کرتی ہے دوسری بات یہ ہے کہ عراقی کو تاریخ اسلام کی ایک زبردست شخصیت تسلیم کیا ہے آپ عراقی کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے وہ اصلاً ایک قلندرانہ مزاج رکھتا تھا اور ایک واقعی قلندر کی ذات میں جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ عراقی کی ذات میں بتمام وکمال موجود تھیں ایک تو قلندر کسی مقام کو اپنا گھر نہیں سمجھتا اور کسی ایک مقام پر مستقل سکونت اختیار کرکے نہیں رہتا دوسرے یہ کہ اسکی طبیعت میں ایک ایسی سیمابی کیفیت اور اس قدر شدید بیقراری کا انداز ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مفصل ضابطے کو اپنے اوپر مسلط نہیں ہونے دیتا اسکے باوجود قلندر طبقہ کے لوگ اسلامی تصوف کا ایک رنگین اور دلچسپ عنصر ہیں اور انہوں نے

تصوف کی تحریک کو آگے بڑھانے اور مقبول کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ عراقی کے بارے میں روایت یہ ہے جو اگرچہ بہت بعد کے مآخذ میں آتی ہے یعنی ابوالقاسم فرشتہ[۱] نے بیان کی ہے اور اسکی تردید بھی نہیں کی جاسکتی کہ عراقی بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں سلوک کی تربیت کی غرض سے داخل کیا گیا وہاں وہ بغداد کے بازار میں کسی نعل بند کے لڑکے کو دیکھ کر اسکے حسن صوری سے متاثر ہوگیا جب شیخ کو یہ خبر ملی تو اس نے عراقی کو بلایا اور شدت سے اسکی مذمت کی شیخ نے کہا "آتش در کارخانۂ ناموس درویشاں می زنی" اور یہ کہکر عراقی کو ملتان روانہ کردیا جہاں انکے خلیفہ بہاؤالدین زکریا اقامت پذیر تھے ساتھ ہی عراقی کے مزاج اور اسکی وارفتہ کیفیت کے بارے میں بھی اپنے خلیفہ کو اطلاع کردی ملتان میں شیخ بہاء الدین زکریا نے عراقی کو ایک چلہ کھینچنے کی ہدایت کی چلّہ کے دن پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ مریدوں نے شیخ سے یہ شکایت کی کہ عراقی اکثر چلّے سے اٹھکر بازاروں میں بے پروا گھومتا ہے۔ ایک دوسرا مرید یہ خبر لایا کہ بازار میں ایک میخانے کے اندر شراب کے متوالے عراقی کی غزل گارہے تھے شیخ بہاءالدین زکریا نے عراقی کو بلوا کر احوال پوچھا۔ ضمناً اس غزل کے بارے میں بھی دریافت کیا اور اسے سنانے کی فرمائش کی جو ملتان کے بازاروں میں مشہور ہو چکی تھی عراقی نے شیخ کے ارشاد

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۵

کی تعمیل میں وہ غزل سنائی جب مقطع پر پہونچا تو شیخ نے اسے گلے سے لگا لیا اور

حاضرین کے سامنے کہا کہ کار او تمام شد :

نخستین بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند

چوں خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند [۱]

اسکے بعد شیخ نے عراقی کا نکاح اپنی بیٹی سے کردیا اور خرقۂ خلافت بھی عطا کیا۔ عراقی ملتان

میں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہرا اور جیسا کہ قلندروں کا دستور ہے وہ ہندوستان سے گذر کر حجاز

اور وہاں سے مصر کی طرف نکل گیا۔

شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں قلندروں اور دوسرے آزاد

مشرب صوفیوں کا زبردست اجتماع رہتا حالانکہ شیخ بہاءالدین اس طبقہ کے لوگوں سے سخت

ناراض اور آزردہ رہتے تھے۔ خراسان اور وسط ایشیا سے آنے والے صوفی و ارباب علم و کمال

جو دہلی کو منزل مقصود بناکر گھر سے چلتے تھے انکا قیام ملتان میں شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی

کی خانقاہ میں تھوڑے یا بہت دنوں کے لئے ضرور رہتا۔ انکی مہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ

مسافروں مہمانوں اور درویشوں کے ساتھ ملکر کھانا کھاتے انکی خانقاہ میں آنے والا کوئی بھی شخص

کبھی بھی بغیر کھائے واپس نہ جاتا [۲] اور اگر کسی دن کوئی درویش انکی خانقاہ میں ...

---

[۱] مجالس العشاق ص

[۲] سیر الاولیا ص ۷۰

آتا تو فرماتے کہ آج مجھ سے نعمت چھین لی گئی ہے [1] شیخ بہاؤالدین زکریا کی زندگی میں اور انکے بعد بھی ملتان کی خانقاہ عالم اسلامی دنیا میں شہرت پا چکی تھی اور اسکو تصوف کے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا تھا۔

سہروردی سلسلے کے معمول کے مطابق خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی سماع کے دلدادہ تو نہ تھے البتہ انکے ایک بار سماع سننے کا ذکر فوائدالفواد [2] اور سیرالعارفین [3] میں ملتا ہے۔ ایک مرتبہ عبداللہ نامی ایک قوال انکی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے اسکا گانا شوق سے سنا ہے بہاؤالدین زکریا نے فرمایا کہ اگر شیخ نے تمہارا گانا سنا ہے تو میں بھی سنونگا۔ چنانچہ آپنے بعد نماز عشاء عبداللہ اور اسکے ساتھیوں کو اپنے حجرہ میں بلایا اور اس سے کچھ سنانے کی فرمائش کی اس نے غزل گانی شروع کی اور اس شعر کو

مستان کہ شراب ناب خوردند　　　از پہلوی خود کباب کردند

بار بار پڑھا۔ اسکے ایسا کرنے سے شیخ بہاؤالدین پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور آپ نے حجرہ کا چراغ گل کردیا عبداللہ قوال کا کہنا ہے کہ اسے اندھیرے کی وجہ سے کچھ نہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ پر کیا کیفیت گذر رہی ہے صرف اتنا نظر آتا تھا کہ شیخ گردش کر رہے ہیں

ع[1] سیرالعارفین ص ۶۸

ع[2] فوائدالفواد ص ۱۳۷

ع[3] سیرالعارفین قلمی ۲۶ - ۲۷

صبح کے وقت آپ نے عبداللہ اور اسکے ساتھیوں کے لئے بیس نقرئی تنکے اور خلعت بھجوایا۔

شیخ بہاءالدین زکریا نے ملتان ہی میں وفات پائی انکی وفات کے سلسلے

میں بڑا اختلاف ہے، صاحب اخبار الاخیار اور کرامات اولیاء نے ۶۶۱/۱۲۶۲[1] صاحب مراۃ الاسرار نے ۶۶۵/۱۲۶۶[2] اور صاحب تاریخ فرشتہ اور سفینۃ الاولیاء نے ۶۶۶/۱۲۶۷[3] لکھی ہے۔ انکی وفات کا واقعہ

بھی عجیب وغریب ہے جسے نظام الدین اولیاء نے فوائدالفواد میں بیان کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ

ایک دن ایک مرید نے ایک خط لاکر آپ کے صاحبزادے اور خلیفہ شیخ صدرالدین کے حوالے کیا اور

کہا کہ ایک شخص نے اس خط کو بہاءالدین زکریا کے پاس پہونچانے کی تاکید کی ہے جب صدرالدین نے پتہ دیکھا

تو انکا رنگ متغیر ہوگیا انہوں نے وہ خط لیجاکر بہاءالدین زکریا کے حوالے کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب

بہاءالدین زکریا نے اس خط کو پڑھا تو کروٹ لیتے ہی لیتے اپنے جسم کو مروڑا اور بلند آواز سے

اللہ اللہ کرنے لگے اور پھر اسی رات وفات پاگئے[4] راحت القلوب میں ہے کہ جس وقت بہاءالدین زکریا

نے وفات پائی اس وقت فریدالدین گنجشکر اجودھن میں مقیم تھے وہ بیہوش ہوگئے اور جب ہوش میں آئے تو فرمایا

"برادرم بہاءالدین زکریا را ازیں بیابان فنا بشہرستان بقا بردند"

اسکے بعد انہوں نے وہیں اپنے مریدوں کے ساتھ بہاءالدین زکریا کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

۱۔ اخبارالاخیار ص ۴۴

۲۔ مراۃ الاسرار قلمی ۱۹۳

۳۔ تاریخ فرشتہ ۲ ص ۴۰۹

۴۔ فوائدالفواد ص ۲۲۱ سیرالعارفین قلمی ۳۹

شیخ جلال الدین تبریزی

شیخ جلال الدین تبریزی دوسرے عظیم المرتب اور معروف صوفی ہیں جنکا ذکر شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء کے ردیف میں کیا جاتا ہے آپ پہلے شیخ ابو سعید تبریزی کے مرید ہوئے[1] جب شیخ ابو سعید تبریزی نے وفات پائی تو آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں آکر رہنے لگے[2] وہ پہلے صوفی ہیں جنہوں نے اپنی روحانی سرگرمی کا مرکز بنگال کو قرار دیا۔ ابتدائی زندگی میں وہ بغداد سے لیکر بخارا تک تقریباً سارے ہی اہم علمی اور روحانی مرکزوں میں استفادہ علمی کے خاطر گھومتے رہے اور ہر جگہ دلچسپی سے تعلیم حاصل کی۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں آنے کے بعد انہوں نے اپنے مرشد کی اس طرح خدمت کی کہ شاید کسی دوسرے نے نہ کی ہو[3] چنانچہ خود شیخ شہاب الدین سہروردی انکے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ میری خدمت انجام دینے میں جلال الدین تبریزی میرے دوسرے مریدوں سے زیادہ بڑھ گئے۔ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آخری عمر میں ہمیشہ حج کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ زود ہضم اور گرم غذا کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں کھاتے تھے ایسی حالت میں شیخ جلال الدین تبریزی

۱؎ فوائد الفواد ص ۱۰۰

۲؎ ایضاً ص ۱۸۰ نیز

۳؎ کرامات اولیا قلمی ۲۹۰۔

مسافرت میں ہر وقت انگیٹھی اور دیگچی سر پر لئے رہتے تھے تاکہ جس وقت مرشد کو ضرورت ہو وہ فوراً گرم کھانا پیش کرسکیں۔[1] وہ بچپن کا عرصہ ختم ہوتے ہی بالکل آغاز جوانی میں اپنے وطن تبریز سے مہاجرت کرکے بغداد چلے آئے تھے اسکے بعد جب تک وہ بغداد میں رہے تقریباً ہر سال حج کی غرض سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ضرور تشریف لے جاتے تھے جہاں وہ حج سے فراغت کے بعد کچھ دنوں قیام کرتے۔ وہ تقریباً سات سال تک بغداد میں اپنے شیخ کی خدمت میں رہے یہیں انکی ملاقات شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی سے ہوئی۔ چند ہی دنوں کے قیام میں ان دونوں کے درمیان بیحد محبت ہوگئی جب بہاءالدین زکریا ہندوستان آنے لگے تو انتہای محبت میں وہ بھی شیخ سے اجازت لیکر انکے ساتھ ہی ہندوستان کے لئے روانہ ہوگئے۔ نیشاپور میں انکی ملاقات وہاں کے مشہور شاعر اور عارف شیخ فریدالدین عطار سے ہوئی اور یہی ملاقات ان دونوں پیر بھائیوں کے درمیان اختلاف اور جدائی کا سبب بنی۔

روایت یہ ہے کہ بہاءالدین زکریا ملتانی اور جلال الدین تبریزی دونوں ہمسفر تھے جب بھی یہ دونوں حضرات کسی شہر میں پہونچتے تو بہاءالدین زکریا شہر سے باہر ہی کسی جگہ عبادت میں مصروف ہوجاتے اور جلال الدین تبریزی شہر میں جاکر وہاں کے درویشوں کے متعلق دریافت کرتے اور پھر ان سے ملاقات بھی کرتے۔ چنانچہ جب جلال الدین تبریزی

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۸۱

کی ملاقات فریدالدین عطار سے ہوئی تو جلال الدین تبریزی کے دل پر انکی روحانیت کا زبردست اثر ہوا ملاقات سے واپسی کے بعد انہوں نے اس ملاقات کا ذکر بہاءالدین زکریا سے کیا اور کہا کہ آج میں نے ایک ایسا شہباز دیکھا کہ جسے دیکھتے ہی میں سب کچھ بھول گیا بلکہ اپنا مرشد بھی یاد نہ رہا بہاءالدین کو اپنے مرشد کے متعلق یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے جلال الدین تبریزی سے علحدگی اختیار کرلی۔[1] اسکے بعد جلال الدین تبریزی اکیلے ہی نیشاپور سے مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ملتان پہونچے ملتان میں بھی انہوں نے کچھ زیادہ عرصہ قیام نہیں کیا اور دہلی کے لئے روانہ ہوگئے جب وہ اجودھن پہونچے تو لوگوں نے انکو وہاں کے مشہور صوفی اور بزرگ خواجہ فریدالدین مسعود کے متعلق بتایا جو الجھی بچے تھے اور یاد خدا کثرت سے کرتے تھے آپ فریدالدین سے ملاقات کے لئے روانہ ہوئے راستہ میں کسی شخص نے آپ کو ایک انار پیش کیا وہ انار لئے ہوئے فریدالدین کے پاس پہونچے اور وہ انار انہیں پیش کیا فریدالدین روزے سے تھے اس لئے انہوں نے انار کے دانے لوگوں میں تقسیم کردئے۔ انار کا ایک دانہ زمین پر گر گیا تھا جسے اٹھاکر فریدالدین نے رکھ لیا اور شام کے وقت اسی دانے سے روزہ افطار کیا اسے کھاتے ہی آپ کی طبیعت میں انشراح اور دل میں روشنی پیدا ہوگئی۔[2] بعد میں آپ کو اس بات کا بڑا افسوس رہا کہ

---

[1] اخبارالاخیار ص ۵۱ نیز مراۃ الاسرار قلمی ۱۹۷

[2] ایضاً ص ۵۱

کیوں نہ آپ نے زیادہ دانے کھائے جب فرید الدین گنجشکر جوان ہونے پر قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے اور اپنے پیرو مرشد کے پاس دہلی تشریف لے گئے تو آپ کے مرشد قطب الدین بختیار کاکی نے کہا "مسعود جو انار کا دانہ تیری قسمت کا تھا تجھ کو مل گیا خاطر جمع رکھو۔"[1]

جس وقت شیخ جلال الدین تبریزی دہلی پہونچے اسوقت سلطان شمس الدین دہلی کے تخت پر فائز تھا۔ سلطان آپ کی دہلی میں آنے کی خبر سنکر استقبال کے لئے نکلا اور دور تک گیا۔ اس نے شیخ جلال الدین تبریزی کا بڑا احترام کیا اور ان سے ملکر بجد خوش ہوا مگر دہلی کے بعض علماء کو یہ بات پسند نہ آئی۔ سلطان التمش نے شیخ الاسلام نجم الدین صغری سے کہا کہ جلال الدین تبریزی کے لئے ایک مناسب سا گھر سلطان کے محل کے نزدیک ہی متعین کردیا جائے کہا جاتا ہے شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے جو نووارد صوفی شیخ جلال الدین تبریزی کو اپنا حریف سمجھ بیٹھے تھے انکے لئے ایک ایسے گھر کا انتخاب کیا جو شہر میں بیت الجن کے نام سے مشہور تھا اور لوگ اس مکان میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے شیخ الاسلام کی دلیل یہ تھی کہ اگر تبریز کا یہ نووارد صوفی واقعی اہل دل اور صاحب حال ہے تو جنات اسکو نقصان نہ پہونچا سکینگے ورنہ اسکی اصلیت واضح ہوجائیگی

---

[1] خیر المجالس ص ۲۲۰

شیخ جلال الدین تبریزی بے کھٹکے اس مکان میں جاکر رہنے لگے اور انکو وہاں کسی قسم کا حادثہ نہ پیش آیا۔ دریافت کرنے پر انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جس وقت میں اس مکان میں داخل ہوا اور محض دہلیز پر میں نے قدم رکھا اسی وقت جنات نے اس مکان کو چھوڑ دیا۔[۱] اس واقعہ کے بعد سے پورے دہلی میں آپ کی شہرت ہوگئی یہیں آپ کی ملاقات بارہا قطب الدین بختیار کاکی سے بھی ہوئی۔

شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے آپ کا اقتدار کم کرنے کے لئے مختلف کوششیں کیں انہوں نے گوہر نامی ایک طوائف کو بھی لالچ دیکر اس بات کے لئے تیار کیا کہ وہ جلال الدین تبریزی پر اخلاقی انحراف کا الزام لگائے جب سلطان التمش کے پاس یہ مقدمہ پہونچا تو اس نے دہلی کے تمام مشائخ اور اولیاء کو جمع کیا تاکہ اس واقعہ کی تحقیق کرکے جرم ثابت ہوجانے پر سزا دی جائے نجم الدین صغری کو بادشاہ کی طرف سے یہ اختیار دیدیا گیا کہ وہ جسے چاہیں ثالث بنالیں۔ نجم الدین صغری کو جلال الدین تبریزی اور بہاءالدین زکریا ملتانی کے درمیان کشیدگی کے متعلق اطلاع تھی چنانچہ اس نے اس کشیدگی سے فائدہ اٹھانا چاہا اس لئے بہاءالدین زکریا کو ثالث بنایا لیکن جب مجلس میں جلال الدین تبریزی تشریف لائے تو بہاءالدین زکریا کھڑے ہوگئے اور انکی بڑی

---

۱ کرامات اولیاء قلمی ص ۲۹۱

عزت کی اور انکے جوتے اپنے ہاتھ میں اٹھالئے۔ طوائف یا مطربہ گوہر نے بھی سازش کا پورا حال بیان کردیا چنانچہ فیصلہ جلال الدین تبریزی کے حق میں ہوا اور اس جرم کی سزا کے طور پر سلطان شمس الدین التمش نے نجم الدین صغری کو شیخ الاسلامی کے عہدہ سے معزول کرکے بہاء الدین زکریا کو انکی جگہ شیخ الاسلام مقرر کیا۔[۱]

شیخ جلال الدین تبریزی دہلی کی صورتحال سے دلبرداشتہ ہوکر بدایوں کے لئے روانہ ہوگئے جب دہلی سے جانے لگے تو فرمایا "من درین شہر آمدم زر صرف بودہ ام این زمان نقرہ ام با بشتر چہ خواہد شد"[۲] بدایوں میں انہوں نے ایک ہندو کو اپنی کرامت سے اسلام کی طرف مائل کیا جو عرصہ تک ایک مشہور واقعہ بنا رہا اور مدتوں تک اس بات کا چرچا لوگوں کی زبان پر رہا۔ ہوا یہ کہ ایک دن شیخ جلال الدین تبریزی گھر سے باہر بیٹھے ہوئے تھے۔ انکے سامنے سے ایک دہی بیچنے والا گذرا جو موضع کیتھر سے دہی بیکر شہر میں بیچنے آیا تھا۔ وہ شخص دراصل اس علاقے کا ایک زبردست ڈاکو تھا اور نواح کے لوگ اسکے نام سے تھراتے تھے جیسے ہی شیخ کی نظر اس پر پڑی اور اس نے شیخ کی طرف نظر ملاکر دیکھا فوراً اسکے دل میں ایک زبردست تبدیلی واقع ہوئی اور وہ اس قدر متاثر ہوا کہ نزدیک آکر آپ کے قدموں میں گر گیا۔ شیخ نے اس کو مسلمان کرلیا اور

۱؎ مراۃ الاسرار قلمی ۱۹۸

۲؎ فوائد الفواد ص ۱۱۳

اسکا نام علی رکھا اس نے اپنی تمام گذشتہ عادتوں کو بدل ڈالا اور توبہ کرنے کے بعد شیخ کا انتہائی فرمانبردار خادم اور ایک سچا انسان بن گیا اور اپنی پاکیزگی اور تقوی کے بدولت پورے علاقے میں علی مولی کے نام سے مشہور ہو گیا[۱] بدایوں میں کچھ دنوں تک قیام کے بعد شیخ جلال الدین تبریزی لکھنوتی بنگال کی طرف روانہ ہوئے تو علی مولی نے بھی آپ کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا مگر شیخ نے انکو بدایوں میں ہی ٹھہرنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ اس شہر کی ہدایت تمہارے ذمہ ہے[۲]

شیخ جلال الدین تبریزی کے بدایوں میں قیام کا ہی ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپنے مولانا علاء الدین اصولی کو جو اس وقت کم عمر تھے ایک کوچے میں پھرتے دیکھا آپنے انہیں اپنے پاس بلایا اور اپنا لباس اتار کر انہیں پہنایا کہا جاتا ہے کہ اس لباس کی ہی برکت سے مولانا علاء الدین اصولی کے اندر اخلاق حمیدہ اور اوصاف ستودہ پیدا ہوئے[۳] اور مولانا بعد میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے استاد بھی ہوئے۔ شیخ بنگال میں سب سے پہلے لکھنوتی کے شہر میں جا کر رہے جہاں مخلوق خدا جوق در جوق آپکی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئی لکھنوتی بلبن کے زمانے میں اور اسکے بہت بعد تک بنگال کا ایک صوبائی مرکز تھا وہاں

---

۱ فوائد الفواد ص ۱۳۲ -

۲ ایضا ص ۱۳۲ نیز مراۃ الاسرار قلمی ص ۱۶۵

۳ ایضا ص ۱۶۵

جلال الدین تبریزی نے ایک خانقاہ تعمیر کی اور اس سے ملحق ایک لنگر خانہ قائم کیا

شیخ جلال الدین تبریزی نے سہروردی درویشوں کی روایت کے مطابق خانقاہ کے نزدیک

تھوڑی سی زمین اور باغات خریدے تاکہ اسکی آمدنی سے خانقاہ کے مصارف کی کفالت کی

جا سکے۔ کچھ دنوں بعد وہ لکھنوتی سے ایک دوسرے مقام یعنی دیوتلہ یا دیو محل چلے گئے[1]

جو کہ شمالی بنگال کے شہر پانڈوہ کے نزدیک واقع ہوا تھا۔ وہاں پر معاصر روایتوں کے

مطابق ایک کافر نے ایک بڑا بت خانہ اور تالاب بنا رکھا تھا شیخ نے وہاں پہونچکر اس

مندر کو منہدم کیا اور بہت سے کافروں کو مشرف بہ اسلام کیا۔[2] اندازہ ہے کہ وہ شخص

جس نے وہ مندر بنوایا تھا اور جسے کافر کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے کوئی ہندو یا بیشتر

امکان ہے کہ بدھ مذہب کا بھکشو تھا۔ جلال الدین تبریزی عام خلق خدا خصوصاً غریبوں

اور محتاجوں کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے انہیں اپنے لنگر خانے سے کھانا

کھلاتے تھے اور انکی مالی امداد بھی کرتے تھے اس وجہ سے وہ دیوتلہ کے نواح میں وہاں

کے تمام غیر مسلم اور مسلمان عوام کے درمیان ایک محبوب شخصیت بن گئے۔ شیخ تبریزی کے

اخلاق کا اثر غیر مسلم عوام پر خصوصاً نچلے طبقہ کے لوگوں پر بہت گہرا ہوا اور وہ

بڑی تعداد میں اسلام کی طرف مائل ہو گئے عوام کے دل میں انکی عقیدت اور محبت اس

---

[1] A History of Sufism in India V.1 P 201

[2] مراۃ الاسرار قلمی ۱۹۸

قدر بڑھی کہ دیوتلہ جہاں پر شیخ نے مسکن بنایا تھا وہ بعد میں تبریز آباد کے نام سے
مشہور ہو گیا اور وہاں شیخ کی زیارت کے مشتاق دور دور سے آنے لگے مشہور سیاح
ابن بطوطہ نے[1] اپنے سفرنامہ 'کتاب الرحلہ' میں شیخ جلال الدین تبریزی سے ملاقات کا
حال بیان کیا ہے ابن بطوطہ نے یہ سفر ۷۴۶/۱۳۴۵ میں کیا جبکہ صاحب سیر العارفین[2] اور صاحب
تذکرہ مشائخ ہند[3] نے جلال الدین تبریزی کی وفات کا سال ۶۴۲/۱۲۴۴ لکھا ہے بعد کے
دانشوروں کا قیاس ہے کہ ابن بطوطہ کی ملاقات جلال الدین سلہٹی سے ہوئی ہوگی لیکن
جلال الدین سلہٹی نے بھی ۷۴۰/۱۳۴۰ میں وفات پائی آپ کی تاریخ وصال
"شاہ جلال مجرد قطب بود" سے نکلتی ہے اس لئے ان سے بھی ملاقات کا قیاس صحیح نہیں
شیخ جلال الدین تبریزی کو بنگال میں زبردست کامیابی اور شہرت نصیب ہوئی البتہ یہ
عجیب بات ہے کہ انکے بنگالی خلفاء کے بارے میں معلومات بہت زیادہ نہیں ملتیں نظام الدین
اولیاء کا بھی بیان ہے کہ جلال الدین تبریزی بہت کم کسی کو مرید کیا کرتے تھے[4] انکی
اس قدر عظمت اور اہمیت کے باوجود انکے مزار کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ
انکا مزار کس جگہ واقع ہے؟ صاحب آئین اکبری[5] لکھتے ہیں "خوابگاہ جلال الدین تبریزی در بندر دیوحل است"

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ اردو ترجمہ کتاب الرحلہ ج ۲ ص ۷۵۲ حالانکہ اس سے قبل وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ انہوں نے وفات سے قبل اپنے سب دوستوں کو بلا کر اپنی نصیحت کی پوری مدت لکھے ممکن ہے

[2] سیر العارفین

[3] تذکرہ مشائخ ہند قدیم ص ۱۲۱

[4] فوائد الفواد ص ۳۳

[5] آئین اکبری ج ۳ ص ۱۷۰

سید نورالدین مبارک غزنوی

سید نورالدین مبارک بن عبداللہ حسینی کا نام بھی شیخ شہاب الدین سہروردی

کے مشہور اور اہم خلفاء کی ردیف میں لیا جاتا ہے وہ غزنی میں پیدا ہوئے روایت یہ ہے کہ

انکی پیدائش کے بعد انکے والد اپنے نومولود بچے کو طلب دعاء کے لئے وہاں کے ایک عالم

خواجہ اجل شیرازی کے پاس لے گئے اور خواجہ مذکور کی دعاء کے بدولت ہی وہ بعد میں ایک

بڑے عارف اور اہل دل بن گئے واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ خواجہ اجل شیرازی کا

ایک مرید سوداگر تھا ایک دن جب وہ شیخ کے پاس پہونچا تو عرض کیا کہ میرے گھر ایک

لڑکا پیدا ہوا ہے جو آپ کا غلام زادہ ہے اسے فیض نعمت پہونچائیے شیخ اجل شیرازی

نے فرمایا کہ کل جب میں نماز فجر سے فارغ ہو جاؤں تو تم اپنے اس بچے کو لاکر میرے داہنے

جانب سے پیش کرنا اسی دن نورالدین مبارک غزنوی بھی پیدا ہوئے تھے آپ کے والد بھی

اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے بھی سوچا کہ میں بھی اپنے بچے کو شیخ کی خدمت میں

لاؤنگا دوسرے دن تاجر کو آنے میں ذرا دیر ہوگئی لیکن نورالدین مبارک غزنوی کے والد

نماز فجر کے فوراً بعد اپنے بچے کو لیکر شیخ اجل شیرازی کے پاس پہونچے اور شیخ کے بتائے

ہوئے طریقے کے مطابق ان کے سامنے کر دیا شیخ نے ان پر نظر کرم فرمائی کچھ دیر بعد جب

وہ تاجر آیا تو خواجہ اجل شیرازی نے اس سے فرمایا کہ یہ نعمت تو سید زادے کی قسمت میں تھی جو اسے مل گئی[ع۱]

سید نور الدین مبارک غزنوی نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں شیخ عبدالواحد بن شہاب احمد غزنوی سے حاصل کی پھر مزید تعلیم کے لئے وہ بغداد پہونچے اور وہاں شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا[۲] خزینۃ الاصفیاء[ع۳] میں ہے کہ اکثر سلطان شہاب الدین غوری میدان جنگ میں جانے سے قبل ان سے دعاء کا طالب ہوتا۔ انکی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں لیکن جب وہ دہلی میں وارد ہوئے تو انکا عالم شباب تھا اور دہلی کے تخت سلطنت پر سلطان شمس الدین التمش جلوہ افروز تھا سلطان نے انکی بڑی عزت کی اور ان کو شیخ الاسلام کا لقب عنایت کیا اور دار السلطنت کے لوگ انہیں میر دہلی کہکر خطاب کرنے لگے[ع۴] غالباً وہ شیخ الاسلام اور ایک خدا رسیدہ بزرگ ہونے کی وجہ سے سلطان شمس الدین التمش کی خلوت و جلوت میں برابر ساتھ رہا کرتے تھے انکے سلطان التمش کے ساتھ خرم گاہ میں بیٹھنے کا ایک واقعہ فوائد الفواد[ع۵] میں بھی ملتا ہے انکی بزرگی اور مرتبے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک مرتبہ لوگوں

ع۱ خیر المجالس ص ۲۲۵-۲۶ نیز مراۃ الاسرار قلمی ۱۸۲

ع۲ خزینۃ الاصفیاء ص ۱۷

ع۳-۴ الضاً ص ۱۲

ع۵ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۹۳

نے نظام الدین ابوالمؤید سے بارش کے لئے دعاء کی درخواست کی تو وہ نورالدین مبارک غزنوی

کے مزار پر گئے اور کہا کہ لوگوں نے مجھے بارش کے لئے دعاء کرنے کو کہا ہے آپ کو مجھ سے

صدمہ پہونچا ہے اگر آپ راضی ہیں تو میں دعاء کروں ورنہ نہیں نورالدین مبارک غزنوی کے

روضہ سے آواز آئی کہ میں تم سے راضی ہوگیا ہوں جاؤ اور بارش کے لئے دعاء کرو معاملہ یہ

تھا کہ ایک مرتبہ نظام الدین ابوالمؤید اور سید نورالدین مبارک غزنوی کے درمیان سلطان

التمش کے یہاں آگے اور پیچھے بیٹھنے پر جھگڑا ہوگیا تھا۔[۱]

ضیاءالدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے کہ انکے خطبات

نہایت دلنشین ہوتے تھے وہ اکثر بے باکی کے ساتھ بڑے بڑے امراء کی موجودگی میں شاہی دربار

کے تمام آداب و رسوم پر بڑی جرأت اور بے باکی سے تنقید کرتے اور کہتے کہ سلطنت دہلی کی

ساری رسمیں غیر اسلامی ہیں اور یہ ایران کے ساسانی بادشاہوں کا ترکہ ہیں جو کہ ایک

طریقے سے اسلامی سلطنت کا کھلا ہوا انحراف ہے۔[۲] وہ معرفت کے اعلیٰ منصب پر فائز

ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی مفکر بھی تھے وہ اس عقیدے کے قائل تھے کہ بادشاہ کے

لئے دین کی حفاظت یعنی دین پناہی ایک فریضہ ہے اور اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے

چار اصول لازم ہیں جو سلاطین ان چار شرطوں کی پابندی کرینگے وہ قیامت کے دن

۱۔ فوائدالفواد ص ۹۳-۱۹۲ نیز اخبارالاخیار ص ۳۵-۲۴

۲۔ تاریخ فیروز شاہی ص ۴۹-۵۲

سرخرو ہونگے اور ثواب حاصل کرینگے اور جن سلاطین نے ان چار شرطوں سے لاپرواہی برتی وہ قیامت کے دن گنہگار قرار دئے جائینگے انکے چار اصول یعنی ارکان دین پناہی اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہیں ہے

(۱) سلاطین کو اسلامی رسوم کے فروغ کی کوشش کرنی چاہئے شریعت کے احکام کا نفاذ باقاعدگی سے کرنا چاہئے شریعت نے جن امور کو نواہی کے زمرہ میں رکھا ہے انکی روک ٹوک بہت شدت سے ہونی چاہئے کفر و شرک کو مٹانے میں ساری طاقت صرف کرنی چاہئے اگر حکومت کے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ کفر و شرک کو مکمل طور سے مٹا سکے تو کم از کم کفر کو ذلیل کرکے رکھنا حکومت کے لئے لازمی ہے ۔

(۲) مسلمان حاکموں کے لئے لازم ہے کہ انکے زیر تسلط شہروں میں فحاشی شراب خوری زنا کاری اور دوسرے مخرب اخلاق افعال کا ارتکاب ہرگز نہ ہو اس قسم کے افعال میں ملوث لوگوں کو سختی سے سزائیں دی جائیں اگر طوائفیں اور زنان فاحشہ اپنے پیشے کو قطعی طور پر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں تو انکو اپنا کاروبار نہایت خفیہ طور پر کرنا چاہئے انکا خیال تھا کہ طوائفوں کا پیشہ مکمل طور سے نہیں رکنا چاہئے اگر زنان بازاری کو خلاف قانون قرار دیدیا گیا تو لوگ شریف عورتوں پر دست درازی کرینگے اور زنا بالجبر

ہے

کے واقعات کثرت سے ہونے لگیں گے ۔

(۳) شریعت کے نفاذ کا فریضہ پاک سیرت اور خدا ترس حکام کے سپرد ہونا چاہئے اور حکومت نوکریاں دیتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ جس آدمی کو ذمہ داری تفویض کی جائے وہ سیرت اور چال چلن کے اعتبار سے نیک اور صالح انسان ہو حکومت کے افسران کو شریعت اور طریقت سے کما حقہٗ آگاہی ہونی چاہئے کوئی بھی ناقابل اعتبار اور فساد پرست آدمی حکومت کی ذمہ داری کا اہل نہیں ہوتا اور ایسے آدمی کو حکومت کے ہر شعبہ سے دور رکھنا چاہئے ۔ فلسفیوں[1] کو اسلامی سلطنت کی حدود سے نکال دینا چاہئے اور فلسفہ کی تعلیم پر سخت پابندی لگائی جانی چاہئے ۔

(۴) سلطان کو سختی کے ساتھ عدل پر کاربند ہونا چاہئے مگر سلطان عادل کے احکامات کا نفاذ اسی وقت ممکن ہے جب اسکا خوف لوگوں کے دلوں پر چھایا رہے اور وہ اسکے لئے ہمیشہ اپنی شمشیر سے ظالموں کا صفایا کرتا رہے اور اسکے ساتھ ساتھ مشرکین ملحدین اور بد باطن افراد کی بھی سختی سے خبر لی جائے ۔[1]

سید نورالدین مبارک غزنوی کے مندرجہ بالا چار اصول سلطنت اور سلطان کے تحفظ کی ضمانت ہیں اگر ان اصولوں سے ذرا بھی انحراف کیا گیا تو محض عبادت

A History of Sufism in India V.I P 194-95 [1]

اور ریاضت حتی کہ خلق خدا کے ساتھ عمل خیر بھی سلطان کے کام نہ آسکے گا اور اسکو تخت سلطنت پر اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہو سکے گا۔

سید نورالدین مبارک غزنوی نے ۶۳۴/۱۲۳۸ء میں وفات پائی اور انکو حوض شمسی کے مشرق کی جانب دفن کیا گیا۔

الاصفیا ج ۲ ص ۱۹

قاضی حمید الدین ناگوری

قاضی حمید الدین ناگوری کی شخصیت بھی نہایت اہم اور ممتاز ہے اس لئے کہ

وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء میں سب سے زیادہ عالم و فاضل سمجھے جاتے تھے قاضی حمید الدین بخارا میں پیدا ہوئے [ع۱]
انکے والد مولانا عطاء اللہ محمود کے بارے میں روایت یہ ہے کہ وہ شہاب الدین محمد غوری کے زمانہ میں

بخارا سے ہجرت کرکے دہلی آئے اور یہاں سکونت پذیر ہو گئے [ع۲] وہ علم ظاہر میں مجتہد وقت تھے

انکی وفات دہلی میں ہی واقع ہوئی حمید الدین جب سن بلوغ کو پہونچے تو انکو حکومت کی طرف

سے ناگور کا قاضی مقرر کیا گیا [ع۳] وہ جس زمانہ میں ناگور میں مقیم تھے اسی زمانے میں وہاں حدیث

کے ایک مشہور فاضل مولانا رضی الدین صنعانی کا ورود ہوا [ع۴]۔ صنعانی بدایوں میں پیدا ہوئے تھے لیکن عین

جوانی کے عالم میں وہ ہندوستان سے بغداد چلے گئے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر عرصہ گذارا

غالب گمان یہ ہے کہ قاضی حمید الدین ناگوری سے صنعانی کی ملاقات اسی وقت ہوئی ہوگی جب وہ ہندوستان

میں ہی موجود تھے ۔ قاضی حمید الدین نے صنعانی سے علمی استفادہ کیا اور خصوصاً فن حدیث کے بارے میں

نہایت دلچسپ اور اہم معلومات حاصل کی ۔ حمید الدین ناگوری نے مسند قضاء پر فائز ہونے کے

ع۱ مرآۃ الاسرار قلمی : ۱۹۹
ع۲ سیر العارفین قلمی ۱۲۴
ع۳ سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۵
ع۴ صنعانی کو انکی ایک تالیف 'مشارق الانوار' کی وجہ سے پورے عالم اسلام میں شہرت حاصل ہوئی یہ کتاب حدیثوں کا انتہائی معتبر مجموعہ سمجھا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کتاب میں فن حدیث پر نہایت عالمانہ بحث بھی کی گئی ہے

بہت جلد محسوس کیا کہ ایک قاضی کی زندگی اور اسکے روزانہ کے مشاغل دنیاوی جاہ و حشمت سے
خالی نہیں ہیں تین سال تک اس عہدہ پر فائز رہنے کے بعد ایک روز علی الصباح بغیر کسی سے
کچھ کہے معرفت و سلوک کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بغداد کی طرف روانہ ہوگئے[1] اور وہاں
شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں تقریباً ایک سال تک ایک درویش اور مرید کی حیثیت
سے ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے[2] وہیں پر انکی ملاقات خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی[3]
اور ان دونوں کے درمیان تعلقات اس قدر مستحکم ہوگئے کہ آخری وقت تک اس میں کمی نہ ہوئی
بغداد کے دوران قیام ہی اپنے مرشد سے اجازت لیکر مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے جہاں کچھ
عرصہ قیام کرکے وہاں کے عالموں سے استفادہ کیا پھر حج کی غرض سے مکہ معظمہ پہونچے اور وہاں
کم و بیش تین سال کی مدت گذارنے کے بعد انہوں نے عالم اسلام کے دوسرے شہروں کی سیر کی اور
درویشانہ روش کے ساتھ گھوم پھرکر بالآخر سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ہندوستان کا
رخ کیا وہ اس وقت دہلی میں وارد ہوئے جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اس شہر میں مستقل طور

۱۔ صاحب سفینۃ الاولیا نے لکھا ہے کہ ایک دن قاضی حمید الدین ناگوری نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلعم اپنی طرف بلا رہے ہیں اسکے بعد وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے سفینۃ الاولیا ص ۱۹۵

۲۔ سیر العارفین قلمی ۱۲۴ - سرور الصدور میں شیخ حمید الدین صوالی ناگوری کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ
... قاضی حمید الدین ناگوری نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے نہیں بلکہ انکے مرید شمس الدین سمرقندی سے ارادت کی جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ انہوں نے شیخ شہاب الدین کی حیات میں انکے مرید سے کیوں بیعت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا نے مجھے شمس الدین میں جو معنی دکھائے وہ شہاب الدین میں نہیں سرور الصدور قلمی ۱۹
شیخ شہاب الدین سہروردی ایک موقع پر خود فرماتے ہیں کہ شیخ شمس الدین اس مرتبے پر پہونچ گیا ہے کہ اگر میرا مرید نہ ہوتا تو مجھ پر واجب ہوتا کہ اس سے ارادت کروں سرور الصدور قلمی ۱۹

۳۔ سفینۃ الاولیا ص ۱۹۵

سے سلوننت پذیر ہو چکے تھے چونکہ دونوں بغداد میں عرصہ تک ساتھ رہے تھے اس لئے دہلی ہو جکر

بھی دونوں میں اتحاد اور دوستی کا رابطہ قائم رہا اور آخری وقت تک الگ نہ ہونے[1]

اگرچہ قاضی حمیدالدین ناگوری سہروردی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے

براہ راست خلیفہ بھی تھے لیکن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے رشتۂ مودت اور دوستی کا نتیجہ یہ ہوا

کہ بہت سے لوگ انہیں سلسلہ چشتیہ سے ہی منسوب سمجھنے لگے[2] صاحب لطائف اشرفی اور

مراۃ الاسرار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے انکو خرقۂ خلافت بھی[3]

عنایت کیا تھا ۔ اسی روش اور تعلق کے نتیجے میں قاضی حمیدالدین ناگوری سماع کے شوقین ہوگئے جو

سلسلہ سہروردیہ میں مروج نہیں تھا مشہور ہے کہ دہلی کے علماء شریعت قاضی سعد اور قاضی عماد

نے التمش سے اصرار کیا کہ وہ صوفیوں کے سماع کا انسداد کرے اور سماع کے خلاف

حکومت کا حکم نامہ جاری کیا جائے سلطان التمش جب مجبور ہوا تو اس نے دونوں طبقے کے

افراد یعنی طریقت و شریعت کے نمائندوں کو دربار میں دعوت دی اور ایک محضر منعقد کیا لیکن

جب اس مجلس میں قاضی حمیدالدین ناگوری تشریف لائے تو سلطان انکے احترام میں کھڑا

ہو گیا اور انکے ہاتھوں کو بوسہ دیکر اپنے قریب بٹھالیا جب گفتگو اور بحث شروع ہوئی تو

ع۱ سیرالعارفین قلمی ۱۲۴

ع۲ لطائف اشرفی بحوالہ بزم صوفیہ ص ۱۱۰

ع۳ مرآۃ الاسرار قلمی ۱۹۹

قاضی حمیدالدین ناگوری کے علمی دلائل سے تمام علماء خاموش ہوگئے اور سماع کے خلاف سلطان کا حکم نامہ جاری کرنے کی بات ختم ہوگئی۔[1] البتہ دہلی کے علماء سے قاضی حمیدالدین ناگوری کا اختلاف عرصہ تک جاری رہا قاضی حمیدالدین کا علم وفضل انکی ذہانت حاضر جوابی اور منابع علمی سے بر محل استشہاد تمام علماء کو ہر مجمع میں خاموش کردیا تھا اور لوگ انکے استدلال اور منطقی طریقۂ بحث سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔

قاضی منہاج سراج جوزجانی صاحب طبقات ناصری جو قاضی کے عہدے پر فائز تھے باوجودیکہ اہل معرفت کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور علماء شریعت کی ردیف میں گنے جاتے تھے مگر انکو حمیدالدین ناگوری کی ذات سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ہمیشہ حمیدالدین ناگوری کا دفاع اور انکے موقف کی حمایت کرتے۔ قاضی حمیدالدین ناگوری اسلامی فقہ پر زبردست عبور رکھتے تھے اور ایک زیرک عالم کی طرح فقہ کی نازک دفعات سے اکثر فائدہ اٹھا لیتے تھے مثال کے طور پر یہ واقعہ کہ ایک بار سلطان التمش کے محل کے قریب اپنے عزیز دوست قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ محفل سماع سے لطف اندوز ہو رہے تھے دہلی کے ایک فقیہہ مولانا رکن الدین سمرقندی جو سماع کے زبردست مخالف تھے کو اطلاع ملی کہ فلاں جگہ سماع ہو رہا ہے چنانچہ وہ اپنے گھر سے چند

---

[1] فتوح السلاطین ص ۱۱۲ - ۱۱۵

لوگوں کو لیکر اس مکان کی طرف روانہ ہوئے جہاں سماع ہو رہا تھا تاکہ سماع کو بند کرائیں۔

جب قاضی حمید الدین ناگوری کو اس امر کی اطلاع ملی تو انہوں نے مالک مکان سے کہا کہ کہیں

جاکر چھپ جاؤ۔ اگر مولانا رکن الدین تم کو ڈھونڈیں اور بلوائیں تو ہرگز نہ آنا۔ صاحب خانہ

نے قاضی حمید الدین ناگوری کے حکم کی تعمیل کی۔ اس میں ایک فقہی نزاکت پوشیدہ تھی مولانا رکن الدین سمرقندی

احکام شریعت سے واقف تھے۔ وہ بغیر صاحب خانہ کی اجازت کے مکان میں داخل نہیں ہو سکتے

تھے چنانچہ سماع جاری رہا اور مولانا رکن الدین سمرقندی یہی پوچھتے رہ گئے کہ صاحب خانہ کون

ہے اور کہاں ہے تاکہ ان سے مکان میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کریں۔ صاحب خانہ کے

موجود نہ ہونے کی وجہ سے مولانا مکان کے اندر داخل نہ ہو سکے اور انہیں مجبوراً واپس چلے جانا پڑا۔[1]

سماع کے معاملے میں قاضی حمید الدین ناگوری اور بحریوں (لشکر کے قاضی) کے

درمیان بھی بڑا اختلاف تھا۔ ایک بار مولانا شرف الدین بحری بیمار ہو گئے۔ قاضی حمید الدین ناگوری

مزاج پرسی کے لئے جب انکے مکان پر پہونچے تو مولانا نے یہ کہکر ملاقات کرنے سے انکار

کردیا کہ جو شخص خدا کو معشوق کہتا ہے میں اسکا منہ نہیں دیکھونگا۔[2]

قاضی حمید الدین ناگوری کے سماع سننے کے سلسلے میں مخالفوں کی طرف سے

ایک استفتاء تیار کیا گیا جسکے جواب میں بہت سے لوگوں نے لکھا کہ سماع سننا حرام ہے

۱۔ فوائد الفواد ص ۲۳۸-۲۳۹ و کرامات اولیاء قلمی ۲۰۷

۲۔ ایضاً ص ۲۴۰ و سیر العارفین قلمی ۱۲۵

اسکا جواب دینے والوں میں ایک ایسا فقیہہ بھی تھا جسکے تعلقات قاضی حمیدالدین ناگوری سے
بہت اچھے تھے اور وہ انکے پاس برابر آنا رہتا تھا جب اس بات کی اطلاع قاضی حمیدالدین ناگوری
کو ملی اور وہ شخص آپ سے ملنے آیا تو آپ نے اس فقیہہ سے اس بارے میں پوچھا فقیہہ
شرمندہ ہوا اور کہا کہ ہاں میں نے بھی لکھا ہے قاضی حمیدالدین نے فرمایا کہ وہ سب فقیہہ جنہوں
نے استفتاء کے جوابات لکھے ہیں میرے نزدیک ابھی ماؤں کے پیٹوں میں ہیں لیکن تم ماں کے
پیٹ سے پیدا ہوئے ہو یعنی تم ابھی بچے ہو[1]

قاضی حمیدالدین ناگوری کے تعلقات قطب الدین بختیار کاکی کے ساتھ ساتھ
انکے مرید و خلیفہ شیخ فریدالدین مسعود گنجشکر سے بھی تھے ان دونوں بزرگوں کے درمیان خط وکتابت
بھی ہوتی تھی صاحب فوائدالفواد نے قاضی حمیدالدین ناگوری کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو
انہوں نے فریدالدین گنجشکر کو لکھا تھا لکھتے ہیں :

"فقیر حقیر ضعیف نحیف محمد عطا کہ بندۂ درویشان است و ازسر و دیدہ
خاک قدم ایشان" اسکے بعد اسی خط کی ایک رباعی نقل کی ہے ؎

آن عقل کجا کہ در کمال تو رسد   وآن روح کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی زجمال   کہ دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد[2]

۱؎ فوائدالفواد ص ۲۴۰، ۲۴۱

۲؎ ایضاً ص ۱۵۰ و کرامات الاولیاء قلمی ۲۰۷

قاضی حمید الدین ناگوری صاحب تالیف صوفی تھے۔ انکی تالیفات انکی زندگی میں

ہی مشہور ہوگئیں تھیں انکی کتابوں کو سہروردیہ سلسلے کے معتقدین کے علاوہ چشتیہ حلقوں میں

بھی بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ خواجہ فریدالدین گنجشکر نے بھی راحت القلوب میں ان کتابوں کا

ذکر کیا ہے۔ انکی ایک کتاب جسکا نام 'لوائح' تھا اب مفقود ہے مگر انکے زمانہ میں یہ کتاب

بہت زیادہ مشہور اور مقبول تھی اور تمام اہل سلوک اس کتاب کو ایک فعالی درجہ دیتے تھے۔

قاضی مذکور کی دیگر کتابیں 'رسالہ عشقیہ' اور 'طوالع الشموس' آج بھی محفوظ ہیں۔ عشقیہ کا نفس

مضمون یہ ہے کہ حقیقت میں عاشق و معشوق دو جدا ہستیاں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ذات کے

دو پرتو ہیں جو بھی انکو دو سمجھتا ہے وہ گمراہ ہے اور جو انکو بالکل نہیں دیکھتا وہ دیوانہ ہے

طوالع الشموس میں خصوصیت کے ساتھ مختلف اسماء الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ

صوفیوں کا نہایت محبوب موضوع تھا۔

مولانا قطب الدین کاشانی قاضی حمید الدین ناگوری سے ملاقات کا اشتیاق لیکر

دہلی آئے انکے دہلی پہونچنے کے قبل ہی قاضی حمید الدین ناگوری وفات پا چکے تھے انہوں نے

قاضی حمید الدین ناگوری کی تصانیف طلب کیں جو انہوں نے سلوک اور تصوف پر لکھی تھیں مطالعہ کے

بعد انہوں نے اپنے ہمراہی طالب العلموں کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ جو کچھ تم نے اور میں نے

بڑھاپے ہے وہ اس جگہ موجود ہیں اور ہر وہ چیز جو کہ ابھی نہیں بڑھی ہے وہ بھی مرقوم ہے[1]

قاضی حمید الدین ناگوری سہروردیوں کے دستور کے مطابق متاع دنیا سے اپنا ہاتھ خالی نہیں رکھتے تھے البتہ وہ درویشوں کو بخشش دینے کے معاملہ میں نہایت احتیاط برتتے تھے اور اکثر منع کر دیتے تھے۔ انکا قول تھا کہ میں ایک روحانی دکان چلاتا ہوں میرے پاس بانٹنے کے لئے روپیہ کہاں رکھا ہے غالباً قاضی حمید الدین یا دوسرے سہروردی شیوخ کا یہ طریقہ بے جا نہ تھا انسانی نفسیات پر نظر ڈالی جائے تو یہ نکتہ روشن ہوتا ہے کہ مفت روپیہ کا حصول آدمی کے اندر کاہلی لاپرواہی اور غیر ذمہ داری پیدا کرتا ہے وہ اس اعتبار سے اسلام کی اس تعلیم کے حامی تھے کہ کسب معاش میں جدوجہد کرنا بھی ایک طرح کی عبادت ہے وہ کمال روحانی جو قاضی حمید الدین کو میسر تھا ہر کسی کو میسر نہیں ہو سکتا اسکے باوجود انہوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف تین مرید ہی بنائے جو شیخ احمد نہروانی، عین الدین قصاب اور شیخ شاہی روشن تاب تھے انکے یہ تینوں مرید خود بھی کشف و کرامات کے معاملے میں نہایت درجہ کمال پر فائز تھے قاضی حمید الدین ناگوری دہلی میں سلسلہ سہروردیہ کے سب سے ممتاز بلکہ واحد نمائندہ تھے انکے متعلق خود شیخ شہاب الدین سہروردی کا بیان ہے کہ ہندوستان میں میرے بہت سے خلفاء ہیں لیکن ان میں بزرگ ترین قاضی حمید الدین ناگوری ہیں[2] انہوں نے دہلی میں ہی وفات پائی اور انکی وصیت کے مطابق انکو قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے پائیں جانب دفن کیا گیا۔ صاحب سفینۃ الاولیا نے تاریخ وفات[3] ۶۴۳/۱۲۴۵ لکھی ہے۔

---

[1] سیر العارفین قلمی ۱۲۶ [2] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۱۰

[3] سفینۃ الاولیا ص ۱۹۵ سلطان فیروز شاہ کے عہد میں انکے مزار پر جو لوح لگایا گیا اس پر انکی تاریخ وفات ۶۹۶/۱۲۹۶ بعہد سلطنت جلال الدین فیروز شاہ خلجی ہے مفتاح التواریخ ص ۷۵

شیخ صدر الدین عارف

شیخ صدر الدین عارف شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے فرزند خلیفہ اور جانشین تھے آپ نے اپنے والد کی خدمت میں رہکر ہی علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی اور اپنے والد کی وفات کے بعد مسند ارشاد و اصلاح پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنے والد کے بعد اٹھارہ سال تک طالبان راہ طریقت کی ہدایت میں مصروف رہے[۱،۲]۔ تاریخ فرشتہ[۳] میں آپ کے روحانی کمالات کی تعریف ان اشعار میں کی گئی ہے ؎

آن گہر معدن حق الیقین	تازہ ز آب کرمش باغ دین
دادہ زپاکی بملائک ملا	خرقۂ وحدت بخلا و ملا
گنجہ امواج دل پاک او	عقل فرو ماندہ در ادراک او
صدر نشین گشت بعرش برین	گشتہ خطابش ز خدا صدر دین

سیر العارفین میں ہے ؎

"آن جامع آثار جبروت و آن سامع اسرار لاہوت آں سوار میدان فتوۃ و آن گلدستہ گلزار مروت آن شانی شہود سیر فی قرب اللہ و آن نافع وجود ماسوی اللہ آں مست میخانہ مراد و آں گنج ویرانہ اتحاد آں عالم علوم اسرار معارف"[۴]

آپ کے لقب عارف کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب آپ قرآن شریف کی تلاوت فرماتے

۱۔ اخبار الاخیار ص ۶۷
۲۔ سفینۃ الاولیاء ص ۱۹۹
۳۔ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۸
۴۔ سیر العارفین قلمی ۷۸

تو اسکے معنی اور مطالب پر اس قدر غور و فکر کرتے کہ آپ کا دماغ روشن ہو جاتا اور اسکے دوسرے معنی اور مطالب بھی آپ پر ظاہر ہو جاتے غرض جتنی بار آپ قرآن شریف پڑھتے اتنے ہی مطالب آپ پر ظاہر ہوتے اسی وجہ سے آپ عارف کے لقب سے مشہور ہوئے[1] تاریخ فرشتہ میں ہے کہ

"ویرا عارف ازان گویند کہ ہر بار ختم کلام اللہ کردی سمند فکرت بیشتر راندی و وقتیکہ بتلاوت مشغول بودے اورا فوج فوج معانی رو نمودے"[2]

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی وفات کے بعد انکا اثاثہ صدرالدین عارف کے سات بھائیوں کے درمیان تقسیم ہوا صدرالدین عارف کے حصے میں دیگر لوازمات کے علاوہ سات لاکھ تنکہ نقد آیا۔[3] آپ نے اسی دن سارا اثاثہ درویشوں میں تقسیم کر دیا اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھا جب ایک درویش نے آپ سے یہ بات کہی کہ آپ کے والد کے پاس اتنا سامان اور نقد تھا اور وہ اسے آہستہ آہستہ خرچ کیا کرتے تھے آپ کا عمل بھی اسی طرح ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے یکبارگی کیوں خرچ کر دیا اور ترک و تجرید کو اختیار کیا تو اسکے جواب میں آپ نے فرمایا کہ میرے والد ہمیشہ دنیا پر غالب رہتے تھے اور اسکو مغلوب کرکے خرچ کرتے تھے اس وجہ سے دولت کی موجودگی انکو کوئی نقصان نہ پہنچا سکتی تھی لیکن میں اگرچہ دنیا پر بیشتر غالب ہوں لیکن کبھی کبھی میں اسکو مساوی بھی پاتا ہوں ایسا نہ ہو کہ کبھی دنیا مجھ پر غالب آجائے

---

۱ سیر العارفین قلمی ۸۷

۲ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۹

۳ سفینۃ الاولیا ص ۱۹۹ ۔ تاریخ فرشتہ اور سلسلہ عالیہ نے ستر لاکھ تنکہ لکھا ہے ملاحظہ ہو
تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۰۹ ۔ سلسلہ عالیہ ص ۹

اسی وجہ سے میں نے مال و دولت کو اپنے سے علحدہ کرکے اپنے دل کو مطمئن کر لیا[1] تاکہ اطمینان سے یاد خدا میں مصروف رہوں۔ خزانہ رکھنے کے لئے میرے بھائی کافی ہیں۔[2] لیکن اس قیامی کے باوجود کہ آپ نے ساری نقدی فقراء میں تقسیم کردی معلوم ہوتا ہے کہ اسکے باوجود آپ کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ تاریخ فرشتہ میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حالت کے باوجود آپ کا دسترخوان مختلف قسم کی نعمتوں سے ہمیشہ پر رہتا اور بے شمار علماء و فقرا کھانے پر موجود ہوتے۔ شیخ رکن الدین[3] فردوسی سے منقول ہے کہ جب وہ خراسان سے ہندوستان کے ارادہ سے روانہ ہوکر ملتان کے قریب پہونچے تو شیخ صدرالدین سے ملاقات کی غرض سے انکے پاس تشریف لے گئے۔ فرماتے ہیں کہ جس وقت میں ملاقات کی غرض سے انکے پاس پہونچا۔ ایام بیض کا روزہ رکھے ہوا تھا شیخ صدرالدین نے کھانا منگوایا بہت سے لوگ پہونچ گئے جیسے کہ بادشاہ کا دسترخوان ہو میں دوسروں کے مقابلے میں شیخ سے نزدیک تھا دسترخوان پر مختلف اقسام کے کھانے اور حلوا نے حالوئی رکھے تھے شیخ میری طرف متوجہ ہوئے اور بسم اللہ کہا۔ میں روزہ سے تھا لیکن اس حکم کے مطابق "منا کل مع المغفور فهو المغفور" (اہل مغفرت کے ساتھ کھانے والا بھی مغفور ہوتا ہے) میں نے بھی کھانا شروع کردیا دیکھا کہ شیخ رغبت سے کھانا کھا رہے ہیں میں اسی کشمکش میں تھا کہ صرف چکھنے پر اکتفا کروں یا کچھ کھا بھی لوں شیخ صدرالدین

---

[1] سیر العارفین قلمی ۷۸

[2] خزینۃ الاصفیا ص ۲۹

[3] رکن الدین فردوسی حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے پیر کے پیر تھے

نے کشف کے ذریعہ میری اس کشمکش کو محسوس کر لیا اور فرمایا کہ جو شخص باطنی حرارت سے کھانے کو نور بنا کر حلق تک پہونچا سکے اسکے لئے کم کھانے کی پابندی ضروری نہیں ہے[1]

فوائد الفواد میں نظام الدین اولیاء کی زبانی ہے کہ ایک بار شیخ صدر الدین نے مفصل[2] پڑھنی چاہی انہوں نے اپنے والد سے اس سلسلے میں عرض کیا شیخ بہاء الدین زکریا نے فرمایا کہ آج کی رات صبر کرو جب رات ہوئی تو شیخ صدر الدین نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص قیدی ہے جو زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے اور اسے گھسیٹ کر لے جایا جا رہا ہے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کہا گیا کہ یہ مفصل کا مصنف زمخشری ہے اسے ہم دوزخ میں لے جا رہے ہیں[3]

صاحب تاریخ فرشتہ نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے لیکن تھوڑے فرق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ جب صدر الدین عارف نے اپنے والد سے اس کتاب کے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے رات بھر صبر کرنے کو کہا، رات میں بہاء الدین زکریا نے وہ خواب دیکھا اور صبح کو اس واقعہ کا ذکر صدر الدین عارف سے کیا تو صدر الدین نے اس کتاب کے پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا[4]

صاحب تاریخ فرشتہ[5] اور سیر العارفین[6] نے آپ کی کرامات کے سلسلے میں

ع[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۱

ع[2] المفصل فی صناعۃ الاعراب صاحب تفسیر کشاف جار اللہ زمخشری کی مشہور کتاب ہے جو علم نحو پر ہے اور چار اقسام، اسماء، افعال، حروف وغیرہ پر مشتمل ہے۔

ع[3] فوائد الفواد ص ۲۳۵

ع[4] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۰

ع[5] ایضاً 〃 〃 ۴۱۰

ع[6] سیر العارفین قلمی ۸۱

ایک واقعہ نقل کیا ہے لکھتے ہیں۔ ایک دن شیخ صدرالدین عارف ملتان کے نزدیک دریا کے کنارے وضو کر رہے تھے آپ کے صاحبزادے شیخ رکن الدین الوالفتح ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتے اور قرآن شریف حفظ کیا کرتے۔ اس جگہ بھی وہ قرآن شریف حفظ کر رہے تھے ناگاہ ہرنوں کے ایک گلہ پر نگاہ پڑی جس میں ایک ہرنی اور اسکا بچہ بھی تھا۔ بچہ ماں کے پیچھے دوڑ رہا تھا آپ بچہ کی طرف مائل ہو گئے جب پورا گلہ نظروں سے اوجھل ہو گیا جب بھی آپ کی نظر اسی طرف رہی جس طرف وہ گلہ گیا تھا اس دوران شیخ صدرالدین نے وضو سے فراغت کے بعد نماز دوگانہ ادا کی اور پھر شیخ رکن الدین الوالفتح کو قرآن شریف پڑھانے لگے شیخ رکن الدین نہایت ذہین تھے انکی یہ حالت تھی کہ وہ روزانہ چوتھائی پارہ قرآن تین مرتبہ پڑھنے کے بعد حفظ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن اس روز دس مرتبہ پڑھنے پر بھی انکو یاد نہ ہوا شیخ صدرالدین کے دریافت کرنے پر بعض حاضرین نے ہرن کے غول گزرنے اور شیخ رکن الدین کے ہرن کے بچے کو دیکھتے رہنے کا ذکر کیا جب صدرالدین کو معلوم ہو گیا کہ اسکا دل پڑھنے میں کیوں متوجہ نہیں ہے تو انہوں نے ہرن کے جانے کی سمت پوچھی اور کچھ دیر تک اس سمت پر نظر جمائے رہے کچھ ہی دیر بعد وہ ہرنی مع اپنے بچے کے دوڑی ہوئی آئی اور شیخ رکن الدین کے پاس آکر کھڑی ہو گئی شیخ رکن الدین نے ہرنی کے بچہ کو گود میں اٹھا لیا اسکی آنکھ اور

پیشانی کو چوما اور ہرنی اور اسکے بچے کو خانقاہ میں لے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دن انھوں نے آدھا پارہ قرآن حفظ کر لیا - شیخ صدرالدین عارف کی کرامت سے متعلق ایک اور واقعہ صاحب سیرالعارفین[1] اور تاریخ فرشتہ[2] نے بیان کیا ہے جسکی صحت پر شبہ ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خضر خان جو اپنے والد سلطان غیاث الدین بلبن کی طرف سے ملتان کا صوبیدار بنا کر بھیجا گیا تھا اسکے ساتھ اسکی بیوی بھی تھی جو سلطان رکن الدین بن سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی تھی یہ شہزادی بہت ہی خوبصورت باحیا اور نیک خاتون تھی۔ وہ شہزادہ کی شراب نوشی سے ہمیشہ پریشان رہا کرتی اور اسے شراب پینے سے منع کرتی۔ شہزادہ نے ایک دن شراب کے نشے میں اپنی بیوی کو طلاق دیدی لیکن دو تین دنوں کے بعد ہی اسکی مفارقت سے بیتاب ہو کر شہر کے عالموں کو اپنے پاس بلوایا اور سارا ماجرا بیان کیا علماء نے کہا کہ بغیر کسی دوسرے نکاح حلالہ کے تمھارے لئے کسی طرح جائز نہیں پھر شہزادہ نے خلوت میں قاضی امیرالدین خوارزمی کو جو اسکا ہمدم اور ہمراز تھا بلوایا اس نے مشورہ دیا کہ شیخ صدرالدین عارف جو ملتان کے پاک ذات اور فرشتہ صفت بزرگ ہیں انکے ساتھ مصلحتاً اسکا نکاح کر دیا جائے اور پھر ان سے طلاق لے لی جائے تاکہ آپکے لئے جائز

---

[1] سیرالعارفین قلمی ۸۵-۸۲

[2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۱-۴۱۰

ہو چنانچہ شیخ صدر الدین عارف سے شہزادی کا نکاح کردیا گیا جب دوسرے دن شیخ نے
اسے طلاق دینا چاہا تو اس نے شیخ صدر الدین کے قدموں پر گر کر کہا کہ اگر آپ مجھے اس
ظالم اور فاسق کے حوالے کردینگے تو میں قیامت کے دن آپ کا دامن پکڑونگی شیخ کو شہزادی
کی عجز وزاری پر رحم آگیا اور اسکو طلاق دینے سے انکار کردیا شہزادہ خضر خان کو جب
قاضی نے یہ بات بتائی تو اس نے غصہ میں آکر کہا "اگر فردا بساط خانۂ شیخ صدر الدین را
بخون او رنگین نسازم از زن کمتر باشم" شیخ کو جب اس بات کی اطلاع ملی تو ان پر
کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اسی روز شام میں نواح ملتان میں مغلوں کے
لشکر جرار کے آنے کی خبر پہونچی[1] تو شہزادہ نے پہلے مغلوں کا دفاع کرنا مناسب سمجھا اور
کہا کہ مغلوں کو ختم کرنے کے بعد شیخ کو ٹھکانے لگاؤنگا دوسرے دن مغلوں سے مقابلہ ہوا
جس میں شہزادے کو شکست ہوئی اور وہ مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوا -

مندرجہ بالا واقعات کی صداقت پر شبہ کی وجہ یہ ہے کہ خود تاریخ فرشتہ
اور دیگر تاریخ نویسوں[2] نے شہزادہ خضر خان (سلطان شہید) کے اخلاق اور کردار کی جو تصویر کشی
کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہزادہ خضر خان نہایت متقی پرہیزگار اور علماء و فضلاء

---

۱ منتخب التواریخ میں ہے کہ مغلوں کا لشکر لاہور پہونچا تھا اور حاکم لاہور کے مراسلے پر سلطان محمد مغلوں سے مقابلہ کے لئے اپنے لشکر کے ساتھ لاہور پہونچا اور وہاں جنگ ہوئی جس میں سلطان محمد شہید ہوا اور یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا -
منتخب التواریخ ج ۱ ص ۱۳۱

۲ مثلاً تاریخ فیروز شاہی مولف ضیاءالدین برنی وغیرہ

کا بڑا قدردان تھا

شیخ صدرالدین عارف نے اپنے والد کی وفات کے بعد اٹھارہ سال تک انکے جانشین کی حیثیت سے زندگی گذار کر وفات پائی اور ملتان میں ہی اپنے والد کے پہلو میں دفن کئے گئے[ع۱] صاحب تاریخ فرشتہ[ع۲] نے سال وفات ۶۷۶/۱۲۷۷ سفینۃ الاولیاء[ع۳] نے ۱۴ ذی الحجہ ۶۸۴/۱۲۸۵ خزینۃ الاصفیا[ع۴] اور کرامات اولیاء[ع۵] میں بھی یہی سن مذکور ہے صاحب مراۃ الاسرار[ع۶] نے وفات کے وقت آپ کی عمر انہتر[۶۹] سال لکھی ہے[ع۷]

شیخ صدرالدین عارف کے ملفوظات کنوز الفواد کے نام سے انکے ایک مرید ضیاءالدین نے مرتب کئے ان میں دس نصیحتیں ہیں جو شیخ صدرالدین عارف نے اپنے مریدوں کے نام تحریر کی تھیں یہ کتاب ہمارے دسترس سے باہر ہے اور بظاہر آثار یہ ہے کہ یہ مفقود ہو چکی ہے اس لئے کہ کسی معتبر کتب خانے کی فہرست میں اسکا تذکرہ نہیں ملتا صاحب اخبارالاخیار نے اس کتاب سے کچھ اقتباسات نقل کئے ہیں جن سے انکی تعلیمات کا پتہ چلتا ہے ۔

ع۱ سفینۃ الاولیا ص ۱۹۸

ع۲ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۱

ع۳ سفینۃ الاولیا ص ۱۹۹

ع۴ خزینۃ الاصفیا ص ۳۱

ع۵ کرامات اولیا قلمی ۲۹۸

ع۶ مراۃ الاسرار قلمی ۲۲۸

سید جلال الدین میر شاہ سرخ بخاری

آپ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے مرید اور خلیفہ ہیں آپ کا نام جلال الدین اور لقب جلال سرخ تھا لیکن آپ مختلف نام اور القاب سے مشہور ہوئے جیسے میر سرخ شرف اللہ، ابوالبرکات، ابو احمد، میر بزرگ، مخدوم اعظم جلال اکبر اور عظیم اللہ۔[1]

آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے امام علی الھادی تک پہونچتا ہے تاریخ فرشتہ میں سلسلہ نسب اس طرح درج ہے: " سید جلال الدین بخاری بن سید علی بن جعفر بن محمد بن احمد بن محمود بن عبداللہ بن علی اصغر بن جعفر بن امام علی الھادی۔[2] آپ کا شمار بخارا سے ہندوستان آنے والے جلیل القدر اور معروف عالموں اور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ بخارا سے پہلے بھکر پہونچے اور پھر وہاں سے ملتان تشریف لے گئے اور وہاں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے پاس قیام کیا۔ بہاؤالدین زکریا ملتانی سے خلافت نامہ حاصل کرنے کے بعد آپ ان کے حکم سے اوچ تشریف لے گئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء نے مظہر جلالی کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے بچپن میں ہی ایک دن وہ کھیلتے کھیلتے شہر سے باہر نکل آئے

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۵

[2] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۲

اور ایسی جگہ پہونچے جہاں ایک میت کی نماز جنازہ ہو رہی تھی آپ نے میت کی طرف

اشارہ کرکے لوگوں سے پوچھا کہ اس شخص کی کیا حالت ہے جو چار پائی پر لیٹا ہے

لوگوں نے بتایا کہ فلاں آدمی مر گیا ہے جسکی نماز جنازہ ہو رہی ہے پھر بتایا کہ

اسکے بعد اسے دفن کر دیا جائیگا جب یہ بات آپ کو معلوم ہوئی تو آپ کے بدن پر

لرزہ طاری ہو گیا نعرہ اللہ اکبر لگاتے ہوئے میت کے پاس پہونچے اور قم باذن اللہ

کہا۔ مردہ فوراً زندہ ہو گیا اور اپنے قدموں پر چلنے لگا اور اسکے بعد چالیس سال تک

زندہ رہا جب اس بات کی اطلاع آپ کے والد کو ہوئی تو انہوں نے آپ کو منع کرتے

ہوئے فرمایا کہ وہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرے جس سے شریعت میں رخنہ پیدا ہوتا ہو۔ آپ

نے جواب میں فرمایا کہ اگر آپ منع نہ کرتے تو بخارا میں ایک بھی شخص نہیں مرتا اور اگر

مرتا تو زندہ ہو جاتا[۱] پھر آگے لکھتے ہیں کہ "جب جلال الدین نے بخارا سے سفر کا ارادہ

کیا تو پہلے نجف تشریف لے گئے اور وہاں شیر خدا علی مرتضیٰ کی قبر پر فیوض باطنی

کے حصول کے لئے قیام کیا پھر وہاں سے روضۂ نبوی کی زیارت کے لئے مدینہ تشریف لے گئے

وہاں سے فارغ ہو کر شام چلے گئے اور وہاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مقبرہ کے مجاور

رہے پھر مدینہ ہوتے ہوئے مکہ پہونچکر زیارت کعبہ سے مشرف ہوئے اور وہاں سے

۱۔ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۶

مختلف جگہوں کی سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان پہونچے[۱]۔ ہندوستان میں پہلے وہ بھکر پہونچے[۲]
اور وہاں قیام کیا۔ قیام بھکر کے دوران ہی وہاں کے ایک رئیس بدرالدین بن صدرالدین
خطیب کی بیٹی سے شادی کی۔ کہا جاتا ہے کہ جلال الدین بخاری کے بھکر میں قیام کے بعد رسول صلعم
نے جلال الدین بخاری کو اس بات کی بشارت دی کہ وہ سید بدرالدین بھکری کی لڑکی سے
شادی کر لیں اور اسی طرح سید بدرالدین بھکری کو بھی خواب کے ذریعہ اس خوش نصیبی کی
بشارت دی، چنانچہ اس نے اپنی بیٹی کا نکاح سید جلال الدین بخاری سے کر دیا[۳]۔ بعض حاسدوں
کو آپ کا اس طرح امتیاز پانا ناگوار گذرا۔ چنانچہ آپ اپنے لوگوں کی ریشہ دوانیوں اور
رشتے داروں کی خلفشاروں سے تنگ آکر بھکر سے اوچ تشریف لے گئے[۴]۔ اخبار الاخیار میں آپ
کے ملتان جانے کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن تاریخ فرشتہ اور سیر العارفین میں آپ کے ملتان جانے اور
وہاں بہاء الدین زکریا ملتانی کے خانقاہ میں قیام کا ذکر موجود ہے۔ خانقاہ میں دوران قیام
کا ایک واقعہ بھی ان دونوں نے لکھا ہے واقعہ یہ ہے کہ جلال الدین بخاری شیخ بہاء الدین زکریا
کی خانقاہ میں مقیم تھے گرمی کا موسم تھا اور شدت کی گرمی پڑ رہی تھی سید جلال الدین بخاری
خانقاہ کے صحن میں بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بخارا کی برف اس گرمی میں کہاں مل سکتی ہے

۱۔ خزینۃ الاصفیاء ص ۲۷۱ ج ۲
۲۔ سیر العارفین قلمی ۱۹
۳۔ اخبار الاخیار ص ۴۷
۴۔ ایضاً ص ،،

بہاءالدین زکریا خانقاہ کے اندر موجود تھے جب انہوں نے یہ بات سنی[1] تو ایک نوکر کو حکم دیا کہ وہ جماعت خانہ کی صفیں اٹھالے اور صحن میں جھاڑو لگادے آپ کے خادم نے حکم کی تعمیل کی دوپہر کا وقت تھا۔ نیلے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا بجلی چمکی بادل گرجا اور صحن میں مرغ کے انڈے کے برابر اولے پڑنے لگے خانقاہ کا صحن اولوں سے بھر گیا لیکن خانقاہ کے باہر ایک بھی اولہ نہ گرا جلال الدین بخاری کو بڑی حیرت ہوئی انہوں نے بھی اولے کھائے اور کچھ جمع کرلیا گیا ظہر کی نماز کے وقت جب بہاءالدین زکریا ملتانی خانقاہ کے باہر تشریف لائے تو جلال الدین بخاری سے پوچھا اب ملتان کے اولے بہتر ہیں یا بخارا کا یخ، جلال الدین بخاری نے عرض کیا کہ ملتان کا اولا بخارا کے برف سے سو گنا بہتر ہے پھر اسی دن بہاءالدین زکریا نے جلال الدین بخاری کو خرقۂ خلافت عنایت فرمایا اور چند دنوں اپنے پاس ٹھہرانے کے بعد اچہ جاکر وہاں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا[2] اچہ میں قیام کے بعد آپ نے وہاں ایک محلہ بخاریاں آباد کیا اسوقت اچہ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن آپ کے قیام کی وجہ سے وہاں اسلام کی غیرمعمولی اشاعت ہوئی اسکے علاوہ آپ نے پنجاب میں بھی ایک شہر جھنگ سیالاں آباد کیا[3] آپ نے ۹۵ سال کی عمر میں ۶۹۰/۱۲۹۱ میں وفات پائی[4]

---

۱ تاریخ فرشتہ میں ہے کہ جب جلال الدین بخاری نے یہ بات کہی تو بہاءالدین زکریا کو کشف کے ذریعہ اسکی اطلاع ہوئی تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۳

۲ سیر العارفین قلمی ۲۰ نیز تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۴۱۳

۳ تذکرہ صوفیائے سندھ اردو ص ۷۷

۴ آب کوثر ص ۲۷۷

شیخ حسن افغان

شیخ حسن افغان خواجہ بہاءالدین زکریا ملتانی کے مشہور اور مقبول ترین خلفاء میں سے تھے۔ شیخ بہاءالدین زکریا آپ کو بہت ہی محبوب رکھتے وہ صاحب ولایت اور پہونچے ہوئے بزرگ تھے چنانچہ شیخ بہاءالدین زکریا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اکثر فرمایا کرتے کہ اگر قیامت کے دن خدا مجھ سے سوال کریگا کہ تم ہماری بارگاہ میں کیا لیکر آئے ہو تو میرا جواب ہوگا کہ میں حسن افغانی کو لایا ہوں۔[1] شیخ حسن افغان کے حالات کے سلسلے میں مخزن افغانی[2] کے منتشر اندراجات کو جمع کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام اپنی کتاب آب کوثر میں لکھتے ہیں۔

"حسن اصل میں خوجند کے ایک سید زادے تھے وہاں کی ایک خاتون کے ساتھ جنکی ہمشیرہ ملتان میں بیاہی ہوئی تھیں آپ قحط سالی کے زمانے میں یہاں آئے اس خاتون نے غرغشتی قبیلہ کے ایک افغان (دادی) سے شادی کرلی اور حسن بھی افغانوں میں لس کر اور شادی بیاہ کرکے افغان ہوگئے انکی اولاد کو خوندی، خووندی یعنی خوجندی کہتے ہیں مخزن افغانی میں لکھا ہے کہ آپ شروع شروع میں ان بچوں کی طرح جو ماں باپ کی نگرانی سے محروم رہ گئے ہوں آوارہ و آزاد ہوگئے بلکہ چوری و ڈکیتی کا پیشہ شروع کیا اور غرغشتی قبیلے کے لوگوں نے پشتو میں آپ کا عرف ہی بھو یعنی چور رکھ دیا لیکن پھر عنایت الٰہی شامل حال ہوئی، گناہوں سے یک قلم توبہ کی اور شیخ بہاءالدین زکریا کی

ع[1] فوائد الفواد ص ۱۰

ع[2] مخزن افغانی افغانوں کی قدیم تاریخ ہے جو عہد جہانگیری میں خان جہان لودھی کی ایماء پر لکھی گئی یہ کتاب ،، ،، شائع ،، ،، ہو چکی ہے اس کتاب کا انگریزی خلاصہ ہسٹری آف دی افغانز کے نام سے ۱۸۲۹ء میں اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی لندن کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ فٹ نوٹ آب کوثر ص ۲۶۸۔

خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے ایک عرصہ انکی خدمت میں گزارا اور بالآخر ایک کامل ولی ہوگئے اسکے بعد مرشد نے حکم دیا کہ جاکر افغانوں میں ہدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کرو ("اے حسن برو در قوم افغاناں ہدایت حق کن") چنانچہ وہ اپنے وطن واپس آئے اور غرغشتیوں میں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا آپ کے قبیلے کے لوگ زیادہ تر قندھار کے گرد نواح میں رہتے ہیں"۔ [1]

شیخ حسن افغان زہد و عبادت، ذوق و شوق عشق و محبت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، علوم ظاہری میں بالکل امّی تھے لیکن علوم باطنی کے معاملے میں اس قدر پہونچے ہوتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام لوح محفوظ انکے سینے پر لکھا ہوا ہے۔ [2] امتحان کے طور پر لوگ ایک کاغذ پر تین سطریں جن میں ایک سطر میں رسول اکرم کی حدیث ہوتی دوسری میں کسی مشائخ کے اقوال اور تیسری میں آیات قرآنی جب یہ آپ کے پاس لے جایا جاتا اور آپ سے پوچھا جاتا کہ اس میں کیا ہے تو آپ پہلے قرآنی آیات کی سطر پر انگلی رکھتے ہوئے فرماتے کہ یہ حق تعالی کا کلام ہے کیونکہ میں اس کا نور عرش مجید تک دیکھ رہا ہوں اسکے بعد حدیث کی سطر پر انگلی رکھتے ہوئے فرماتے کہ یہ حدیث رسول صلعم ہے کیونکہ میں اسکا نور ساتویں آسمان تک دیکھ رہا ہوں اسکے بعد مشائخ کے قول والی سطر پر انگلی رکھ کر فرماتے کہ یہ مشائخ کا قول ہے کیونکہ میں اسکا نور فلک قمری تک دیکھ رہا ہوں۔ [3]

ع ۱ آب کوثر ص ۲۷۶-۲۷۵
ع ۲ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۳۴
ع ۳ فوائد الفواد ص ۱۱-۱۰

صاحب فوائد الفواد اور سیر العارفین نے لکھا ہے کہ ایک بار آپ ملتان سے دہلی روانہ ہوئے راستہ میں انہیں ایک مسجد تعمیر کی جاتی ہوئی ملی وہاں پر بہت سے علماء کرام موجود تھے محراب کا رخ ڈالنا تھا کعبہ کی سمت سے متعلق ان علماء کرام میں اختلاف رائے تھا، حسن افغان بھی اس جگہ پہونچے اور ایک سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کعبہ اس جانب ہے محراب کا رخ اسی جانب رکھا جائے، ایک شخص نے بحث شروع کردی اسکا کہنا تھا کہ کعبہ اس سمت پر نہیں بلکہ دوسری سمت پر ہے دیر تک بحث ہوتی رہی آخر میں حسن افغان نے کہا کہ میں جو سمت بتا رہا ہوں اس سمت پر غور سے دیکھو جب اس شخص نے حسن افغان کی بتائی ہوئی سمت پر دیکھا تو کعبہ کو اپنے روبرو پایا۔

حسن افغان صاحب کشف بھی تھے انہیں کشف کے ذریعہ سارے حالات و واقعات کا علم ہو جاتا تھا، ایک مرتبہ آپ گلی سے گشت کرتے ہوئے کہیں جا رہے تھے کہ مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی آپ بھی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوگئے اور جماعت کے پیچھے کھڑے ہوگئے جب نماز ختم ہوئی اور لوگ مسجد سے چلے گئے تو آپ امام کے پاس پہونچے اور اس سے کہا کہ جب تم نے نماز شروع کی تو میں بھی تمہارے پیچھے کھڑا ہوگیا، تم نماز کے دوران ہی یہاں سے دہلی چلے گئے وہاں سے لونڈی

۱؎ فوائد الفواد ص ۱۰
۲؎ سیر العارفین قلمی ۲۴

اور غلام خریدے وہاں سے واپس آئے اور ان لونڈی اور غلاموں کو لیکر خراسان چلے گئے۔ وہاں سے تم ملتان لوٹے اور پھر اس مسجد میں آگئے میں بھی تمہارے پیچھے دست بستہ پھرتا رہا آخری تم ہی بتاؤ کہ یہ کیسی نماز ہے۔[1]

شیخ حسن افغان نے ۶۸۹/ ۱۲۹۰ میں وفات پائی اور ملتان میں ہی شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کے مزار کے عقب میں دفن کئے گئے۔[2]

۱۔ فوائد الفواد ص ۱۰ نیز سیر العارفین قلمی ۲۴

۲۔ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۵

باب چہارم

تیرھویں صدی عیسوی کے عرفانی آثار

(۱) اصلی آثار

(۲) جعلی آثار

تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام تک زندہ رہنے والے صوفیائے کرام
کو بہت سی تالیفات کا مؤلف سمجھا جاتا ہے اور متعدد علمی آثار کو انکے نام سے نسبت
دی جاتی ہے یقیناً وہ صوفیائے کرام جنکا عرصۂ حیات مذکورہ صدی سے متعلق ہے نہایت تربیت
یافتہ عالم اور صاحب قلم ادیب تھے ان میں سے بعض اعلی درجے کا شعری ذوق بھی رکھتے تھے مگر
بدقسمتی سے بیشتر منظوم و منثور آثار جنکو بعد کے عقیدتمندوں نے انکے نام سے منسوب کرکے
مشتہر کر دیا اور محفوظ رکھا۔ انکی حقیقت ایک بڑا سوالیہ نشان ہے عہد جدید کی تحقیق صدیوں
کا فاصلۂ زمانی حائل ہونے کی بناء پر یہ متعین کرنے سے عاجز ہے کہ واقعی طور سے کون سا
صوفی کس کتاب اور کس رسالے کا مؤلف یا مصنف ہے۔ جن صاحبان عرفان کا گذشتہ
ابواب میں ذکر کیا گیا انکے نقوش اسلامی معاشرہ میں بہت گہرے ہیں خصوصاً اسلامی ہندوستان
کی فکری اور روحانی زندگی کو بامعنی بنانے میں ان بزرگوں نے زبردست کارنامہ انجام دیا ہے
وہ سارے بزرگ اپنی زندگی میں ہی شہرت پا چکے تھے اور اپنی عظمت کا سکہ جما چکے تھے آگے چلکر
جیسے جیسے وقت گذرتا گیا انکی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگوں کے دلوں پر انکی عظمت
کے اثرات اور زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے انکے عقیدتمندوں کی تعداد بھی اس اعتبار سے بڑھتی
چلی گئی کہ ان میں سے اکثر و بیشتر کو اہم سلسلوں کا بانی یا مثلاً موجودہ سلسلوں کا

فروغ دہندہ تصور کیا گیا۔ عوام سے ان بزرگوں کی عقیدت کا رشتہ مزید استوار کرنے کے لئے
بہت سے پیشہ ور قسم کے لوگوں نے متعدد جعلی رسالے اور نصیحت نامے، اوراد و ادعیہ کی کتابیں
منظوم دعائیں اور ملفوظات اپنی طرف سے لکھ کر عوام میں پھیلا دیئے اور ضعیف الاعتقاد مریدوں
نے خلوص و محبت کے جوش میں ایسی تالیفات کو سینے سے لگایا اور آنکھوں پر رکھا۔ ضیاء الدین برنی
صاحب تاریخ فیروز شاہی جو فیروز شاہ تغلق (وفات ۷۹۰/۱۳۸۸) کے عہد یعنی چودھویں صدی عیسوی کے وسط[1]
میں اپنی تاریخ تمام کر رہا تھا اس حقیقت پر شکایتی لہجہ میں روشنی ڈالتا ہے کہ آجکل کتاب فروش
بے شمار جعلی کتابیں بیچ رہے ہیں اور چونکہ عوام الناس کی عقیدت صوفیوں سے بے حد بڑھی ہوئی ہے
اور تصوف کی تعلیمات کا رواج عام ہے اس لئے قرون سابق کے صوفیائے کرام کی تالیفات
کا لوگوں کو بڑا اشتیاق رہتا ہے۔ بازار میں مقدس صوفیوں سے منسوب کتابیں کثرت سے بکتی
ہیں اور تصوف کی تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والے خریداروں کا ہجوم نظر آتا ہے برنی کے عہد میں
یہ صورتحال عام تھی کہ لوگ تصوف کے رسالے اس قدر شوق سے پڑھتے تھے جیسے ہمارے زمانہ میں
یعنی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے تمام دنیا کے ادبیات میں ناول
کا رواج عام ہو گیا ہے اور لوگ فارغ اوقات میں ناولوں کا مطالعہ ذوق و شوق سے
کرتے ہیں، یہ امر زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے کہ اصل کتابوں کے علاوہ متعدد جعلی کتابیں

---

[1] گنج تواریخ ص ۱۷

بھی بازار کی ایک مقبول جنس بنکر لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئیں اور بغیر کسی کاوش اور تحقیق کے بہت سی کتابوں کو واقعی طور سے قرون ماضیہ کے صوفیائے کرام کی تالیفات سمجھا جانے لگا، ہم جانتے ہیں کہ قرون وسطی میں کتابوں کی طباعت کا انتظام نہیں تھا اور چھاپے خانہ کے نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنے والے لوگ کاتبوں کے محتاج تھے البتہ اسلامی تہذیب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پیشہ ور کتاب فروشوں کی کمی نہ تھی اور بہت جلد ایک کتاب جو عالم اسلام کے ایک آخری گوشہ میں لکھی جاتی تھی وہ باقی تمام شہروں میں مشہور ہو جاتی تھی مطلب یہ کہ کتابت تیزی سے ہوتی تھی لوگوں میں پڑھنے کا ذوق اور تجسس شدت کے ساتھ موجود تھا پڑھے لکھے لوگ اپنی آمدنی کا ایک خاصا حصّہ کتابیں خریدنے پر صرف کرتے تھے اور کتاب فروشوں کا کاروبار اچھی طرح چلتا تھا، صوفیوں کے جعلی ملفوظات اور رسائل کی تشہیر کرنے میں مذکورہ عہد کے کتاب فروش بھی بہت بڑی حد تک ذمہ دار ہیں، عام تاجروں کی طرح کتاب فروش بھی چالاک اور بے جھجک ہوتے تھے اور حصول منافع کی ہوس میں جعلی کتابیں لکھوانا اور اُسے بازار میں بیچکر بڑی قیمت وصول کرنا انکا خاص پیشہ تھا، یہ اصول عام ہے کہ پیشہ ور کتاب فروش علمی دیانت کے معاملے میں آج بھی بے پرواہ ہوتے ہیں یہی کیفیت قرون سابق کی بھی تصور کی جاسکتی ہے کتاب فروشوں کی نظر بازار کی مانگ پر رہتی تھی اور یہ محسوس کرنا انکے

لئے مشکل نہ تھا کہ لوگوں کو صوفیوں کی زندگی انکے اقوال اور تعلیمات کے بارے میں جاننے
کی شدید دلچسپی ہے۔ دیگر وجوہات کے علاوہ یہ بھی ایک علت اور حتمی دلیل ہے کہ اصلی
کتابوں کے علاوہ نقلی کتابیں بھی بازار میں آئیں اور انکو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی
مطلب یہ کہ فضا کے آوارہ شہابوں کی طرح بہت سے علمی اور ادبی آثار ہیں جنکی تخلیق
کے بارے میں تحقیق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا اور انکی تالیف کا عرصہ زمانی بھی قطعی متعین
نہیں کیا جا سکتا البتہ چونکہ وہ تیرھویں صدی عیسوی کے بزرگوں سے منسوب کی جاتی ہیں
قطع نظر اسکے کہ وہ اصل عہد کے بعد اور یقیناً بہت بعد میں لکھی گئی ہیں لیکن ہم مجبور ہیں کہ
انہیں تیرھویں صدی عیسوی کی تالیفات کے زمرہ میں شمار کریں۔ تحقیق کی دیانت اور دقت کو
ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں ایک ہی راستہ نظر آتا ہے وہ یہ کہ تمام تالیفات کو دو زمروں
کے تحت رکھ دیا جائے ایک زمرہ واقعی اور حقیقی تالیفات کا جو ایسی کتابوں پر مشتمل ہے
جنکے مؤلفین کی بابت کوئی شبہہ نہیں ہے دوسرا زمرہ ایسی کتابوں کا جن میں سے کچھ اگرچہ اصل
تالیفات سے بھی زیادہ شہرت اور مقبولیت کی حامل رہی ہیں مگر انکے لکھنے والے اور انکا سن
تالیف قطعی طور سے مشکوک ہے۔ ضیاءالدین برنی کی شہادت سے مدد لیکر ہمکو یہ نتیجہ قائم کرنے
میں تامل نہیں ہوتا کہ بہت سے آثار جعلی ہیں۔ انکے مؤلف وہ صوفیائے کرام ہرگز نہیں ہیں

جنکے اسماد مبارک کا ٹھپہ ان کتابوں پر لگا ہوا ہے۔ تحقیق کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کتاب کا مؤلف گمنام ہے تو اس کتاب کو سراسر بے اعتنائی کے ساتھ ردّی کا مال سمجھکر پھینکا نہیں جا سکتا۔ عمر خیام کی طلسماتی شخصیت کا صنف رباعی کی قسمت سے ایک عجیب تعلق ہے اسکے نام کی مقبولیت اور دلکشی کے پیش نظر بعد کے عہد سے تعلق رکھنے والے نہ معلوم کتنے شاعروں کی رباعیاں عمر خیام کے نام سے وابستہ ہوگئیں اور صنف رباعی کے شجرہ میں ایک علاوہ خاندان وجود میں آگیا۔ جو آوارہ گرد رباعیات کے نام سے مشہور ہے اور عرصۂ زمانی نہ متعین ہونے کی بناء پر ان تمام رباعیوں کا ذکر عمر خیام کے ضمن میں کیا جاتا ہے تقریباً یہی کیفیت بعض معروف صوفیائے کرام کے آثار کی نظر آتی ہے اس لئے مجبوراً ہمیں عمر خیام کی آوارہ گرد رباعیوں کی طرح جعلی ملفوظات و تالیفات کا تذکرہ بھی ان ہی بزرگوں کے ضمن میں کرنا پڑیگا جنکے ناموں کے طفیل انکو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی یہ ایک الگ بات رہی کہ کون مصنف لکھو گیا اور کس وقت لکھ گیا۔

تیرھویں صدی عیسوی کی جعلی تالیفات اور ملفوظات کے سلسلے میں ایک نکتہ اور بھی قابل توجہ ہے ان کتابوں کی شہرت محض اس وجہ سے ہی نہیں ہوگئی کہ انکو محبوب شخصیتوں کے علمی آثار پر مشتمل سمجھا گیا۔ انکی مقبولیت کا سبب اتنا ہی نہیں کہ لیلی

سے محبت، لہذا سگ لیلی سے بھی محبت، اصل بات یہ ہے کہ بعض کتابیں جعلی ہونے کے باوجود گمنام مؤلفین کی ذہانت اور استعداد کا پتہ دیتی ہیں انکے لکھنے والے گمنام صحیح اور یقینا ایسی تالیفات کو لوگوں تک پہونچانے میں انکی نیت بھی درست نہیں تھی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض تالیفات ادبی اور فنی اعتبار سے بھرپور دلکشی اور دلچسپی کی حامل ہیں ہم یہ بات تمام جعلی تالیفات کے بارے میں نہیں کہہ رہے ہیں اور نہ اسکو قاعدۂ کلیہ سمجھنا چاہئے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ اکثر جعلی تالیفات نہایت ہنرمندی اور ہوشیاری سے لکھی گئی ہیں اور بیشتر کی خصوصیت یہ ہے کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو صدیوں تک ان بزرگوں کی جعلی تالیفات کو اس قدر ذوق وشوق کے ساتھ نہ پڑھا جاتا اور وہ اتنی بڑی تعداد میں مشتہر نہ ہو پاتیں یہ بھی ایک تعجب کی بات ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کے گذرنے کے کچھ ہی عرصہ بعد ان جعلی تالیفات کے بارے میں صریحی طور سے خبردار کیا جانے لگا اسکے باوجود صوفیوں کی خانقاہوں میں اسکا درس اور مطالعہ بغیر کسی احتیاط اور تأمل کے صدیوں تک جاری رہا۔

سرورالصدور :-

شیخ حمیدالدین ناگوری (وفات ۶۷۳/۱۲۷۴) کا مجموعہ ملفوظات

سرورالصدور سب سے پہلے ہماری توجہ اور تبصرہ کا مستحق ہے اس کتاب کو مندرجہ بالا عنوان کی سب سے پہلی کتاب سمجھنے کا جواز یہ ہے کہ شیخ حمیدالدین ناگوری براہ راست خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے دامنِ تربیت سے وابستہ تھے اور انکے ارشد تلمیذ روحانی اور خلیفہ تھے۔

مذکورہ بالا کتاب سرورالصدور کو ویسے تو شیخ حمیدالدین ناگوری کے پوتے اور خلیفہ فریدالدین محمود کے ایک مرید[۱] نے ترتیب دیا مگر شیخ فریدالدین محمود کی زبان سے اس کثرت کے ساتھ انکے دادا کے اقوال مرقوم ہوئے ہیں کہ تالیف مذکور ایک اعتبار سے براہ راست شیخ حمیدالدین ناگوری سے منسوب ہوگئی ہے۔ سرورالصدور کے صفحات میں شیخ حمیدالدین ناگوری کی شخصیت اور کردار کے روشن مرقعے جگہ جگہ نظر آتے ہیں ہم اس کتاب کو پڑھکر نہ صرف شیخ کی سوانح سے واقفیت حاصل کرتے ہیں بلکہ شیخ کی تعلیمات اور انکے عقائد کا نقشہ بھی پوری طرح ذہن میں واضح ہو جاتا ہے۔ اصلاً سرورالصدور کی تالیف کا کام شیخ حمیدالدین ناگوری

---

[۱] سرورالصدور کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ترتیب دہندہ انکے صاحبزادوں میں سے ہی کوئی ایک تھا کی وفات انکے دو لڑکے تھے ایک شیخ محی الدین اور دوسرے شیخ قطب الدین انوار ۲ ربیع الآخر ۷۳۵ھ کی مجلس کی ابتدا میں فرماتے ہیں "خدمت شیخی و مخدومی و والدی واستادی" (ورق ۱۰) پھر اسی مجلس میں اپنے خرقہ پانے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ہمیں روز بسعادت وشرف خرقہ متبرکہ کہ خدمت مخدومی والدی را از خدمت شیخ المشائخ قطب الاولیا جدی الاعلی قدس اللہ رسیدہ بود این ضعیف را بتشریف آن خرقہ متبرکہ مشرف گردانیدند۔ (ورق ۱۱)

کی وفات سے تقریباً نصف صدی بعد شروع ہوا مگر یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صوفیائے کرام کا مشاہدہ اور حافظہ نہایت توانا اور سالم ہوتا ہے شیخ فریدالدین محمود کو اپنے جد بزرگوار کے اقوال اچھی طرح یاد تھے اور وہ ضروری باتوں کا تذکرہ بڑی احتیاط کے ساتھ محفوظ کر گئے ہیں۔ ضمناً یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ سرورالصدور کا خاصا حصہ خود فریدالدین محمود کے مقالات و حوالوں پر مشتمل ہے مگر اس تالیف کی تاریخی اہمیت کا اصلی سبب وہی ہے کہ اس کے اندر سب سے پہلی بار خواجہ معین الدین چشتی کے جلیل القدر خلیفہ اور مرید کی تصویر سامنے آتی ہے اور سلسلہ چشتیہ کی حرکت و رفتار کے خطوط واضح ہو جاتے ہیں

شیخ حمیدالدین ناگوری کو انکے مرشد خواجہ معین الدین چشتی نے سلطان التارکین کا لقب دیکر انکے مرتبے کو واضح کر دیا تھا سرورالصدور میں ایک موقع پر وہ گفتگو بھی نظر آتی ہے جس کے ذریعہ بہت سے مسائل پر چشتی اور سہروردی سلسلوں کے جداگانہ رجحانات کا پتہ چلتا ہے دونوں سلسلوں کے مشائخ میں سب سے بڑا اختلاف متاع دنیا یعنی غلہ اور نقدی جمع کرنے کی بابت تھا سہروردی صوفی شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی اپنی خانقاہ کے اندر خاصی مقدار میں غلہ اور نقدی جمع رکھتے تھے اسکے برخلاف چشتی مشائخ مکمل ترک و قناعت اور خالی ہاتھ رہنے کے اصول پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ شیخ حمیدالدین ناگوری

اور انکے سہروردی معاصر شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے درمیان مکاتبت ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے نقطۂ نظر کے سلسلے میں مطلع کیا البتہ سرور الصدور میں ان دونوں کی آمنے سامنے گفتگو کا حوالہ ملتا ہے جو کہ دہلی میں ایک تاریخی ملاقات کے دوران ہوئی ۔ دونوں بزرگ سلطان التمش کی دعوت پر ایک محفر میں شرکت کرنے کے لئے دہلی تشریف لائے تھے۔ یہ محفر شیخ جلال الدین تبریزی پر لگائے گئے ایک الزام کے سلسلے میں منعقد کیا گیا تھا جو ایک علحدہ اور طولانی قصّہ ہے۔ سرور الصدور میں مندرج گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ حمید الدین ناگوری مراسلت کے ذریعہ اپنے سہروردی معاصر کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے کیونکہ وہ براہ راست ملاقات میں بعض انھیں سوالات کو اٹھاتے ہیں جو اپنے خطوط میں قبلاً لکھ کر بھیجے تھے۔

سرور الصدور کی تمامتر مجالس ۱۲۲۳ / ۶۲۳ھ سے لیکر ۱۲۳۴ / ۶۳۴ھ تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ زمانہ گیارہ برس کے عرصہ کی روداد پیش کرتا ہے۔ خود شیخ فرید الدین محمود کی وفات بھی ۱۲۳۳ / ۶۳۳ھ میں ہی ہوئی کتاب کے ورق ۲ دو پر مندرج عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکی ترتیب و تدوین کا کام فرید الدین محمود کی وفات کے بعد کیا گیا، عبارت ہے:

"از نصائح و واعظات و امثال و حکایات و لطائف و نکات رموز و اشارات و سرّیج و کنایات نہ چنداں کہ شنیدہ شدہ است توان نبشت امّا ہمان مقداری کہ درخاطر فاطر گنجیدہ است و فہم مختصراً آنجا رسیدہ است و معلوم شدہ و در دل یاد ماندہ بود نبشتہ شدہ تا یادگار ماند"

مختلف مجلسوں کی ابتدا میں مذکور تاریخوں سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یادداشت بیاض کی شکل میں ضرور موجود رہی ہوگی جسے بعد میں ترتیب دیا گیا اس ملفوظ کا نام سرورالصدور رکھنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں ۔

"این ملفوظ را "سرورالصدور و نورالبدور" نام نہادہ آمد تا خوانندہ و بینندہ و شنوندہ را سرور دلہا و نور دیدہ ہا باشد" ع[1]

زبدۃ کر شیخ حمیدالدین ناگوری نے راہ حق اول سے آخر تک اس بیت میں تمام کیا ہے:

اول زصفات حق برانگیز و بگو   پس راہ سوئے ذات اگر ہست بگو
آنگاہ دل از غبار اغیار بروب   جان را زصفت بآب تنزیہ بشو ع[2]

شیخ حمیدالدین ناگوری ترک کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ کہاں ہے وہ روندہ جو کہتا ہے کہ میں نے تمام مراتب و منازل طے کرلئے ہیں تاکہ میں اس سے کہوں کہ اب تک اس نے راہ خدا میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا ہے اول قدم اس راہ میں ترک دنیا ہے کون ہے جس نے ترک دنیا کیا ہے[3] ۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ میرے لئے کیا لایا ہے بلکہ یہ پوچھے گا کہ اے میرے بندے تو نے کیا ترک کیا تھا اسے لا اور دکھا[4] ۔

ع[1] سرورالصدور قلمی ۱
ع[2] ایضاً " ۲
ع[3] ایضاً " ۳
ع[4] ایضاً " ۱۹

فرماتے ہیں کہ" جس نے خدا کو روزی دیتے وقت نہیں پہچانا وہ کبھی نہیں پہچان سکتا پانی پینے کے بعد جو خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے وہ خالص شکر ہوتا ہے دیگر شکر ادا کرنے کے مقابلے میں"[1] آپ کا ایک مرید لیسین نامی تھا وہ بہت خوشحال تھا ایک بار سفر میں اسکے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا جب وہ اس سفر سے واپس آیا تو اسکا تمام اسباب دنیوی ختم ہوچکا تھا اسکے سلسلے میں آپ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا سوچا کہ لیسین کے لئے خدا سے کچھ دنیا مانگوں لیکن پھر اسپر شفقت آتا ہے کہ اسکو دنیا میں کیوں گرفتار کروں"[2] ایک مرتبہ شیخ جیو نے حمیدالدین ناگوری سے پوچھا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ جب میں جوان تھا اور مجرد تھا تو جو بھی ضرورت ہوتی وہ دعاء کرنے سے فوراً پوری ہوجاتی اور اس وقت جبکہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور میرے بچے بھی ہیں تو جو بھی حاجت ہوتی ہے وہ دعاء کرنے پر دیر سے پوری ہوتی ہے تو اسکے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اے شیخ تم پر مریم کا قصہ روشن ہے جس وقت وہ مجرد تھی بغیر اسکے مانگے ہوئے زمستانی پھل تابستان میں اور تابستانی پھل زمستان میں آجاتا تھا اس لئے کہ اسکا دل خدا کی یاد میں لگتا تھا لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو مریم منتظر رہتی کہ اسی طرح سے پھل آتا رہے تو فرمان خداوندی ہوا: "وهُزّي إليك بجذع النخلة" (جنبش دے اپنی

---

[1] سرور الصدور قلمی ۶

[2] الضاً " ۳

[3] الضاً " ۸

طرف خرمے کے درخت کو۔ یعنی اب بیٹھ کر رزق کا انتظار مت کر)

ایک بار استاد علیہ شیخ عبداللہؒ تستری پڑھا جا رہا تھا اس میں ہے کہ
مستقطار نامی فرزندان آدم میں سے ایک شخص تھا اس نے جنبیان سے ایک ایسی دعا سیکھی تھی
جسکی وجہ سے اسے کھانے اور پانی کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی وہ اس طرح عبادت کرتا تھا
کہ اسی ۸۰ سال کے بعد ایک بار سر سجدہ سے اٹھاتا اس بات کے سنتے ہی شیخ حمید الدین ناگوری
نے فرمایا سبحان اللہ میں نے آج ہی اپنی عمر کا حساب کیا ہے اسی سال ہوئے آج جو میں
خدا کی عبادت کرتا ہوں خدا مجھ سے کہیگا کہ اے حمید تو اس اسی سال کا کیا حساب لگاتا ہے
میرے ایسے بھی بندے ہیں کہ جس قدر تیری عمر ہے اتنا وقت انہوں نے ایک سجدہ میں گذارا ہے
پھر فرماتے ہیں کہ درویش کو بلند ہمت ہونا چاہیئے کہ ترک دنیا کا یہی راستہ ہے آدمی تکلیف
اٹھاکر ہی آرام میں پہونچتا ہے اور سلوک یہی ہے کہ آدمی بری صفت کو چھوڑکر اچھی صفت اختیار کرے۔[ع۱]
ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "صوفیوں کی باتوں کو "نزہات الصوفیہ" اس لئے کہتے ہیں کہ ان باتوں کے معنی
کہنے والے پر ظاہر نہیں ہوتے (سخن صوفیان را ازان نزہات الصوفیہ گویند کہ معنی سخن در گوینده پیدا نیست)[ع۲]
فرماتے ہیں کہ جوکچھ تو منبر پر کہے پہلے خود اس پر عمل کرے[ع۳] کہتے ہیں احکام ربانی کا ہر حکم کسی

ع۱ سرور الصدور قلمی ۱۰
ع۲ ایضاً " ۱۴
ع۳ ایضاً " ۱۹

نہ کسی عظمت کی وجہ سے ہے۔[1] خدا سے دعویٰ محبت کرنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ:

"زنہار دعویٰ محبت نہ کنی کہ چون دعوی را معنی طلبند در مانی ہر گدای را نرسد کہ دعوی محبت پادشاہ کند تا ہر گدائے نتواند کہ بر بساط پادشاہ جای یابد من و تو کہ در بند نفس امارہ گرفتار باشیم کی باشد کہ دعوی محبت پروردگار کنیم"۔[2]

ترک کے سلسلے میں ہی فرماتے ہیں کہ کل خدا یہ پوچھے گا کہ اے میرے بندے کونسا ترک لائے ہو؟ یہ نہیں کہے گا کہ کون سا عمل لائے؟ کیونکہ بندۂ مفلس کے پاس کیا ہے جو اس کی خدمت میں لے جائے۔[3] ترک دنیا کے ہی سلسلے کا ایک واقعہ ہے کہ حاتم اصم جو شفیق بلخی کے شاگرد تھے ایک بار شفیق بلخی نے ان سے پوچھا کہ تم دس سال میری خدمت میں رہے اس عرصہ میں کیا سیکھا انہوں نے جواب دیا کہ میں نے آٹھ مسئلے (باتیں) سیکھے جب یہ مسئلے انہوں نے شفیق بلخی کو بتائے تو انہوں نے اسے سنکر کہا کہ جو یہ مسئلہ جان لے اور اس پر عمل کرے وہ ایسا ہے کہ اس نے چار کتابیں توریت انجیل زبور اور قرآن پڑھ لیا ہے اور اس پر عمل کیا ہے"۔ جب شیخ حمید الدین ناگوری کے پاس اس مسئلہ پر بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا اس آدمی کے لئے ان آٹھ مسئلوں کی بھی ضرورت نہیں جس نے دنیا کو ترک کر دیا ہو اور دنیا کے گرد چکر نہ لگاتا ہو وہ ایسا ہے کہ جیسے اس نے چار کتابیں پڑھ لی ہوں اور اس پر عمل کرتا ہو"۔[4]

ع۱ سرور الصدور قلمی ۲۶
ع۲ ایضاً " ۴۱
ع۳ ایضاً " ۲۳
ع۴ ایضاً " ۸

رسالہ اصول الطریقہ :۔ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کی تصنیف ہے معلوم ہوتا ہے کہ

زیر نظر رسالہ کسی ضخیم کتاب کا کچھ حصہ ہے اسکے طویل اقتباسات شیخ عبدالحق نے

بھی اپنی کتاب اخبار الاخیار[1] میں دئے ہیں۔ یہ کتاب شیخ حمید الدین ناگوری نے سالکان

راہ شریعت کی اصلاح و تربیت کے لئے لکھی ہے چنانچہ خود رسالہ کے آخر میں فرماتے ہیں:

"این رسالہ برای دوستان در قلم آوردہ شد تا آئینہ روزگار خود سازند و

در آوان فراغت در مطالعہ دارند تا خود را درمیان کدام قوم این بیابند تا

از دست پندار خلاص یابند"

زیر نظر رسالہ پانچ اوراق پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں فرماتے ہیں کہ

راہ سلوک کے جوانمرد جنکا مقصود بارگاہ خداوندی ہے وہ تین قسم کے ہیں، معذور،

مشکور اور فانیان۔ معذور ایسے لوگ ہیں جو خدا اور رسول پر ایمان اور توحید

کے اقرار کے باوجود عبادت کے لئے حاضر نہیں ہوتے اور اگر آتے بھی ہیں تو کاہلی

اور دیر سے۔ مشکور وہ ہیں جو خدا کے تمام احکام دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں

اور اس پر عمل کرتے ہیں اور فانیان وہ ہیں جو "اَلَستُ بِرَبِّکُم" (کیا میں تیرا رب نہیں ہوں)

کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور اسکے جواب "قَالُوا بَلٰی" (ان لوگوں نے کہا کیوں نہیں) پر عمل

پیرا رہتے ہیں یعنی وہ اس دنیا کے وجود میں آنے سے قبل ہی خطاب ازلی اور

---

[1] اخبار الاخیار ص ۳۷

جواب لم یزلی کو قبول کر چکے ہیں اور ابتدا ہی سے رموز الٰہیہ کی طلب کے لئے کمر بستہ

ہو کر میدان عمل میں آ چکے ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے گمنامی کی

زندگی گزار کر وفات پائی ۔ پھر فرماتے ہیں کہ سلوک کے درجات میں سے پہلا درجہ

علم ہے بغیر علم کے مقررہ طریقوں سے بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔ طریقت کے مراتب

کا دوسرا مرتبہ عمل ہے جو بغیر علم کے ممکن نہیں تیسرا درجہ نیت ہے بغیر نیت

کے صحیح عمل ممکن نہیں چوتھا مرتبہ صدق و سچائی ہے کیونکہ بغیر صدق کے عشق تک

رسائی ممکن نہیں۔ پانچواں مرتبہ عشق ہے یعنی اس راستے پر چلنے والے کو عاشق ہونا

چاہئے بغیر عشق کے توجہ درست نہیں ہوگا چھٹا مرتبہ توجہ ہے کہ بغیر توجہ کے سلوک

نہیں ملتا ۔ ساتواں مرتبہ سلوک ہے اسکے بغیر خدا کی حضوری کا دروازہ نہیں کھلتا

اور آٹھواں مرتبہ حضوری ہے اسکے بغیر آدمی مقصود تک نہیں پہونچ سکتا ۔ غرض

سلوک کے درجات کی تفصیل بتانے کے بعد فرماتے ہیں کہ سلوک کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ

سالک ہر دو عالم سے بے خبر ہو کر خدا سے لو لگالے کیونکہ اسکے علاوہ تمام چیزیں

نیست و نابود ہونے والی ہیں ۔

مندرجہ بالا تفصیل کے بعد سالک کی سہولت کے خاطر سوال و جواب

کے ذریعہ شریعت و طریقت کے مختلف مسائل اور ان کا حل لکھا ہے چیدہ اہم سوال درج ذیل ہیں :

(۱) جب انسان مرجاتا ہے اور اسکی جان اسکے جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو پھر اپنے

اصل کی طرف لوٹتی ہے یا نہیں۔

(۲) دنیا کیا ہے (۳) خدا کی مدد کب ملتی ہے۔

(۴) شریعت اور طریقت کو کیسے ایک سمجھیں (۵) بہشت اور دوزخ کیا ہے۔

(۶) خدا کہاں ہے تاکہ اسکی طرف دل کا رخ کیا جائے۔

(۷) جب خداوند قدوس خود پردہ پوش ہے تو وہ قیامت کے دن کیسے انسانوں کی

پردہ دری کریگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ صاحب سیر الاولیا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب سلوک کو جو مشکلات پیش آتی تھیں تو وہ شیخ حمید الدین ناگوری سے سوال کرتے تھے اور وہ انکا تشفی بخش جواب دیتے تھے (سیر الاولیا ص ۱۷۰) معلوم ہوتا ہے بعد میں کسی شخص نے ان سوالات اور اسکے جواب کو یکجا کر دیا ہے۔

رسالہ فی السماع :- یہ رسالہ شیخ حمید الدین ناگوری کی تالیف ہے اور دس اوراق پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اسکے نام سے ہی ظاہر ہے یہ رسالہ سماع سے متعلق ہے اور اسکی حمایت میں لکھا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ سماع حرام ہے یہ صحیح ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ سماع حلال ہے یہ زیادہ صحیح ہے جو سماع کو حرام کہتے ہیں وہ متابعت علم کرتے ہیں اور جو اسے حلال بتاتے ہیں وہ متابعت عشق کرتے ہیں متابعت علم تو صحیح ہے لیکن متابعت عشق زیادہ صحیح ہے کیونکہ علم عشق کے متابع ہے لیکن عشق علم کے متابع نہیں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ سماع عالموں کے لئے حرام ہے لیکن عاشقوں کے لئے حلال۔

رسالہ حمید الدین ناگوری :- یہ رسالہ دو اوراق پر مشتمل ہے اس رسالے میں بندگان بزرگ زادہ کے تین گروہ واقفان، سالکان اور واصلان کی

خصوصیات اور انکے مرتبے کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں ۔ اس رسالے کی تصنیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"چون دیدم کہ خلق بیکبار روی از کار بگردانیدہ اند و پشت بر آوردہ اند و ہمت قاصر شدہ است و بہ سبب آن خلق بہوا و ہوس مشغول شدہ اند راہ خداوند جل ذکرہٗ بر ایشان پوشیدہ شدہ است و گمراہی را راہ نام کردہ و راہ را گمراہی لقب نہادہ خواستم کہ تا بر سبیل ایجاز و اختصار کہ خیر الکلام ما قل و دل و لم یمل کلمۂ چند از راہ بنویسیم کہ بہ فہم نزدیک بود و از ساحت دور این رسالہ تحریر افتادہ تا خفتگان را سبب بیداری بود و بیداران را سبب رستگاری"

آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ رسالہ دوستوں کے لئے لکھا ہے تاکہ وہ اسے پڑھیں اور غور کریں کہ وہ ان گروہوں میں سے کس گروہ میں ہیں ۔

مراتب راہ شریعت :— یہ رسالہ آٹھ اوراق پر مشتمل اور شیخ حمید الدین ناگوری کی ہی تالیف ہے اس رسالہ میں سالک کے لئے خدا تک پہونچنے کے لئے مختلف منازل مثلاً عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت، اور عالم لاہوت کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ان مقامات کی خصوصیات اور ان تک پہونچنے کے طریقے بتائے ہیں۔ جس میں سالک کو توبہ کرنے وقت باوضو رہنے، پنج وقتہ نماز ادا کرنے، مقررہ اوقات

میں مقررہ ورد بلا ناغہ پڑھنے۔ قرآن کی تلاوت کرنے غرض دن اور رات کے تمام

اوقات کی نمازوں، عبادات، اوراد اور نیک کام کے کرنے کی تلقین کرتے ہیں پھر شریعت

اور طریقت کے فرق کو بیان کرنے کے بعد اسکی اہمیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ شریعت

دنیا کو چھوڑ دینا اور عقبیٰ کو پکڑنا ہے اور طریقت عقبیٰ کو چھوڑنا اور مولیٰ کے ساتھ

ہونا ہے مرید کے لئے پیر کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرید پیر کے

بغیر خود رو پودے کے مانند ہے جسکا پھل میٹھا نہیں ہوتا۔

مکتوبات حمیدالدین ناگوری: — حمیدالدین ناگوری کی ایک یادگار تالیف

جسکے اصل ہونے میں کبھی کوئی شبہہ نہیں کیا گیا انکے مکتوبات کا مجموعہ ہے اگرچہ یہ مجموعہ

نہایت ہی مختصر ہے اور صرف پانچ خطوط پر مشتمل ہے ان میں سے دو خطوط ایسے ہیں

جو انہوں نے سہروردی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کو لکھے ہیں ان

خطوط سے دونوں مسلکوں میں پائے جانے والے فرق کا اندازہ ہوتا ہے دو خطوط اپنے

لڑکے عزیزالدین کے نام اور ایک خط شیخ فریدالدین گنجشکرؒ اجودھنی کے نام ہے انکے

بعض خطوط کا ذکر امیر خورد کرمانی نے اپنی تالیف سیرالاولیاءؒ میں کیا ہے ان خطوط

کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

اس خط میں جو انہوں نے اپنے لڑکے عزیزالدین کو لکھا ہے اس کی

ابتدا میں انسان کی پیدائش کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ خدا فرماتا ہے کہ میں نے انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت بخشی انسان کی تخلیق اور فضیلت کے دو اسباب تھے ایک اسرار کا اظہار " إنی أعلم مالا تعلمون" (میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے) دوسرے اس بات کی تصدیق کہ " وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" (ہم نے جن وانس کو صرف عبادت کے لئے پیدا کیا) ۔

اپنے دوسرے خط میں انہوں نے عزیزالدین کو برے لوگوں کی صحبت سے دور رہنے کی تلقین کی ہے اور اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اشعار بھی لکھے ہیں ۔

یاری کہ ترا ازو نیاید یاری　　آن بہ کہ طمع زخیر او برداری
چون صحبت یار بد زہر بدتر است　　تو بد کنی و نیک طمع میداری

بگریز زیار بد دلا بگریز　　بشنو زمن این حدیث وباہم مستیز
با مار سیاہ نشین وباوی منشین　　کین پند مراست زپیر گردیز

شیخ حمیدالدین ناگوری کے دو خطوط بہاءالدین زکریا ملتانی کے نام ہیں اس میں دنیا کی خرابی کے بارے میں حدیث رسول صلعم نیز صحابہ کرام اور مختلف مشائخ کے اقوال کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اسکے باوجود لوگ کیوں دنیا سے التفات کرتے ہیں[۱]۔ اپنے دوسرے خط میں شیخ حمیدالدین ناگوری بہاءالدین زکریا ملتانی سے اپنے خط کا جواب نہ ملنے کی شکایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا نے اپنے فضل سے اس خط کا جواب بھیجا جو درج کیا جاتا

---

[۱] اس خط کا ذکر سیرالاولیا میں بھی موجود ہے ملاحظہ ہو سیرالاولیا ص ۱۶۸-

ہے اس جواب میں انہوں نے تین گروہ مجردان، آمیختگاں اور بہشتیاں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے تاکہ سالکوں کو اس سے مدد ملے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری کا وہ خط جو انہوں نے شیخ فریدالدین گنجشکر کے نام لکھا ہے نامکمل معلوم ہوتا ہے اس خط میں انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کتاب زبور کی اس عبارت کو لکھا ہے۔

"ذکر مدام حجاب قرب باشد و قرب مدام حجاب انس می گردد و در زمان انس لذت وصل در توقف می افتد فی الجملہ اگر تواند از عالم گفتگوی روی بعالم جست وجوی آرد تا بود کہ جمال معنی در نظر آید و از عالم نہاں باخبر باشد"

طوالع الشموس : —— قاضی حمیدالدین ناگوری

قاضی حمیدالدین ناگوری کی مندرجہ بالا تالیف سہروردی سلسلے کی بالکل ابتدائی اور اہم تالیف ہے اس کتاب کا نفس مضمون اسمای الٰہی اور صفات الٰہی سے متعلق ہے شیخ نے مختلف اسماء مثلاً ھُوَ، رحمان، رحیم، ملک، قدوس، عالم الغیب والشہادت وغیرہ وغیرہ پر نہایت تفکر اور گہرے تجسس کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کتاب کی ابتداء کا عنوان یہ ہے کہ تقریباً ہر اسم الٰہی کی بحث ایک جداگانہ باب معلوم ہوتی ہے واضح رہے کہ سب سے پہلا باب کلمہ مبارک ھُوَ سے شروع ہوتا ہے

جو خاصا تفصیلی اور طولانی ہے کتاب میں صوفیوں کے دوسرے اہم اور مانوس موضوعات مثلاً فنا، بقا، نفس اور معرفت وغیرہ کے موضوعات پر بھی تبصرے موجود ہیں۔ **طوالع الشموس** کے مطالعہ سے ایک گمان اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اس میں قاضی حمید الدین ناگوری کے کسی مرید نے اپنے قلم سے اضافے بھی کئے ہیں البتہ اضافوں پر مشتمل ملفوظ شیخ کے معتبر اور مستند اقوال کا ذخیرہ ہے اور اس میں کوئی چیز فرضی اور مشکوک نہیں ہے ہمارے اس گمان کی بنیاد اور دلیل اس نکتہ سے فراہم ہوتی ہے کہ کتاب کے بعض ابواب میں "ذکر اللہ خیر" کی اصطلاح ہر جملے کی ابتدا میں نظر آتی ہے اور کہیں کہیں جملہ فرمودند کے لفظ سے شروع ہوتا ہے یہ دونوں اصطلاحیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اسے خود قاضی حمید الدین نہیں بلکہ انکا کوئی مرید لکھ رہا ہے جو شیخ کی مجلسوں کا شاہد عینی رہ چکا ہے البتہ یہ کیفیت پوری کتاب میں نہیں ہے۔ اگر کتاب کا کچھ حصہ الحاقی بھی ہے تو اضافہ مستند اور معتبر مرید کے قلم سے ہوا ہے کتاب کا اصل متن جو مباحث پر مشتمل ہے یقیناً وہ شیخ ہی کے قلم اور دماغ کا نتیجہ اور لب لباب ہے کتاب میں جگہ جگہ عربی اور فارسی کے اشعار کا برمحل استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے "ای برادر" اور "اے عزیز" کے القاب

سے جگہ جگہ خطاب کیا ہے۔ طوالع الشموس میں مختلف مباحث کے دوران کتابوں کے حوالے بھی دئے گئے ہیں زیر نظر نسخہ ماہ ذی الحجہ ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۲ء کا مکتوبہ ہے اور یہ کتاب کی پہلی جلد ہے جو ایک سو چونتیس [۱۳۴] اوراق پر مشتمل ہے۔ اسکی دوسری جلد راقم کو نہ مل سکی۔

شرح اربعین:۔ قاضی حمیدالدین ناگوری کی ایک تالیف شرح اربعین کے نام سے بھی موجود ہے جو ۸۷ مختصر اوراق پر مشتمل ہے اور ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء کی کتابت شدہ ہے۔ صوفیای کرام کے حلقوں میں نبی کریم کی چالیس حدیثوں کا انتخاب ہمیشہ سے مقبول رہا ہے اور ان حدیثوں کا مطالعہ تصوف کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہے قاضی حمیدالدین ناگوری نے بھی ان چالیس حدیثوں پر مبسوط شرح لکھی ہے اور یہ شرح صوفیوں کی خانقاہوں میں مدتوں تک درسی کتاب کے طور پر مستعمل رہ چکی ہے بعض محققین نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ شرح اربعین واقعی قاضی حمیدالدین ناگوری کی تالیف ہے بھی یا نہیں البتہ قاضی حمیدالدین ناگوری کی تالیف ہونے کے حق میں ایک دلیل ضرور پیش کی جا سکتی ہے کہ شرح اربعین کی زبان اور اسلوب کا لہجہ طوالع الشموس سے بالکل نزدیک اور ملتا جلتا ہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری کی بعض دوسری تالیفات کا ذکر بعد کے ماخذوں میں ملتا ہے انکی ایک کتاب لوائح یا لوامع کے نام سے بہت ہی مقبول اور معروف تھی جسکو چشتیہ اور سہروردی دونوں سلسلوں کی خانقاہوں میں بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھا جاتا تھا مگر یہ کتاب اب مفقود ہوگئی ہے محمد بن تغلق کے عہد کا ایک دانشمند رکن الدین عماد اپنی کتاب شمائل عدقیہ میں حمید الدین ناگوری کی ایک اور کتاب "مقاصد" کا ذکر کرتا ہے یہ بھی ناپید ہے ۔

دیوان جمال الدین ہانسوی :-

قدیم تذکروں میں شیخ جمال الدین ہانسوی کے ذوق شاعری کا ذکر تو موجود ہے لیکن کسی بھی تذکرہ نگار نے انکے دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے[1] پروفیسر مسعود احمد حیدرآباد مغربی پاکستان نے اپنے مضمون جمال الدین ہانسوی الخطیب میں انکے دو دیوان دیوان غزلیات اور دیوان رباعیات کا ذکر کیا ہے جو طبع بھی ہو چکا ہے راقم الحروف کو تلاش کے باوجود اسکا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا اس لئے پروفیسر مسعود احمد صاحب کے اس مضمون سے ہی استفادہ کیا جارہا ہے ۔ دیوان غزلیات ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں اشعار کی مجموعی تعداد ۸۴۳۶ ہوتی ہے اسی طرح دیوان رباعیات میں ۲۳۲ صفحات ہیں اور اس میں اشعار کی مجموعی تعداد

[1] مثلاً اخبار الاخیار ص ۴۷ [illegible]

معلوم ہوتی ہے ان دیوانوں میں انہوں نے حمدیہ، مدحیہ، اخلاقیہ، عاشقانہ، مناجاتیہ اشعار کے علاوہ تصوف کے بھی تمام پہلوؤں مثلاً معرفت و حقیقت، ریاضات و مجاہدات زہد و فقر، اخلاص و اطاعت، توکل و تواضع، قبض و بسط، فنا و بقا، ترک نفس وغیرہ کے مضامین کو بھی لیا ہے۔

ریاضات و مجاہدات میں یہ نظم ملاحظہ ہو :-

ای تن بدل در آر ہوائے مجاہدہ — و آنگاہ زن چو مرداں رائے مجاہدہ

بشنو ز خادمانِ مشائخ بگوش جان — در شہر جست جو شدہ ندائے مجاہدہ

روئے مراد چہرۂ مقصود بنگری — چون بنگری نخست لقائے مجاہدہ

تا روز و شب برستی درد خدائے را — درد دین بساز بنائے مجاہدہ

در دشت و کوہ برگذر واستماع کن — راز جیب راز صلائے مجاہدہ

چوں برپئے مجاہدہ باشد مشاہدہ — مگر بیں وسیلۂ تو درائے مجاہدہ

این دم خوری جمالا صد شربت وصال — گر آب خوردۂ ز اِنائے مجاہدہ

(ص - ۱۵۷)

زہد و فقر میں درج ذیل نظم ملاحظہ ہو :-

پادشاہی در گدائی یافتم — خود گدائی بادشاہی یافتم

می نیابد بادشاہے در جہان — آنچہ من اندر گدائی یافتم

جمعیت اندر غنا دیدم مدام — در گدائی پارسائی یافتم

فقر را تاریک گوید عالمے — و اندرو من روشنائی یافتم

من چو محتاجم گدا باشم بلے — مملکت وصفِ خدائی یافتم

چون گدائی عرضه کردم از نیاز　　　بر در خلق آشنائی یافتم

بس جدا گشتم ز هستی چون جمال　　　وصل او اندر جدائی یافتم

(ص - ۱۲۳)

توکل اور قناعت میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں :—

بہر کارے توکل بر خدا کن　　　دریں درگاہ خود را آشنا کن

مرو ہے ہے بکوئے ہر گدائے!　　　گذر دائم بکوئے بادشا کن

ز روئے ہمت عالی درش گیر　　　در مخلوق را زیں پس رہا کن

بدل یکتا شو اندر حب مولی　　　بخدمت قامت نخوت دوتا کن

بدو پیوند از جاں تا بود جاں　　　دل از درد نفسانی جدا کن

چو داری علت ہجر جدائی　　　بیادش علت خود را دوا کن

مگر صبح لقایش را بہ بینی　　　بہ آب دیدہ در شبہا رہا کن

جمالا در ہوایش میرواں دم　　　گروہ عاشقاں بر خود گوا کن

(ص - ۱۵۴ - ۱۵۵)

شیخ جمال الدین ہانسوی نے اپنی رباعیات میں بھی آداب طریقت کو بیان کیا ہے مثلاً طاعت الٰہی میں یہ رباعی ملاحظہ ہو :—

گر دوست ز معصیت بداریم ہمہ　　　پس در طاعت عمر گزاریم ہمہ

زیں کردہ مگر آب روئے یابیم　　　روزی کہ سر از خاک بر آریم ہمہ

(ص - ۷۸)

اخلاص میں یہ رباعی ملاحظہ ہو :—

در طاعت مرد بے خلل اخلاص است　　　در قافلۂ خیر جمل اخلاص است

می کن عمل نیک ولے با اخلاص　　　زاں روئے کہ جان ہر عمل اخلاص است

(ص - ۷۹)

فنا و بقا میں یہ رباعی ملاحظہ ہو :۔

عشق ز بہر تو پذیریم بریم — در پے تو حیات گیرم بریم
مردن من از پے تو زیستن است — اندر غم تو اگر بمیرم بریم
(ص-۱۳۱)

قبض و بسط میں یہ رباعی ملاحظہ کریں :۔

در حالتِ بسط زہر ہمچو شکر است — در حالت قبض شہد زہر دگر است
ایں حالت قبض و بسط در راہ طلب — آں کس داند کہ او ز حق باخبر است
(ص-۱۶۵)

مذمت نفس میں یہ رباعی ملاحظہ فرمائیں :۔

نفس تو بت ست، بت پرستی کم کن — در میکدۂ مراد مستی کم کن
تا یار ترا بار دہد بہر وصال — در حال فنا پذیر و ہستی کم کن

انیس الارواح

انیس الارواح شیخ عثمان ہروانی کے مجموعۂ ملفوظات کی حیثیت سے
وجود میں آئی اور اس مجموعے کا ناقل اور محرر شیخ عثمان ہروانی کے خلیفہ اور مرید خواجہ معین الدین چشتی
کو قرار دیا گیا مذکورہ کتاب کو صوفیوں کے جعلی ملفوظات کی پہلی کڑی شمار کرنا چاہئے بعد
میں جعلی ملفوظات کا ایک کثیر ذخیرہ جمع ہوگیا اور عہد سلطنت میں کتاب فروشوں کی
دکانیں اس نوعیت کی کتابوں کے ذریعہ خوب چمکیں البتہ شیخ سعدی کا مشہور مقولہ
انیس الارواح پر بالکل صادق آتا ہے کہ بنیاد ظلم در جہاں اندک بود . .

صوفیائے کرام کا علمی اور ادبی ذوق بے شک کامل ہوتا تھا اور روحانی
تربیت کے علاوہ انکی ذہنی تربیت بھی اس انداز سے ہوتی تھی کہ وہ قدرتی طور سے اپنے کو
اعلی درجے کا ادیب ثابت کرتے تھے صوفیوں نے ادب کے مختلف میدانوں میں اپنے قلم کو
آزمایا بعض نے خطوط کی شکل میں اپنے افکار کو پیش کیا بعض نے اپنی سوانح لکھی مگر وہ
صنف ادب جسکو آج ہم ملفوظات کے عنوان سے جانتے ہیں اسکا رواج شیخ نظام الدین اولیا
سے شروع ہوتا ہے صوفیوں کے تخیل اور انکے قوت ایجاد پر حیرت کے ساتھ داد دینی
پڑتی ہے کہ انہوں نے نہایت مربوط طریقے سے ہندوستان کے تمام قدیم مشائخ کے
ملفوظات کا ایک مربوط ذخیرہ تیار کرکے اہل خانقاہ کے سامنے پیش کردیا اور لطف

کی بات یہ ہے کہ ہر بڑے صوفی کو اپنے شیخ کے ملفوظات کا جمع کنندہ قرار دیا وہ بڑی

فنکاری اور استادی کے ساتھ کڑی سے کڑی ملاتے چلے گئے جس سے فارسی ادب میں ایک

نہایت تازہ دلچسپ اور بامقصد صنف کا اضافہ ہوا۔ جعلی ہونا الگ بات ہے مگر

اس صنف کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جسکو ہم ملفوظات کہتے ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی ذات سے جس کتاب کو نسبت ہو اسکا

مشہور و مقبول ہونا فطری بات تھی انیس الارواح کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب

شیخ نظام الدین اولیاء کی وفات کے فوراً بعد اور انکے خلیفہ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی

کی زندگی میں ہی شہرت پا گئی تھی اور اسکے نسخے بازار میں بے تحاشا بکنا شروع ہو گئے تھے

شیخ نصیرالدین چراغ دہلی خود اس کتاب کی تردید کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وضاحت پیش

کرتے ہیں کہ خواجہ معین الدین چشتی نے اس نوعیت کے ملفوظات جمع نہیں کئے[۲] شیخ نصیرالدین

چراغ دہلی سے قبل انکے مرشد شیخ نظام الدین اولیاء بھی اس بات کی وضاحت کر چکے تھے کہ

ہمارے بزرگوں نے یعنی چشتی سلسلے کے مشائخ نے کوئی کتاب نہیں لکھی اور اسی تردید

کو جوں کا توں حمید قلندر نے نصیرالدین چراغ دہلی کے ملفوظات میں دہرایا ہے۔

انیس الارواح کے جعلی اور لغو ہونے کی ایک دلیل اور بھی ہے

---

[۲] خیرالمجالس ص ۵۲ - ۵۳

اور یہ دلیل خاص نصیر الدین محمود کے زمانے میں ہی پیش کردی گئی تھی کہ مذکورہ کتاب میں

بعض ایسے اقوال کو شیخ عثمان ہروانی سے منسوب کیا گیا ہے جو انکے نہیں ہیں[1]

فوائد الفواد میں ہے کہ مشائخ کی کتابوں اور انکے تحریر کردہ افادات (فوائد) کا

ذکر ہو رہا تھا ایک صاحب وہاں موجود تھے انہوں نے عرض کیا کہ ایک شخص نے مجھے اودھ میں

ایک کتاب دکھائی اور کہا کہ حضرت مخدوم یعنی آپ کی لکھی ہوئی ہے تو نظام الدین اولیاء

نے فرمایا اس نے ٹھیک نہیں کہا میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے[2]

مذکورہ بالا واقعہ عوام الناس کے ایک مخصوص ذہنی رجحان کا پتہ دیتا ہے لوگ

چاہتے تھے کہ صوفیوں کے منظم سلسلے کی باقاعدہ کتاب یا متعدد کتابیں ہونی چاہئیں وہ اس

خواہش کی تکمیل کے لئے جعل سازی سے بھی نہیں چوکتے تھے جب شیخ نظام الدین اولیاء کی

زندگی میں ہی انکو ایک کتاب کا مؤلف قرار دیدیا گیا تو کیا تعجب کی بات ہے کہ ان سے پہلے

وفات پانے والے بزرگوں کو بھی اس اعزاز سے خواہ مخواہ نوازنے کی کوشش کی گئی ہو۔

شیخ نظام الدین اولیاء نے تو اپنی زندگی میں ہی اپنی طرف سے صفائی پیش کردی کہ "من

ہیچ کتابی نہ نوشتہ ام"[3] لیکن وہ بزرگ جو وفات پا چکے تھے کہاں سے تردید و تکذیب کرتے۔

شیخ حسن سجزی نے نظام الدین اولیاء کے ملفوظات لکھکر ایک نمونہ سامنے پیش

---

[1] خیر المجالس ص ۵۲
[2،3] فوائد الفواد ص ۴۵

کر دیا اور جعل سازوں کو ایک راہ دکھادی یقیناً فوائد الفواد کو جعل سازوں نے اپنا معیار قرار دیکر قلم اٹھایا ہے۔

انیس الارواح میں تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کس طرح اپنے مرشد عثمان ہرونی کی خدمت میں پہونچے، کس طرح مرید ہوئے، اور پہلی ملاقات کے دوران کیا کیا کرامات شیخ عثمان ہرونی کی ذات سے وقوع پذیر ہوئیں[1] یقیناً ان واقعات کا بیان نہایت دلکش اور دلچسپ ہے۔ خواجہ عثمان ہرونی کے ساتھ خواجہ معین الدین چشتی کی مسافرتوں کا بیان انکا مکہ اور مدینہ تشریف لے جانا یہ تمام واقعات یقیناً کسی الیے چالاک مؤلف کے قلم اور ذہن کی پیداوار ہیں جو اپنی دکان چمکانے اور ابلہ فریبی کا بازار گرم کرنے کے لئے لکھ رہا ہے عقیدتمندوں نے یقیناً ان افسانوں کو باور کر لیا حالانکہ یہ واقعات عقل کے سامنے ہمیشہ ایک سوالیہ نشان بنے رہنگے مثال کے طور پر دونوں مقام مقدسہ کی حاضری کا انداز ملاحظہ ہو

"بزیارت خانہ کعبہ رسیدم آنجا نیز حضرت خواجہ دست من بگرفت و بخدای سپرد در زیر ناودان خانہ کعبہ مناجات کرد در باب این درویش آواز آمد کہ ما معین الدین را قبول کردیم چون از آنجا باز گشتیم تا بزیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسیدیم مرا فرمود کہ سلام کن سلام کردم آواز برآمد علیکم السلام ای قطب مشائخ بر و بحر" [2]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ انیس الارواح ص ۲-۳

[2] انیس الارواح ص ۳

انیس الارواح کے بعض بیانات کا لہجہ صاف پتہ دیتا ہے کہ یہ باتیں مریدوں
کی اخلاقی تعلیم اور کردار کی درستی کی غرض سے لکھی گئی ہیں لیکن اس میں بعض جگہ ایسا شدید
مبالغہ ہے کہ کوئی سنجیدہ بزرگ بھی کبھی اس قسم کا لہجہ اختیار نہیں کریگا اور کسی سنجیدہ ماحول
میں آج تک ایسی گفتگو قابل اجازت نہیں سمجھی گئی مثلاً اگر کوئی دوسرے برادر مومن کو گالی
دے تو اتنا بڑا گناہ ہوگا جیسے اس نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا سنجیدگی ان عنوانات کی
تشبیہات کو کبھی پسند نہ کریگی ۔ بعض جگہوں پر کچھ ایسی کتابوں کا ذکر ہے جو بعد میں
لکھی گئیں جیسے حدیث کی ایک کتاب "مشارق الانوار" اس کتاب کو خواجہ عثمان ہرونی کی
تالیف بتایا گیا ہے جبکہ یہ رضی الدین حسن صغانی کی تالیف ہے جو شیخ عثمان ہرونی کی
وفات کے بہت بعد لکھی گئی جبکہ پوری ایک نسل گذر چکی تھی ۔ ذیل میں اس کتاب کا مختصر
خلاصہ پیش کیا جارہا ہے یہ کتاب اٹھائیس (۲۸) مجلسوں پر مشتمل ہے ۔

مجلس اول میں احکام ایمانی یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ فرض
ہے اور جو اس سے انکار کریگا وہ کافر ہے حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ ایمان
ایک نور ہے جو قلب میں ہوتا ہے جب انسان عمل صالح کرتا ہے تو اسکے دل میں سفیدی
زیادہ ہوتی ہے دوسری صورت میں پورا دل سیاہ ہوجاتا ہے قیامت کے دن خدا مومن
کو اسکے عمل سے پوچھے گا ایمان سے کچھ سوال نہ کریگا اور کفار سے ایمان کے متعلق سوال کریگا۔[1]

۱۔ انیس الارواح ص ۵ - ۶

مجلس دوم میں حضرت آدم علیہ السلام کے مناجات کے بارے میں بیان کرتے ہیں چاند گرہن اور سورج گرہن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب انسان کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں تو خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوتا ہے کہ سورج اور چاند کو پکڑ لو اور کچھ عرصہ کے لئے اسے بے نور کر دو پھر مختلف مہینوں میں کسوف و خسوف ہونے پر مختلف بلاؤں کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔[ع۱]

مجلس سوم میں شہروں کی خرابی کا ذکر ہے فرماتے ہیں کہ آخر زمانے میں شہروں کی خرابی گناہوں کی وجہ سے ہوگی جب گناہ زیادہ ہونگے تو قیامت سے قبل ہی ان شہروں پر بلائیں نازل ہونگی حبشی مکہ کو ویران کرینگے مدینہ قحط سے ویران ہو جائیگا غرض مختلف شہروں کے مختلف وجوہات کی بنا پر ویران ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پھر محمد بن عبداللہ ظاہر ہونگے مشرق سے مغرب تک انصاف کرینگے پھر حضرت عیسی علیہ السلام آکر دین پھیلائنگے تو سارے عالم میں دین اسلام پھیل جائیگا۔[ع۲]

مجلس چہارم میں بیوی کو اپنے شوہر کی فرمانبرداری کرنے اور بردہ آزاد کرنے کی فضیلت کا ذکر ہے فرماتے ہیں کہ جس عورت کو اسکا شوہر ہمبستری کے لئے طلب کرے اور وہ نہ آوے اسکی تمام نیکیاں زائل ہو جاتی ہیں اور وہ قبل خوشنود ہونے شوہر کے مر جائے تو دوزخی ہے[ع۳] فرماتے ہیں کہ رسول کا ارشاد ہے کہ جس نے بردہ آزاد کیا اسکے نامہ اعمال میں برابر اسکے بدن

ع۱ انیس الارواح ص ۷ - ۸
ع۲ ایضاً " ۸ ۹
ع۳ ایضاً " ۱۰

کی رگوں کے نیکی لکھی جاتی ہے اور اسکے نامہ اعمال میں ایک پیغمبر کے برابر ثواب لکھا جاتا ہے اور جب
تک وہ اپنی جگہ بہشت میں نہ دیکھ لیگا اس وقت تک اسکی موت نہ ہوگی۔[1]

مجلس پنجم میں صدقہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن صدقہ دینے والے کے اردگرد
کے ستر ہزار آدمی بھی اسکے ساتھ ہول قیامت سے مامون ہونگے حضور کا ارشاد ہے کہ سب افضل
عمل صدقہ دینا ہے روٹی کا ایک ٹکڑا دینا ہزار مرتبہ قرآن شریف ختم کرنے سے بہتر ہے قیامت
کے دن جب آفتاب سوا نیزہ پر ہوگا تو صدقہ دینے والے پر عرش عظیم کا سایہ ہوگا۔[2]

مجلس ششم میں شراب کے متعلق حضرت عمر نے حضور صلعم سے روایت کی ہے کہ انہوں
نے فرمایا کہ شراب مطلق حرام ہے کمی اور زیادتی دونوں صورت میں حضور کا ارشاد ہے اس
شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو شراب پیئے بیچے یا اسکی قیمت لے۔[3]

مجلس ہفتم میں ایماندار کو تکلیف دینے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ
رسول کا ارشاد ہے کہ مسلمان کو رنجیدہ مت کرو کیونکہ اسکے سینے کے اوپر ستر پردے ہیں
اور ہر پردہ پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو شخص کسی مومن کو تکلیف پہونچاتا ہے پہلے وہ
تکلیف ان فرشتوں کو پہونچتی ہے[4] اسکے بعد فرض نماز کے بعد پڑھی جانے والی سنت اور

ع۱ انیس الارواح ص ۱۱
ع۲ ایضاً " ۱۵ - ۱۶
ع۳ ایضاً " ۱۷
ع۴ ایضاً " ۱۷ - ۱۸

نفل نمازوں کے ثواب کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص نماز بہت پڑھتا ہے اسکو فرشتوں کی عبادت کے برابر ثواب دیا جاتا ہے۔[ع۱]

مجلس ہشتم میں گالی دینے کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کو گالی دیتا ہے گویا وہ اپنی ماں بہن سے زنا کرتا ہے ایسے شخص کا نام فرعون کے مددگاروں میں لکھا جائیگا اسکی دعا سو دن تک قبول نہ ہوگی اگر مرگیا تو گنہگار مریگا۔[ع۲] کھانے کے دسترخوان کے سلسلے میں مختلف واقعات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص سرخ دسترخوان پر کھانا کھاتا ہے خدا اس پر رحمت کی نظر ڈالتا ہے۔[ع۳]

مجلس نہم میں بتاتے ہیں کہ پیشہ کرنے والا خدا کا دوست ہے حدیث ہے الکاسب صدیق اللہ (کسب کرنے والا اللہ کا دوست ہے) اور ان الکاسب حبیب اللہ (کسب کرنے والا اللہ کا محبوب ہے)[ع۴]

مجلس دہم میں فرماتے ہیں کہ جو شخص مصیبت کے وقت نوحہ کرتا ہے یا چلاتا ہے وہ کافر ہے ایسا کرنا ابلیس کا پیشہ ہے اور جو گریبان پھاڑتا ہے خدا اسے حشر کے دن رحمت کی نظر سے نہ دیکھے گا اور دوزخ میں اسکو سخت ترین عذاب دیا جائیگا۔[ع۵] جو شخص کسی پیاسے کو پانی پلائے گا وہ گناہ سے ایسا پاک ہوگا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو[ع۶]

ع۱ و ۲ و ۳ انیس الارواح ص ۲۰
ع۴ ایضاً ، ۲۳
ع۵ ایضاً ، ۲۳
ع۶ ایضاً ، ۲۳

مجلس یازدہم میں جانوروں کے ذبح کرنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ جس نے چالیس گایوں کو ذبح کیا اسکے نام ایک خون لکھا جاتا ہے اور جو سو بکریاں ذبح کرے اسکے نام بھی ایک خون لکھا جائیگا اور جو شخص جانوروں کو ہوای نفس سے ذبح کرے گا وہ ایسا ہے جیسے اسنے کعبہ کو انہدام کرنے میں مدد کی پھر فرماتے ہیں کہ جانوروں کو آگ میں ڈالنا ایسا گناہ ہے جیسے کہ اپنی ماں سے زنا کرنا [1]

مجلس دوازدہم میں مجلس میں داخل ہونے آداب بتاتے ہیں کہتے ہیں کہ مجلس میں داخل ہوتے وقت اور باہر نکلتے وقت سلام کرنا چاہئے [2]

مجلس سیزدہم میں نماز کے کفارہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کی نماز قضا ہو جائے اور اگر اسے معلوم نہ ہو کہ کس قدر نماز قضا ہوئی ہے وہ دوشنبہ کی رات کو پچاس رکعت نماز پڑھے ہر رکعت میں ایک مرتبہ فاتحہ اور ایک بار اخلاص پڑھے نماز سے فراغت کے بعد سو مرتبہ استغفار پڑھے اس نماز کی برکت سے اسکی تمام قضا پوری ہوگی چاہے اس نے سو سال ہی نماز نہ پڑھی ہو [3] پھر شب بیداری کے فوائد بیان کئے ہیں [4]

مجلس چہاردہم میں سورہ اخلاص پڑھنے کے فوائد کے بارے میں مختلف

۱۔ انیس الارواح ص ۲۵ - ۲۶
۲،۳۔ ایضاً ص ۲۶
۴۔ ایضاً ص ۲۷ - ۲۸

بزرگان دین کے اقوال بیان کئے ہیں [1]

مجلس پانزدہم میں اہل جنت کے وصف کے بارے میں ذکر کرتے ہیں [2]

مجلس شانزدہم میں مسجد کی فضیلت کے بارے میں بتاتے ہیں اس میں مجلس میں مسجد میں داخل ہوتے وقت کی دعا کا بھی ذکر کیا ہے اور اسکے فوائد بیان کئے ہیں [3]

مجلس ہفدہم میں دنیا اور اس میں مال و دولت جمع کرنے کے متعلق ذکر ہے فرماتے ہیں کہ مرد کے لئے لازم ہے کہ دنیا کی طرف التفات نہ کرے اور جو کچھ اسے حاصل ہو وہ خدا کی راہ میں ایثار کردے [4]

مجلس ہیجدہم میں چھینکنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو شخص چھینکتے وقت الحمدللہ رب العالمین کہتا ہے اللہ اسکے تمام گناہ معاف فرماتا ہے اور چھینک کا جواب دینا یعنی یرحمک اللہ کہنا گناہوں کا کفارہ ہے اور پھر اسکے خلف اور ثوابوں کا ذکر ہے [5]

مجلس نوزدہم میں اذان دینے والے کے ثواب کا ذکر کیا گیا ہے اسکے ہر الفاظ کا مفہوم اور اسکے ثواب کا ذکر ہے پھر فرماتے ہیں کہ اذان کا جواب دینا خلقت کے لئے شفیع ہے [6]

---

1. انیس الارواح ص ۲۸ - ۲۹
2. ایضا " ۲۹
3. ایضا " ۳۰
4. ایضا " ۳۱
5. ایضا " ۳۱ - ۳۲
6. ایضا " ۳۲ - ۳۴

مجلس بستم میں مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ مومن وہ ہے جو ان تین چیزوں

یعنی درویشی، بیماری اور موت کو دوست رکھے[1] پھر فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے

ہمسایہ کو خوش رکھے گا وہ حضور صلعم کا ہمسایہ ہوگا اور جو ناراض رکھے گا وہ ملعون ہے[2]

مجلس بست یکم میں حاجت روائی کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کی

حاجت روائی کرتا ہے خدا اسکو دوست رکھتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ عام راستے سے کانٹا

اٹھانے والے کو خدا صدیقین اور شہدا کے ساتھ اٹھائے گا۔[3]

مجلس بست دوم میں آخری زمانے کے حالات بیان کئے گئے ہیں حضور صلعم کا ارشاد

بیان کیا گیا ہے کہ آخری زمانے میں لوگ میرے عالموں کو جان سے ماریں گے عالموں کو منافق

اور منافقوں کو عالم سمجھیں گے۔[4] اسی قسم کے دوسرے مختلف واقعات کا بیان ہے۔

مجلس بست سوم میں حضور صلعم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ موت کا یاد کرنا

دن اور رات کی عبادت سے افضل ہے[5] پھر اسے سلسلے کی واقعات کا ذکر ہے۔

مجلس بست چہارم میں مسجد میں چراغ روشن کرنے کے ثواب کا ذکر ہے۔[6]

مجلس بست پنجم میں درویشوں کو مہمان رکھنے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ

ع[1] انیس الارواح ص ۳۴

ع[2] ایضا ص ۳۵

ع[3] ایضا ص ۳۵ - ۳۶

ع[4] ایضا ص ۳۶ - ۳۷

ع[5] ایضا ص ۳۷

ع[6] ایضا ص ۳۸

جو شخص درویشوں کو مہمان رکھے گا بہشت میں اسکے لئے ایک دروازہ کھول دیا جائیگا۔ مجلس کے آخر میں فرماتے ہیں کہ تین گروہ بہشت کی خوشبو نہ پائینگے پہلا جھوٹ بولنے والا درویش دوسرا تونگر بخیل تیسرا خیانت کرنے والا سوداگر ہے[1]

مجلس بست و ششم میں شلوار آستین اور پیراہن کے متعلق ذکر ہے کہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی سے منقول ہے کہ پائجامہ کے پائینچے دراز کرنا منافقوں کی علامت ہے پھر حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ جس کی آستین پیراہن دراز ہو وہ ملعون ہے[2] غرض اسی قسم کی باتوں کا بیان ہے

مجلس بست و ہفتم میں آخری زمانے کے علماء اور ظلم کرنے والے حاکم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کے اندر کیا کیا خصوصیات ہونگی اور وہ لوگوں پر کیسے کیسے ظلم کرینگے پھر درویشوں کے صدقہ دینے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کس کس کو یہ صدقہ دینا چاہیے[3]

مجلس بست و ہشتم میں علماء کی فضیلت اور توبہ کے بارے میں بتاتے ہیں رسول کا ارشاد ہے کہ توبہ موت سے قبل کرنا چاہیے کیونکہ موت کے بعد پشیمانی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا مرید خلف کے متعلق فرماتے ہیں کہ مرید خلف وہ ہے جو اپنے پیر کی زبان سے جو کچھ سنے دل و جان سے اسکی تعمیل کرے[4]

۱؎ انیس الارواح ص ۳۸
۲؎ ایضاً ص ۳۸ - ۳۹
۳؎ ایضاً ص ۳۹
۴؎ ایضاً ص ۳۹ - ۴۰

دلیل العارفین خواجہ معین الدین چشتی اجمیری جیسا کہ گذشتہ باب میں عرض کیا گیا ہندوستان میں چشتی سلسلے کے بانی تصور کئے جاتے ہیں۔ انکی وفات کے بعد جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا انکے نام کی شہرت اور انکی شخصیت سے خلوص و عقیدت کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور ہندوستان پر جو اثرات چشتی سلسلے کے قائم ہوئے وہ نفوذ اسی دوسرے سلسلے کو نصیب نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں تصوف کی درجہ بدرجہ مقبولیت اور خانقاہی نظام کی توسیع کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو چشتی سلسلے کے بانی یعنی خواجہ معین الدین چشتی کی حیات اور انکی تعلیمات و عقائد کے بارے میں غیر معمولی دلچسپی ہوتی چلی گئی غالبا خواجہ کی وفات کے سو سال کے اندر ہی کسی گمنام مؤلف نے انکے ملفوظات کا ایک مجموعہ تیار کر دیا۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے خلیفہ اور مرید خاص خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی شخصیت کی عظمت اور کردار کی تربیت اور تاریخی مقبولیت کے اعتبار سے اگر اپنے شیخ کے برابر نہیں تو ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں لہٰذا شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے ملفوظات کو شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی طرف منسوب کرنا اور آخر الذکر کو ملفوظات کا مؤلف قرار دینا ایک ایسی فنکاری کی بات تھی کہ جس پر ضعیف الاعتقاد عوام الناس کو بغیر شک کئے فوراً اعتبار آگیا اور وہ کتاب جو دلیل العارفین کے نام سے مشہور ہوئی

ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اہل خانقاہ نے دلیل العارفین کو ایک مقدس تبرک سمجھا اور اسکے تاریخی عدم توازن اور دیگر واقعاتی بھول چوک پر کبھی غور نہیں کیا دلیل العارفین کے اندر متعدد شخصیات اور لغات کا حوالہ ہے جنکا زمانی اور مکانی عرصہ قطعی ناقابل اعتبار ہے اور پہلی نظر ہی میں اشتباہ واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً جگہ جگہ ایسے افراد کا ذکر ہے جو خواجہ معین الدین چشتی کی حیات سے یا تو پہلے وفات پاگئے تھے اور یا انکے بہت بعد عالم وجود میں آئے اور اسی طرح واقعات میں بھی زبردست عدم تطبیق جگہ جگہ نظر آتی ہے البتہ دلیل العارفین اور اس نوعیت کی دیگر تالیفات میں یہ خوبی کی بات ہے کہ بہت سے اخلاقی مسائل اور دینی واجبات کو ایسے انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ سطحی نظر رکھنے والے ان تمام باتوں کو واقعی طور سے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی هدایات اور تاکیدات کا مجموعہ تصور کرینگے ۔

صوفی ادب خصوصًا عملی تالیفات کے ارتقاء میں دلیل العارفین کو خاص اھمیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ کتاب سب سے بڑے چشتی صوفی کے اقوال و آثار کا مجموعہ تصور کی گئی۔ دوسرے یہ کہ اسکا مولف ایسے شخص کو قرار دیا گیا جسکو خواجہ معین الدین چشتی کے بعد عظیم المرتبہ اور بلند پایہ ہستی مانا جاتا ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی یقیناً روحانی فضیلت اور مقام ولایت پر فائز تھے اسکے علاوہ خواجہ موصوف اعلی درجے کا

ادبی ذوق بھی رکھتے تھے ایسی ہستی کو کسی کتاب کا مؤلف قرار دیدینا خصوصاً اپنے شیخ کے
ملفوظات کا جمع کنندہ کہنا مشکل بات نہیں تھی یقیناً جعلی مؤلف نے ان تمام نکات کو ملحوظ
خاطر رکھا اور ان باتوں کا فائدہ اٹھایا۔ امکان ہے کہ مؤلف کوئی چشتی سلسلے سے تعلق
رکھنے والا بے جھجک اور دلیر ہوا صوفی تھا جسکا در پردہ مقصد چشتی سلسلے کے اثرات کو پھیلانا
اور بڑھانا تھا۔ دوسرا امکان یہ بھی ہے کہ کسی چالاک کتاب فروش نے چشتیوں کی
مقبولیت اور اثرات کو دیکھ کر جعلی تألیف تیار کرائی اور بازار میں پہونچا دی تاکہ
خوش عقیدہ پڑھنے والوں کو بہکاکر انکی جیب خالی کرے اور منافع کمائے۔ دلیل العارفین کی
صحت اور واقعیت کے دعوی کا یقین اسکے ابتدائی پڑھنے والوں کو اس لئے آگیا کہ اس
میں ایسے موضوعات پر بحث کی گئی ہے جو ہر صاحب عرفان کی توجہ کا اہم ترین اور لازمی
موضوع ہے مثلاً دینی مسائل و صوفیانہ رموز وغیرہ وغیرہ

وہ بیانات جو دلیل العارفین کو مشکوک بناتے ہیں انکا اجمالی جائزہ

یہاں سے شروع کرنا چاہئے کہ شیخ قطب الدین بختیار کاکی فرماتے ہیں کہ[۱] میں سب سے پہلے
خواجہ معین الدین چشتی سے بغداد میں امام ابواللیث سمرقندی کی مسجد میں ۵ رجب ۵۱۲ھ مطابق ۱۱۲۰ء
کو ملا۔ یہ پورا بیان جرح کی زد میں آتا ہے۔ شیخ قطب الدین بختیار کاکی براہ راست

۱۔ دلیل العارفین ص ۲

ماوراء النہر ہوتے ہوئے دہلی آ گئے تھے[1] دوسری بات یہ کہ جن صوفیائے کرام کی موجودگی میں مرید ہونے کا ذکر ہے اس تاریخ میں ان کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی انکی ولادت کا سال مؤلف مسالک السالکین[2] نے ۵۳۹/۱۱۴۴ اور بعض دیگر تذکرہ نویسوں نے ۵۴۲ اور ۵۴۳/۱۱۴۷-۴۸ لکھا ہے دوسرے یہ کہ ۵۱۴/۱۱۲۰ میں بالاتفاق مؤرخین خود خواجہ معین الدین چشتی بھی پیدا نہیں ہوئے تھے[3]

دلیل العارفین کی مجلس دوم[4] میں ایک ایسا واقعہ درج ہے جو صریحاً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ قطب الدین بختیار کاکی فرماتے ہیں کہ "میں نے ایک بار بخارا میں دستار بندوں کے مجمع (یعنی علمائے ظاہر کی جماعت) میں یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ نبی کریم نے کسی شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جو غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا تھا رکوع سجدہ اچھی طرح نہیں کر رہا تھا نبی کریم نے اس آدمی سے کہا کہ اگر تم اسی انداز سے نمازیں پڑھکر اور عبادتیں کرکے جو کہ تم چالیس سال سے کر رہے تھے دنیا سے اٹھ جاتے تو تمھاری وفات میری سنت کے مطابق نہ ہوتی۔ عقل سلیم کبھی باور نہیں کر سکتی کہ قطب الدین بختیار کاکی نے اس قسم کا واقعہ کبھی اپنے شیخ سے سنا ہو یا خود انہوں نے ایسے صریحی بہتان کی جرأت

[1] Chisti Mystics Record of the Sultanate Period, Politics and Society during the Early Medieval Period P 408-10

[2] مسالک السالکین ج ۲ ص ۵۰۲

[3] تا سفینۃ الاولیا نے آپ کی تاریخ پیدائش ۵۳۷/۱۱۴۲ اور مرآۃ الانساب نے ۵۳۰/۱۱۳۵ لکھی ہے

[4] دلیل العارفین ص ۱۰-۱۱

نبی کریم کے بارے میں کی ہو۔ ہر صاحب علم شخص جانتا ہے کہ نبی کریم نے نبوت کے صرف ۲۳ سال گزارنے کے بعد وفات پائی اس شخص کو چالیس سال کی عبادت کیا دیا ہے اسی طرح مختلف جگہوں پر بے سرو پا واقعات ہیں جن کے اندر صریحاً تاریخی تحریف کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل سلیم سے بھی مدد نہیں لی گئی ہے اسکے علاوہ دلیل العارفین میں بہت سے ایسے واقعات بھی بیان کئے گئے ہیں جن کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ فوائد الفواد سے لئے گئے ہیں۔

دلیل العارفین میں بارہ مجلسیں ہیں جن میں دینی مسائل اور صوفیانہ رموز مثلاً نماز وضو طہارت غسل جنابت صدقہ شریعت طریقت حقیقت، عشق الہی، کشف وکرامات وغیرہ کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے ہر مجلس کے آغاز میں شرکاء کا نام بھی موجود ہے۔ بعض مشہور شرکاء میں شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ داؤد کرمانی، شیخ برہان الدین چشتی، مولانا بہاء الدین بخاری، خواجہ اجل شیرازی، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ اوحدین کرمانی وغیرہ کو دکھایا گیا ہے ان بارہ مجلسوں میں سے تین مجلسوں میں منعقد ہونے کی جگہ کا نام موجود ہے پہلی اور چوتھی مجلس بغداد میں اور بارھویں مجلس اجمیر میں منعقد ہوتے دکھایا گیا ہے مجلس چہارم[1] میں فرماتے ہیں:۔ "وقتی در بغداد بودم" اس سے اندازہ ہوتا

[1] دلیل العارفین ص ۱۸

ہے کہ یہ مجلس بغداد میں نہیں بلکہ کہیں اور منعقد ہوئی۔ دلیل العارفین میں خواجہ معین الدین چشتی کے مختلف جگہوں کے سفر کی تفصیلات کو بھی بیان کیا گیا ہے جیسے سیوستان[1]، سمرقند[2] مدینہ[3]، بخارا[4] اور اجمیر[5] کے سفر کا واقعہ درج ہے۔

مجلس اول میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی مریدی کا تذکرہ ہے۔ ذکر کرنے کے بعد نماز وضو اور طہارت کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ نماز مومن کی معراج ہے الصلوٰۃ معراج المومنین نماز ایک راز ہے جو بندہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے جو شخص صبح کی نماز سے آفتاب نکلنے تک جائے نماز پر بیٹھ کر ذکر حق میں مشغول رہیگا اور پھر اشراق کی نماز ادا کریگا تو اگر اس آدمی کے ستر ہزار آدمی بھی ہونگے تو وہ سب بخش دئے جائینگے پھر فرماتے ہیں کہ جو شخص با طہارت سوتا ہے خدا کے حکم سے اسکے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو خدا سے دعاء کرتے ہیں کہ یہ شخص با طہارت سویا ہے اسے بخش دے اور جب اسکی روح کو فرشتے زیر عرش لے جاتے ہیں تو خدا کے حکم سے اسے خلعت نور پہنایا جاتا ہے[6]

ع۱ دلیل العارفین ص ۱۵
ع۲ ایضاً " ۲۸
ع۳ ایضاً " ۴۱
ع۴ ایضاً " ۴۸
ع۵ ایضاً " ۵۴
ع۶ ایضاً " ۵-۶

مجلس دوم میں جنابت کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ جنابت ہر بال کے نیچے ہوتی ہے اس لئے ہر بال کے نیچے پانی پہونچنا چاہئے پھر غسل حلال و حرام کی تفصیلات بتاتے ہیں[1] شریعت طریقت معرفت اور حقیقت کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں "اول روندگان شریعت است چون مردم در شریعت ثابت آمد و ہر چہ فرمان شریعت است بجای آرد و ازان فرمان تجاور و تفاوت نکند بیشتر بود بپایہ دوم رسد کہ آنرا طریقت خوانند بعد ازان چون درین مرتبہ ثابت شد چنانچہ شرائط طریقت است و آنچہ درو فرمان است بر سنت روندگان راہ سلوک کہ وقتی ازان تجاور بیشتر در مرتبہ معرفت رسد چون در مرتبہ معرفت رسد آنجا ہم شناخت و جائیکہ آشنائی آمد حقیقت بدان کہ روشنائی پیدا شد چون درین مرتبہ ثابت شد در مرتبہ چہارم رسد کہ آن مرتبہ حقیقت است بعد ازان چون مردم درین مرتبہ رسد پس ہرچہ می طلبد می یابد"[2] پھر نماز اور اس میں رکوع سجود قرآت اور تسبیح کی اہمیت (آنچہ شرط نماز است) بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان سبھی کے ادا نہ کرنے اور وقت پر نماز نہ ادا کرنے سے نماز پڑھنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔" ای درویش نماز ستون دین است و رکن ستون است پس ستون برپا شد خانہ سلامت بماند و آنگاہ کہ ستون از خانہ برفت خانہ فی الحال بیرون شود و چون اسلام در دین را نماز ستون است ہر کہ خلل اندر

---

1. دلیل العارفین ص ۸۔۷
2. ایضا ،، ۸
3. ایضا ،، ۹

نمازها و فریضه و سنت و رکوع و سجود اندر آید پس حقیقت اسلام و دین و جز آن خراب شود"[1]

مجلس سوم میں نماز کے لئے قبل سے تیار رہنے اور وقت پر اسے ادا کرنے کی تلقین کی ہے پھر

جھوٹ کے سلسلے میں فرماتے ہیں "ہرکہ سوگند دروغ خورد گوئی خان ومان خود را ویران کردہ

باشد و خیر و برکت ازان خانہ برگیرند"[1] ایسے شخص کو دوزخ کے اندر سخت سزائیں دی جائیگی

جو خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھاتے ہیں کوشش یہ ہونی چاہئے کہ سچ بات پر بھی قسم نہ کھائی جائے"[2]

مجلس چہارم میں عشق صادق کی ترغیب دی ہے اور اسکی تعریف میں شیخ شہاب الدین سہروردی

شیخ سیف الدین باخرزی خواجہ اجل شیرازی وغیرہ اور خود اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں "صادق

در محبت کسی بود کہ چون بلای دوست بازگردد او بطوع رغبت آن بلا را قبول کند"[3]

قہقہہ سے باز رہنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اہل سلوک کے نزدیک یہ ایک گناہ کبیرہ ہے"[4]

بغیر کسی وجہ کے کسی مسلمان کو ستانا ایک بڑا گناہ اور خدا و رسول کی ناراضگی کا باعث ہے[5]

یہ گناہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کا نام سنے یا اسکا کلام پڑھے تو اسکا دل خدا کی ہیبت

سے نرم نہ ہو اور اسکا اعتقاد ایمان پر زیادہ نہ ہو خدا کا فرمان ہے کہ حقیقت میں مومن

وہ لوگ ہیں جنکا اعتقاد ایمان میں اللہ تعالیٰ کا نام سنکر زیادہ ہو جاتا ہے مگر وہ لوگ

۱۔ دلیل العارفین ص ۱۰

۲۔ ایضاً ص ۱۲

۳۔ ایضاً ص ۱۳

۴۔ ایضاً ص ۱۴

۵۔ ایضاً ص ۱۸

جو ذکر الٰہی اور کلام ربانی سنکر ہنستے ہیں وہ منافق ہیں[1]

مجلس پنجم میں والدین اور اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور انکی خدمت کرنے، قرآن کریم کا احترام کرنے اور اسکے پڑھنے، علماء و مشائخین کا احترام کرنے اور انکی خدمت کرنے، خانہ کعبہ کی زیارت کرنے، اپنے پیر کی زیارت انکا احترام اور انکی اطاعت کرنے پر بحث کی گئی ہے"[2]

مجلس ششم میں خدا کی اطاعت اور خدمت خلق کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز ہے کوئی بھی چیز اسکی قدرت سے بعید نہیں انسان کو چاہیئے کہ اسکے احکام بجالائے کیونکہ اطاعت کے بعد وہ جو کچھ چاہے گا وہ اسے مل جائیگا[3] خدا کے نزدیک درماندگان کی فریاد رسی ضرورتمندوں کی حاجت براری اور بھوکوں کو کھانا کھلانے سے بہتر کوئی طاعت اور عمل نہیں"[4]

مجلس ہفتم میں سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے فوائد اسکے پڑھنے کے طریقے اور اس سورہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے پھر خواجہ عثمان ہرونی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہر کہ فاتحہ الکتاب بصدق بخواند برای حاجت و مہم را اگر آن مہم و حاجت روا نہ شود چنگ او بدامن من باشد"[5]

مجلس ہشتم میں اوراد و وظائف کے ناغہ نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

---

[1] دلیل العارفین ص ۱۹
[2] ایضاً ص ۲۱ - ۲۴
[3] ایضاً ص ۲۵
[4] ایضاً ص ۲۸
[5] ایضاً ص ۳۱ - ۳۲

"جو شخص کوئی وظیفہ مقرر کرلے اسے کسی نہ کسی وقت ضرور پڑھ لے کیونکہ ورد کا ترک کرنے والا لعنتی ہے"[1] پھر مختلف اوقات میں پڑھے جانے والے اوراد کا ذکر ہے۔

مجلس نہم سلوک و معرفت اور عشق سے متعلق ہے، کہتے ہیں کہ "بعض مشائخ نے سلوک کے سو درجے مقرر کئے ہیں اس میں سترہ واں درجہ کشف و کرامات کا ہے جب تک سالک پورے کے پورے درجے طے نہ کرلے کشف کرامات کی طرف متوجہ نہ ہو اور خود کو ظاہر نہ کرے"[2]

عارف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "عارف وہ ہے کہ خواہ وہ کہیں ہو اور خواہ کچھ طلب کرے اسے مل جائے جس سے بات کہے اسی سے جواب سنے، وہ عارف نہیں جو اللہ کے سوا کسی اور چیز کے درپے ہو، عارف کا ایک درجہ ہوتا ہے اور جب وہ اسی درجہ پر پہونچتا ہے تو دنیا و مافیہا کو اپنی دو انگلیوں کے درمیان دیکھتا ہے"[3]۔

مجلس دہم میں نیکوں کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کی ہے، کہتے ہیں "کہ صحبت کا اثر ضرور پڑتا ہے فرماتے ہیں کہ نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر ہے اور بروں کی صحبت کار بد سے بدتر ہے"[4] درویشی کے متعلق فرماتے ہیں کہ "درویشی یہ ہے کہ جو کوئی بھی اسکے پاس آئے اسے محروم نہ کرے اگر وہ بھوکا ہو تو اسے کھانا کھلائے ننگا ہو تو عمدہ کپڑا پہنائے[5]

---

[1] دلیل العارفین ص ۳۲
[2] ایضاً ۳۷
[3] ایضاً ۴۰
[4] ایضاً ۴۵
[5] ایضاً ۴۸

کسی طرح اسے خالی نہ جانے دے بلکہ اس کا حال پوچھ کر اسکی دلجوئی کرے"۔ محبت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "اسکے چار معنی ہیں پہلا دل اور جان سے خدا کے ذکر میں خوش رہنا دوسرا ذکر حق کو بڑا جاننا تیسرا قطع تعلق کرنا (یعنی اپنے والدین و اقرباء سے قطع تعلق کرکے یادِ حق میں لگ جانا) چوتھا اپنے اور اسکے سوا جو کچھ ہے اسکی حالت پر رونا [۱]

مجلس یازدھم میں توکل اور توبہ کا ذکر ہے، فرماتے ہیں کہ "عارفوں کا توکل یہ ہے کہ انکا توکل سوائے خدا کے کسی اور پر نہ ہو ان پر غلبات شوق میں ایسا بھی وقت آتا ہے کہ اپنی کسی بھی قسم کا رنج اور تکلیف پہونچائی جائے تو انکو اسکی مطلق خبر نہیں ہوتی بلکہ اگر انکو ٹکڑے ٹکڑے بھی کردیا جائے تو انکو اسکا احساس تک نہیں ہوتا" [۲] توبہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اسکے کئی مقام ہوتے ہیں، جاہلوں سے دور ہونا، باطلوں سے قطع تعلق کرنا، منکروں سے منھ پھیر لینا، توبہ کا درست کرنا وغیرہ، اہل محبت کے توبہ کی تین قسمیں ہیں پہلا ندامت [۳] دوسرا گناہوں کا چھوڑ دینا اور تیسرا اپنے آپ کو ظلم اور دشمنی سے بچائے رکھنا [۴]

مجلس دوازدھم میں ملک الموت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ملک الموت کے بغیر دنیا کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاقات کراتا ہے"

ع۱ دلیل العارفین ص ۴۹
ع۲ ایضاً ۵۱-۵۰
ع۳ ایضاً ۵۱
ع۴-۵ ایضاً ۵۴
ع۵

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی ذات سے منسوب مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ کچھ اور بھی کتابیں رسالے اور مکتوبات ہیں جو صدیوں سے سکۂ رائج الوقت کی طرح صوفیوں کی خانقاہوں میں چل رہے ہیں اور جن کی مقبولیت کو ضعیف الاعتقادی یا یوں کہئے کہ حد سے بڑھی ہوئی عقیدتمندی نے آج تک ختم ہونے نہیں دیا ان تمام تالیفات اور رسالوں کے موضوعات انکے مضامین اسلوب اور انداز بیان وغیرہ سے ذرا سے تامل کے بعد ہی واضح ہو جاتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی ان آثار کے مؤلف نہیں ہوسکتے اور ان تالیفات کو انکی ذات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ان میں سے اکثر وبیشتر آثار مقبولیت اور شہرت کی میزان میں وہ درجہ اور وزن نہیں رکھتے جو دیگر جعلی تالیفات کو حاصل ہے البتہ ان آثار کے نسخوں کو اس کثرت اور بے ترتیبی سے نقل کرکے پھیلا دیا گیا ہے کہ دور حاضر کا کوئی بھی بڑا کتاب خانہ ایسا نہیں جہاں یہ رسالے موجود نہ ہوں ان تالیفات کے مضامین کا خلاصہ کرنا اور انکے موضوعات پر روشنی ڈالنا ہماری تحقیق کے اعتبار سے سودمند نظر نہیں آتا اور نہ ان میں کوئی نئی بات ملتی ہے بلکہ ان میں سے چند میں تو ایسی بحثیں چھیڑی گئی ہیں جو ہرگز خواجہ معین الدین اجمیری کی توجہ کا باعث نہیں ہوسکتیں پھر بھی ان تالیفات کا نہایت اختصار کے ساتھ تعارف پیش خدمت ہے۔

بحرالحقائق :ـــــ اس کتاب کا ناقل یا محرر بھی خواجہ معین الدین چشتی[۱]

۱ مملوکہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند

کے خلیفہ ارشد قطب الدین بختیار کاکی کو ہی بتایا گیا ہے اس کتاب میں فلسفیانہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کو آسمان کے مختلف منازل کی سیر کرتا ہوا دکھایا گیا ہے ان مقامات پر انکی ملاقات مختلف انبیائے کرام اور بزرگان دین سے ہوتی ہے بلکہ انبیائے کرام اور بزرگان دین ان مقامات پر ان سے ملاقات اور انکے استقبال کے لئے خود حاضر ہوتے ہیں۔ آخری منزل پر انکی ملاقات خداوند قدوس سے ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے جہاں خواجہ معین الدین چشتی خداوند قدوس کے ساتھ مختلف مقامات کی سیر اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کتاب میں یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کے قائل تھے اور وہ مختلف ناموں سے مختلف زمانوں میں زمین پر مبعوث ہوتے رہے۔

گنج الاسرار :—— کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب خواجہ معین الدین چشتی نے ہندوستان کے قیام کے دوران اپنے پیر مرشد خواجہ عثمان ہرونی کے حکم سے سلطان شمس الدین التمش کی تعلیم و تلقین کی غرض سے لکھی اس کتاب میں قرآن حدیث اور بزرگان دین کے احوال و اقوال کے ذریعہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی کی تفصیل اور حقیقی عبادات کی تشریح بیان کی ہے اسکے علاوہ اس کتاب میں تصوف کے اعلیٰ مدارج کی تعلیم دی گئی ہے۔

کشف الاسرار :—— یہ کتاب مختلف کتب خانوں میں مختلف ناموں

سے موجود ہے مثلاً رسالہ در بیان آنکہ در وجود آدمی است، رسالہ در بیان ارواح، رسالہ در وجود آدمی

رسالہ معرفت کسب نفس یعنی وصول المعراج رسالہ وجود یہ حقیقیہ وغیرہ وغیرہ ان مختلف کتب خانوں کے رسالوں

کے انداز بیان میں بھی فرق ہے یہ رسالہ مکمل تین ابواب پر مشتمل ہے جس میں چہاردم حبس دم

اور ذکر خفی کی تعلیم دی گئی ہے ابتداء میں دنیا کے وجود کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور
انسانی جسم کو بھی ایک مکمل کائنات بتایا گیا ہے

<u>دیوان معین</u> :- یہ دیوان چوالیس اوراق پر مشتمل ہے اور کئی بار مختلف

مطابع سے شائع بھی ہو چکا ہے اس دیوان میں قصیدہ (حمد) قطعات اور غزلیات ہیں حقیقت میں

یہ دیوان مولانا معین الدین فراہی کا دیوان ہے جو غلطی سے انکے نام منسوب ہو گیا ہے اس دیوان کے

سلسلے محققین کے درمیان عرصہ تک اختلاف رہا ہے ایک گروہ کا کہنا تھا کہ یہ خواجہ معین الدین چشتی

کا دیوان ہے اور دوسرا گروہ یہ ثابت کرتا تھا کہ یہ معین الدین فراہی کا کلام ہے[1] ان کے

دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ معین الدین چشتی کا دیوان نہیں اس دیوان کا ہر شعر

عشق الٰہی کا آئینہ دار ہے ایک بار یہ دیوان کتب خانہ نذیریہ خواجہ پریس دہلی سے مسلم احمد نظامی

کی نگرانی میں <u>۱۹۵۸ء</u> میں شائع ہو چکا ہے خود مسلم احمد نظامی لکھتے ہیں۔

"مستند حالات کے مطالعہ کے دوران کوئی چیز ایسی نہ گذری جس سے اس رائے کی

تصدیق ہو سکے ..... تو پھر یہ دیوان کیسا اور دیوان بھی وہ دیوان جسکا ہر

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ اردو جولائی <u>۱۹۲۴</u> اور جنوری <u>۱۹۴۲</u>
اورنٹیل کالج میگزین <u>۱۹۴۹ء</u> و <u>۱۹۵۰ء</u>

مصرعہ عشق الٰہی کا آئینہ دار اور پھر ہر غزل کا مقطع غریب نواز کے نام کا حامل یہ معمّہ اس صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ ہم حضرت کے معتقدین کی طرف توجہ کریں اور انکے بڑھتے ہوئے والہانہ اعتقاد کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بزرگ حضرت کی تعلیمات کا گرویدہ عاشق صادق اس دیوان کو تصنیف کرنے والا ہے جس نے یہ مختصر دیوان جو بلند و ارفع پاکیزہ خیالات کا مجموعہ ہے تصنیف کر کے حضرت کے نام سے منسوب کر دیا"۔

اعمال متفرقہ از رسالہ پاس انفاس :— اس رسالہ میں حبس دم کی تعلیم دی گئی ہے نیز اسکے مختلف طریقے اور فوائد بیان کئے گئے ہیں ۔

مکتوبات خواجہ معین الدین چشتی :— یہ خطوط آپ کے خلیفہ قطب الدین بختیار کاکی کے نام ہیں ان خطوط کے ذریعہ خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے خلیفہ کو معرفت کی اعلیٰ ترین تعلیم دی ہے ایک خط میں انہوں نے ارکان دین یعنی نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کی حقیقت واضح کی ہے اس خط کا نسخہ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہے ان مختلف نسخوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نسخے ایک دوسرے سے نقل کی ناکام کوشش ہیں۔

اگر جستجو کا سلسلہ آگے بڑھایا جائے تو امکان ہے کہ اس قبیل کے رسالے مختلف کتب خانوں میں اور بھی مل جائیں جن پر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا نام زینت اور دلکشی کے خاطر لکھ دیا گیا ہے۔

فوائد السالکین

فوائد السالکین شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے مفروضہ ملفوظات کا مجموعہ ہے
جس کا کاتب یا محرر شیخ فریدالدین گنجشکر کو تصور کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب یقیناً جعلی آثار میں محسوب کی جانے کی مستحق ہے اسکے
متعدد دلائل اور وجوہات ہیں پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر اس نوعیت کی کتاب شیخ نظام الدین اولیاء کے
زمانے میں پہلے سے موجود ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ انکے حلقہ میں اس کتاب کا ذکر نہ کیا جاتا اور
انکی خانقاہ میں یہ متداول نہ ہوتی۔ شیخ نظام الدین اولیاء اپنے مریدوں سے اس عنوان کی
کسی کتاب کا ذکر نہیں کرتے اور کہتے ہیں: "من ہیچ کتابی تصنیف نہ کردہ ام ...... و خواجگان
ما نیز نکردہ اند"[1] ہم قبل بھی ذکر کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم ہونے کے بعد
ایک صدی مشکل سے گذری تھی کہ یہ مضحکہ خیز صورتحال پیدا ہو چکی تھی یعنی تصوف سے متعلق
اکثر و بیشتر کتابیں بازار میں کتب فروش بیچتے پھرتے تھے اور ان کتابوں کو صوفی بزرگوں کے
ملفوظات یا انکی تالیفات سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ عقل کہاں سے یہ باور کر سکتی ہے کہ قطب الدین بختیار کاکی
سے منسوب کتاب حضرت نظام الدین اولیا کے زمانے میں وجود نہیں رکھتی اور انکی وفات کے بعد
یکایک وجود میں آجاتی ہے۔ اس زمانے میں فوائد السالکین اور اس قبیل کی کتابوں کا پڑھنا ایک

---

١ خیر المجالس ص ٥٢

قسم کا فیشن سا بن گیا تھا۔ ان کتابوں میں جو تاریخی اشتباہات واضح طور سے موجود ہیں

انکو سمجھ لینا اور ان غلطیوں کو پکڑ لینا اس زمانے کے لوگوں کے لئے مشکل نہ تھا مگر معلوم ہوتا

ہے کہ وہ ایک تو ذوق کے تقاضے سے مجبور تھے دوسرے یہ کہ صوفی بزرگوں سے انکی عقیدتمندی اس قدر

بڑھی ہوئی تھی کہ لوگ انکے ذکر کا سامان عجیب عجیب طریقے سے مہیا کرتے تھے جب پورے معاشرے

کا رجحان یہ ہوکہ بزرگان کرام کا ذکر ہونا چاہئے وسیلہ اور طریقہ کچھ بھی ہو تو پھر تاریخی حقائق

اور واقعاتی عدم صحت سے چشم پوشی کرنا ناگزیر تھا۔ فوائد السالکین میں متعدد ایسی روایتیں ہیں جو آج

بھی دل کو بہلاتے ہیں اور مزاج میں سوز وگداز پیدا کرتے ہیں یا شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے

روحانی کمالات کا رعب ذہن پر بٹھاتے ہیں مگر اس حقیقت کو کیا کیا جائے کہ وہ واقعات

اکثر و بیشتر سراسر فرضی اور جعلسازوں کے افسانہ پسند تخیلات کی پیداوار ہیں

شیخ قطب الدین بختیار کاکی کی زبان سے ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ

وہ اور قاضی حمید الدین ناگوری خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے طواف کے دوران انکی ملاقات

ایک بزرگ شیخ عثمان سے ہوتی ہے جو ابوبکر شبلی کے غلاموں میں سے تھے اور روزانہ

دس ہزار بار قرآن مجید حرف بحرف پڑھا کرتے تھے اس واقعہ کے ضمن میں پہلی بات تو

یہ ہے کہ بقول نظام الدین اولیاء خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کبھی حج کے لئے تشریف ہی نہیں

۱؎ فوائد السالکین قلمی ۸

لے گئے[1] اور دوسری بات جو اس واقعہ کو ناقابل یقین بناتی ہے وہ عرصۂ زمانی ہے اگر قطب الدین بختیار کاکی کے زمانے میں خواجہ ابوبکر شبلی وفات ۳۳۴/ ۹۴۵ کا کوئی مرید اور غلام موجود تھا تو اسکی عمر تقریباً تین سو سال رہی ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ امر قانون فطرت کے خلاف ہے -

فوائد السالکین کا ایک دوسرا واقعہ ملاحظہ ہو: "قطب الدین بختیار کاکی فرماتے ہیں کہ میں اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی خدمت میں حاضر تھا راجہ پتھورا زندہ تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ درویش (خواجہ معین الدین چشتی) اگر یہاں سے چلا جائے تو کیا اچھا ہو خواجہ معین الدین چشتی مراقب ہوئے اور مراقبے میں آپ نے فرمایا کہ ہم نے پتھورا کو زندہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا اس بات کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ سلطان شمس الدین محمد شام نے حملہ کرکے شہر کو برباد کر ڈالا اور پتھورا کو زندہ گرفتار کر لیا[2] معتبر تاریخ پڑھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ رائے پتھورا کو شمس الدین (التمش) نے نہیں بلکہ معز الدین محمد بن سام غوری نے ترائن کے میدان میں شکست دی تھی اور راجہ زندہ گرفتار نہیں ہوا بلکہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا[3] قطب الدین بختیار کاکی یقیناً التمش کے معاصر تھے مگر پتھورا اور محمد غوری کا واقعہ سلطان شمس الدین التمش سے پہلے ہی پیش آچکا تھا نیز خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا

---

۱ سیر الاولیا ص ۱۷
۲ فوائد السالکین ص ۹ - کچھ نسخوں میں شہاب الدین محمد سام بھی ملتا ہے -
۳ فتوح السلاطین ص ۷۵

فتحِ ہندوستان سے قبل ہندوستان میں موجودگی کا بھی ذکر تذکروں میں نہیں ملتا۔

شیخ قطب الدین بختیار کاکی نے حالت وجد سماع میں وفات پائی یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ کسی حجت اور دلیل کی محتاج نہیں۔ یہ محفل سماع شیخ علی سجزی کی خانقاہ میں برپا تھی اور قوالوں نے مندرجہ ذیل شعر پڑھا تھا جس پر قطب الدین بختیار کاکی کو وجد آگیا۔

کشتگان خنجر تسلیم را   ہر زمان از غیب جان دیگر ست

چار شبانہ روز تک آپ نماز کے اوقات کے علاوہ متحیر اور مدہوش رہے اور پانچویں رات کو آپ نے وفات پائی۔ یہ واقعہ نظام الدین اولیاء کا بیان کردہ ہے جو اس واقعہ کے سولہ سال بعد دہلی تشریف لائے اور انکی زبانی ہی یہ واقعہ فوائد الفواد[ع۱] میں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ فوائد السالکین میں اس بیان کو یقینی طور سے فوائد الفواد سے لیا گیا ہے مگر ایک مبالغہ آمیز نکتہ مؤلف نے ایجاد بندہ کے طور پر اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے یعنی وجد کی حالت میں قطب الدین بختیار کاکی کا سات دن تک زندہ رہنا[ع۲]۔

فوائد الفواد میں شیخ ابو بکر شبلی بغدادی ۳۳۴ھ / ۹۴۵ کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ جب انکے پاس ایک شخص مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوا تو انہوں نے اسکی عقیدت اور اعتقاد کو آزمانے کے لئے اس سے کہا کہ تم لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے بجائے لا الہ الا اللہ شبلی رسول اللہ

ع۱ فوائد الفواد ص ۱۴۴

ع۲ فوائد السالکین قلمی ۱۱

پڑھو جب اس شخص نے اس طرح پڑھا تو خواجہ ابوبکر شبلی نے کہا کہ میں تو آنحضرت صلعم کے کمترین غلاموں میں سے ہوں اللہ کے رسول وہی ہیں میں تو محض تمھارے اعتقاد کا امتحان لے رہا تھا۔[1] فوائدالسالکین میں بھی اسی قسم کا واقعہ موجود ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اس واقعہ کو خواجہ معین الدین چشتی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اس مجلس میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو بھی موجود رکھا گیا ہے۔[2] مطلب یہ کہ بے جھجک طور سے فوائدالفواد کی عبارتوں کا سرقہ کیا گیا ہے۔

فوائدالسالکین میں اسی طرح ایک اور واقعہ درج ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ حج کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور تمام معاصر اولیاء کا مجمع تھا قاضی حمیدالدین ناگوری مولانا علاءالدین کرمانی، سید نورالدین مبارک غزنوی، سید شرف الدین، شیخ موئینہ دوز، مولانا فقیہ خداداد اور دیگر بزرگان کرام موجود تھے یہ سب انسان کامل تھے اور انکی نظر عرش سے لیکر فرش تک ہر راز سے واقف تھی غرض پوری کائنات کے جلوے انکے سامنے بے حجاب تھے قطب الدین بختیار کاکی نے فرمایا کہ اللہ کے خاص بندے اپنے مقام پر ہوتے ہیں تو بیت اللہ کو حکم ہوتا ہے کہ انکے گرد طواف کرے یہ بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ تمام اولیاء پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور تمام لوگوں نے اٹھ کر تکبیر کہنی شروع کر دی ان لوگوں کے جسم سے خون کے قطرے نکلنے لگے ہر قطرہ جو زمین پر گرتا وہ نقش تکبیر میں تبدیل ہو جاتا۔ جب حاضرین مجلس کو ہوش آیا تو انہوں

---

[1] فوائدالفواد ص ۲۳۱

[2] فوائدالسالکین قلمی ۱۵

نے کعبہ کو اپنے سامنے پایا سب لوگوں نے کعبہ کا طواف کیا اسی وقت عالم غیب سے آواز آئی

کہ عزیزو ہم نے تمہارا حج، طواف اور تمہاری نمازیں قبول کیں بلکہ انکے حج طواف اور نماز

کو بھی قبول کر لیا جو تمھارے نقش قدم پر چلینگے اور تمہاری پیروی کرینگے۔[1] یہ واقعہ صاف

بتا رہا ہے کہ ضعیف الاعتقاد مریدوں کے دل پر قطب الدین بختیار کاکی کے کمالات اور انکی کرامات کا

سکہ جمانے کے لئے گڑھا گیا ہے۔ سنجیدہ مسلمان ایسے ہی قصے سنکر تصوف سے بدگمان ہوتے چلے

گئے اور صوفیوں کی عزت بلند ہونے کے بجائے انکی ہستیاں لوگوں کی نظر میں سبک ہوگئیں اس

بیان کے تسلسل میں یہ بات بھی درج ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی سال میں ایک بار حج کو جایا

کرتے تھے مگر بعد میں جب وہ درجۂ کمال پر فائز ہو گئے تو آپ کے اجمیر میں ہی معتکف ہونے کے

باوجود لوگ آپ کو طواف کرتے ہوئے دیکھتے پھر یہ عالم ہوا کہ آپ ہر رات کو خانہ کعبہ کی زیارت

کے لئے جاتے اور صبح ہونے سے قبل ہی واپس آکر جماعت خانہ میں نماز باجماعت ادا کرتے۔[2]

حالانکہ ابتدائی تذکرہ نگاروں کے علاوہ بعد کے بھی کسی تذکرہ نگار نے خواجہ معین الدین چشتی کے اجمیر میں

مستقل سکونت کے بعد وہاں سے حج کرنے کے لئے تو کیا، دہلی کے سفر کے علاوہ کہیں اور جانے

کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

فوائد السالکین میں مذکور تاریخی اندراجات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم

---

[1] فوائد السالکین ص ۱۶

[2] ایضاً ص ۱۷

ہوتا ہے کہ دیگر جعلی ملفوظات کے تاریخی اندراج کی طرح یہ صرف غلط ہی نہیں بلکہ بے ترتیب بھی ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ اس کتاب کی تالیف کا کام بہت بعد میں کیا گیا اور مؤلف کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ فرید الدین گنجشکر کے زمانہ اور انکے خلافت پانے نیز بیعت و ارادت کی تاریخوں کی صحیح جانکاری نہ تھی یا پھر بعد میں کسی عقیدتمند نے فوائد السالکین کو اصلی تالیف ثابت کرنے کے لئے جلدی بازی میں تاریخی اندراجات کا بعد میں اضافہ کر دیا مگر اسکی تاریخی معلومات بھی درست نہ تھی ۔

پہلی مجلس میں شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے فرید الدین گنجشکر کو بیعت ہوتا دکھایا گیا ہے اور اس مجلس کے منعقد ہونے کی تاریخ ماہ رمضان اربعہ و ثمانین و خمسمائہ ۵۸۴ مذکور ہے۔ فوائد السالکین کی سبھی سات مجلسوں میں اسکے منعقد ہونے کی تاریخ مذکور ہے مجلس ہفتم جو آخری مجلس بھی ہے اسکے منعقد ہونے کی تاریخ ۵ محرم خمس و ثمانین و خمسمائہ ۵۸۵ ہے اس طرح اس ملفوظ میں صرف تین ماہ کے عرصہ پر محیط مجلسوں کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ اس کتاب میں مندرج واقعات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ ملفوظ فرید الدین گنجشکر کی بیعت و ارادت سے لیکر انکے خلافت پانے تک کے واقعات و ملفوظات پر مشتمل ہے ۔

نظام الدین اولیاء کے مختلف بیانات سے جو فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ملتے ہیں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فریدالدین گنج شکر نے ۱۲۶۷/۶۷۰ میں وفات پائی اور وفات کے وقت انکی عمر ۹۳ سال تھی[1] اگر مذکورہ بالا تاریخ وفات سے عمر کے ۹۳ سال کم کر دئے جائیں تو تاریخ پیدائش ۱۱۸۱/۵۷۷ ہوگی شیخ جمالی دہلوی نے اپنی کتاب سیر العارفین میں لکھا ہے کہ فریدالدین گنج شکر نے قطب الدین بختیار کاکی سے ۱۸ سال کی عمر میں بیعت کی[2] اس لئے بیعت و ارادت کی تاریخ ۱۱۹۸/۵۹۵ ہوگی نہ کہ فوائد السالکین میں مذکورہ تاریخ ۱۱۸۸/۵۸۴ اس تاریخ تک تو معزالدین محمد بن سام غوری نے ہندوستان پر حملہ بھی نہیں کیا تھا اور تذکروں میں فتح دہلی سے قبل خواجہ معین الدین چشتی کے قیام دہلی یا اجمیر کا ذکر تو ملتا ہے لیکن قطب الدین بختیار کاکی کا فتح دہلی سے قبل ہندوستان میں قیام کا ذکر کسی بھی تذکرے میں نہیں ملتا۔ جہاں تک دیگر مجالس کی تاریخوں کا ذکر ہے ظاہر ہے وہ بھی مؤلف کی تاریخی عدم واقفیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے اب ہم صرف آخری مجلس کی تاریخ کو لیتے ہیں جو ۵ محرم ۵۸۴ھ ہے اور جس میں فریدالدین گنج شکر کو ہانسی روانہ کرتے وقت قطب الدین بختیار کاکی کو انھیں عصا اور مصلیٰ دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اسے آخری ملاقات

---

[1] فوائد الفواد ص ۵۴

[2] سیر العارفین قلمی ۵۹

بتایا گیا ہے[1] اس سلسلے میں بھی ہمیں نظام الدین اولیاء کے بیانات پر ہی اعتماد کرنا چاہئے

فوائد الفواد میں ہے کہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے وقت فرید الدین گنج شکر ہانسی میں

مقیم تھے[2] اور وفات سے قبل وہ قطب الدین بختیار کاکی کی خدمت میں ہر دو ہفتے بعد حاضر ہوتے

رہتے تھے[3] فوائد السالکین میں مذکور واقعہ کے مطابق یہ انکی آخری ملاقات تھی تو نظام الدین

اولیا کے بیان کے مطابق یہ دو ہفتہ کے اندر کی ملاقات ہوگی قطب الدین بختیار کاکی کی وفات

متفقہ طور پر تمام تذکرہ نویسوں نے ۱۲۳۵/۶۳۳ تسلیم کی ہے اس لئے فوائد السالکین میں

مذکورہ تاریخ سے یقیناً مؤلف کے تاریخی عدم واقفیت کا پتہ چلتا ہے -

فوائد السالکین کی صحت مندرجہ بالا مثالوں اور بہت سی دیگر عبارتوں

کی بناء پر پایۂ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے مگر چونکہ مذکورہ کتاب شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے

منسوب ہے اس لئے تحقیق کا تقاضا اور ضابطۂ تحقیق کی مجبوری ہے کہ اسکا ذکر قطب الدین بختیار کاکی

کے ضمن میں ہی کیا جائے۔ ہم ذیل میں اس کتاب کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں -

فوائد السالکین آٹھ مجلسوں کے ملفوظات پر مشتمل ہے بیشتر مجلسوں کے

آغاز میں شرکاء کے نام بھی تحریر کر دئے گئے ہیں چند اہم شرکاء یہ ہیں : مولانا علاء کرمانی، قاضی حمید الدین ناگوری

---

[1] فوائد السالکین قلمی ۲۴

[2] فوائد الفواد ص ۵۲

[3] ایضاً ص

خواجہ محمود موزہ دوز، سید نورالدین مبارک، مولانا شمس الدین، مولانا فقیہ خداداد، نظام الدین الوالموید

سید شرف الدین وغیرہ وغیرہ

مجلس اول میں اپنے بیعت کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قطب الدین بختیار کاکی

نے فرمایا کہ صاحب سجادہ کو اتنی قوت ہونی چاہئے کہ جو شخص بھی اسکے پاس حصول بیعت کے لئے آئے

تو شیخ نظر باطن کی قوت سے جو کچھ بھی آلائشِ دنیا اسکے دل کے اندر ہے اسے نکالدے اور اسکا ہاتھ

پکڑ کر اسے خدا تک پہونچا دے اگر مرشد کے پاس یہ قوت نہیں تو پیر اور مرید دونوں بادیہ ضلالت میں ہیں[ع۱]

درویشی کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں کم کھانا کم بولنا کم سونا اور خلوق کے ساتھ کم رہنا جس کے

اندر یہ صفتیں ہونگی وہی قرب کے مرتبہ پر پہونچ سکتا ہے[ع۲] کامل درویش وہی ہے جو کسی پر

اسرار کو ظاہر نہ کرے اور جو کچھ وہ کہے اور حکم دے اس میں ذرہ برابر فرق نہ ہو[ع۳]

مجلس دوم میں اہل سلوک کے متعلق فرماتے ہیں کہ اہل سلوک وہ ہیں جو

سر سے پاؤں کے ناخن تک دریائے محبت میں غرق ہوتے ہیں اور ہر وقت انکی ذات پر عالم غیب

سے عشق و محبت کی بارش ہوتی رہتی ہے" عارف کی خوبی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "وہ دریائے

محبت میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ اس وقت اگر اس کے سینے میں زمین و زمان اور ما فیہا بھی

ع۱ فوائد السالکین قلمی ۱

ع۲ ایضاً ۲

ع۳ ایضاً ۴

داخل ہو جائیں اور اسکے ٹکڑے ٹکڑے بھی کردئے جائیں تو اسکو اسکی مطلق خبر نہ ہوگی۔ لیکن جو
شخص محبت کا دعوی کرنے کے باوجود تکلیف میں فریاد کرتا ہے وہ محبت میں صادق نہیں اس لئے[۱]
دعوئ محبت اسے ہی کرنا چاہیئے جو بلائے دوست پر صبر کرسکے۔ اور یہ سمجھے کہ دوست نے اسی
بہانے سے مجھے یاد کرلیا۔ جو شخص بلند مرتبہ پر پہونچتا ہے وہ اپنے اعمال کی وجہ سے ہی پہونچتا
ہے فیض الٰہی ہر آدمی کے خمیر میں شامل ہے، مقام حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش ضروری ہے[۱]
بزرگوں کے نیک اور بد کلمات دونوں اکسیر کی خاصیت رکھتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ فوراً
ہوجاتا ہے[۲] تجدید بیعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "یہ درست ہے اور حضور صلعم نے بھی فتح مکہ سے
قبل بیعت شجرہ اور بیعت رضوان لی تھی اور صحابہ کرام نے تجدید بیعت کی تھی اس لئے اگر کوئی
شخص اپنے پیر سے پھر جائے یا اسکے توبہ میں لغزش ہوجائے تو دوبارہ بیعت کرنا لازم ہوگا پہلی بیعت
درست نہیں رہیگی اگر پیر موجود نہیں تو اسکے کپڑے کو ہی سامنے رکھ کر بیعت کی جاسکتی ہے[۳] پیر
کا احترام اسکی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں میں یکساں ہونا چاہیے[۴] لیکن پیر کی وفات کے بعد اسکا
زیادہ احترام لازم ہو جاتا ہے۔ سماع کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو لذت اس میں ہے وہ کسی دوسری

چیز میں نہیں[۵]

۱۔ فوائد السالکین قلمی ۷
۲۔ ایضاً " ۹
۳۔ ایضاً " ۱۰
۴۔ ایضاً " ۱۱
۵۔ ایضاً " ۱۱

مجلس سوم میں سلوک کے سلسلے میں گفتگو ہوتی ہے مختلف سلسلوں میں سلوک کے متعین درجے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ" ان ہی درجوں میں سے ایک درجہ کشف وکرامت کا ہے سالک کو چاہئے کہ جب تک سلوک کے سارے درجے نہ طے کرلے اس وقت تک کشف وکرامت سے پرہیز کرے ورنہ اگر وہ اسی درجہ میں الجھ گیا تو پھر بقیہ درجات سے محروم رہ جائیگا[1] سلوک کے درجات متعین کرنے کی صرف اتنی وجہ تھی کہ سالک آسانی سے اپنے حالات ومقامات سے واقف ہوجائے تاکہ اگلے مقام تک پہونچنے کے لئے کوشش جاری رکھے[2]

مجلس چہارم میں ان لوگوں کے سلسلے میں گفتگو ہوتی ہے جو گلی اور کوچہ میں تکبیر کہتے رہتے ہیں فرماتے ہیں کہ تکبیر شکرانہ نعمت کے واسطے کہنا چاہئے حدیث میں ہے کہ" اسکے کہنے سے مزید نعمت حاصل ہوتی ہے تکبیر کے معنی حمد کے ہیں اور شکرانہ نعمت میں حمد کرنی چاہئے[3] پھر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نفل نماز پڑھ رہا ہو اسی دوران اگر اسکا پیر اسکو آواز دے تو اسی شخص کو چاہئے کہ وہ نماز چھوڑ کر پیر کے پاس پہونچے کیونکہ پیر کا فرمان بجالانا نماز نفل سے بہتر ہے[4] فرماتے ہیں کہ" اگر کوئی درویش کھانا کھارہا ہو تو اسکو سلام نہیں کرنا چاہئے کیونکہ درویش قوت عبادت کے واسطے کھانا کھاتے ہیں اس لئے وہ کھانا کھانے کے دوران

---

[1] فوائد السالکین قلمی ۱۲-۱۳
[2] ایضاً ، ۱۳
[3] ایضاً ، ۱۴
[4] ایضاً ، ۱۵

عین حالت عبادت میں ہوتے ہیں اور عبادت کے وقت جواب نہیں دیا جاتا۔ اس لئے ایسی

حالت میں سلام کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے[1]

مجلس پنجم میں حج کرنے اور قرآن حفظ کرنے کے سلسلے میں گفتگو ہوئی

ہے۔ فرماتے ہیں کہ "خدا کے ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جنکے لئے خدا کی طرف سے کعبہ کو حکم ہوتا ہے کہ

وہ اس بزرگ کے پاس جائے تاکہ وہ بزرگ طواف کریں اس سلسلے میں وہ خواجہ مودود چشتی

کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جب بھی انہیں خانۂ کعبہ کی زیارت کی خواہش ہوتی تو فرشتے خانۂ کعبہ

کو چشت لے جاتے اور انکے فراغت کے بعد کعبہ کو اسکے مقام پر پہونچا دیتے[2] قطب الدین بختیار کاکی

خود اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھے قرآن شریف حفظ نہ ہوتا تھا۔ میں فکرمند تھا ایک روز خواب

میں حضور صلعم کو دیکھا انہوں نے فرمایا کہ سورہ یوسف کی مواظبت کرو میں نے جب یہی کیا

تو مجھے قرآن حفظ ہوگیا اس لئے اگر کوئی قرآن حفظ کرنا چاہتا ہے تو وہ سورۂ یوسف کی

مواظبت کرے انشاءاللہ وہ کامیاب ہوگا[3]

مجلس ششم میں حوض شمسی کے بنانے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اس حوض

کے بنانے کے لئے سلطان شمس الدین (التمش) کو حضور صلعم نے خواب میں تاکید کی تھی اور جگہ

ع۱ فوائد السالکین قلمی ۱۶

ع۲ ایضاً " ۱۷

ع۳ ایضاً " ۱۷

کی نشاندہی بھی خواب کے ذریعہ کی تھی پھر شمس الدین (التمش) کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ نہایت راسخ الاعتقاد مرید تھا اپنا کام خود کرتا لباس تبدیل کر کے شہر کا گشت لگاتا اور رعیت کے حالات معلوم کرتا خود ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرتا[1] اور ہر شخص سے انصاف طلب کرنے کی تاکید کرتا[2] پھر جلال الدین تبریزی اور نجم الدین صغری کے درمیان اختلاف صغر کے قائم کئے جانے کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ کوئی بھی حجاب دنیا سے بڑا خدا اور بندے کے درمیان نہیں ہے اور اگر خدا تک کوئی شخص نہیں پہونچ پاتا تو اسکی وجہ یہی دنیا ہے جس قدر انسان دنیا میں مشغول ہوتا ہے اسی قدر وہ دنیا سے دور ہوجاتا ہے[3] درویش کے متعلق بتاتے ہیں کہ وہ دنیا کا دوست نہیں ہوتا اسکے لئے فاقہ سب سے بڑی نعمت ہے جس رات وہ فاقہ سے رہتا ہے وہ رات اسکے لئے معراج ہوتی ہے[4]

مجلس ہفتم میں سلوک کے سلسلے میں ذکر ہوتا ہے لوگ کھڑے ہوکر ذکر کرنے لگتے ہیں پھر بیہوش ہوجاتے ہیں اس قدر ذکر کرتے ہیں کہ انکے ہر بال سے خون جاری ہوجاتا ہے جو زمین پر گرنے کے بعد سبحان اللہ کا نقش اختیار کر لیتا ہے اور وہ قطرہ بھی باآواز بلند ذکر کرنے لگتا ہے[5] پھر فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیئے کہ پیر کی سنت پر عمل کرے[6] خوف کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ تازیانہ حق ہے جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اسی تازیانہ سے مارتے ہیں تاکہ اسکی اصلاح ہو جائے۔[6]

---

[1] فوائد السالکین قلمی ۱۸ — [2] فوائد السالکین قلمی ۱۹
[3] ایضاً " ۲۱ — [4] ایضاً " ۲۲
[5] ایضاً " ۲۲ — [6] ایضاً " ۲۲

مفتاح الطالبین خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے منسوب مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب مفتاح الطالبین (ملفوظ متعلق حوض شمسی) منسوب ہے اختصار کے ساتھ اس کتاب کا تعارف پیش خدمت ہے اس کتاب میں کسی شخص نے وہی ملفوظات جمع کئے ہیں جو قطب الدین بختیار کاکی نے حوض شمسی کی فضیلت کے متعلق بیان کئے ہیں۔ یہ کتاب اٹھارہ اوراق پر مشتمل ہے ابتدا میں ہے۔

"این الفاظیست در دربار گہر نثار بندگی قطب الاقطاب عالم شیخ قطب الدین کہ مخصوص در بیان عظمت حوض شمسی و سلطان شمس الدین و نماز کینہ درین اوراق کہ مسمّٰی مفتاح الطالبین است جمع گردانیدہ"

اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کے بارے میں جو بیان کرتے ہیں وہ درج ذیل ہے۔" ایک دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی مجلس میں مولانا عالم مظفر خواہر زادہ ملک مختار نائب قاضی نے کہا کہ ایک دن ایک حافظ کو قرآن شریف پڑھتے سنکر میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اگر مجھے بھی قرآن شریف یاد ہوتا تو میں رمضان میں ختم تراویح کرتا اسی وقت حسن دیوانہ آیا اور اس نے کہا کہ اگر تمھاری خواہش حفظ قرآن کی ہے تو گھر میں حافظ نہیں ہوگے حوض شمسی پر جاؤ اور حفظ میں مشغول ہو جاؤ حافظ ہوکر گھر آؤگے غرض وہ حوض شمسی پر گئے اور تھوڑی ہی مدت میں حافظ ہوکر گھر لوٹے[۱] اور تراویح پڑھی

۱۔ مفتاح الطالبین قلمی ۲

جب مولانا عالم نے یہ حکایت ختم کی تو قطب الدین بختیار کاکی نے حوض شمسی اور سلطان التمش کی عظمت بیان کرنی شروع کی انہوں نے بتایا کہ سلطان شمس الدین التمش بڑا متقی اور پرہیزگار تھا اسکے دل میں شہر کے نزدیک حوض بنانے کا خیال پیدا ہوا رات کو اس نے خواب میں حضور صلعم کو ایک مقام پر کھڑا ہوا دیکھا دوڑ کر انکے پاس پہونچا۔ اور قدموں پر گر گیا حضور صلعم جس گھوڑے پر بیٹھے تھے اس گھوڑے نے زمین پر پاؤں مارا تو گھوڑے کے سم کے نیچے سے صاف و شیریں پانی کا چشمہ جاری ہوگیا حضور صلعم نے شمس الدین التمش سے فرمایا کہ تم حوض بنانا چاہتے ہو تو اسی جگہ بناؤ ۔ خواب سے بیدار ہونے پر سلطان التمش خواب میں دیکھی ہوئی جگہ پر پہونچا تو دیکھا کہ چشمہ رواں ہے پھر شمس الدین نے اس جگہ حوض بنانے کا حکم دیا[1] قطب الدین بختیار کاکی اس حوض کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"حوض شمس الدین عظمت دارد حوض شمس الدین مقام عبادت است و مقام مستجاب دعوات و مقام بندگان خاص است و مقام رحمت است و مقام مغفرت است و مقام متعبدان است ، و مقام سیاحانست و مقام مسکیناںست و مقام صالحانست و مقام مشائخان است مقام غریبان .... صابران ... بیچارگان ... درماندگان ... غمگساران ... دیوانگگان ... آزادان و مقام مہتر خضر است[2]

پھر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خضرؑ سے ملاقات کرنا چاہے تو بالائی حوض شمسی اور

---

[1] یہ واقعہ بالکل اسی انداز سے مرآۃ الاسرار میں بھی موجود ہے ملاحظہ ہو مرآۃ الاسرار قلمی ۴۹ - ۵۰

[2] مفتاح الطالبین قلمی ۳ - ۴

نماز گاہ کہنہ پر پہونچے کیونکہ یہ خضرؑ کا مقام ہے اس قدر توصیف کرنے کے باوجود فرماتے ہیں۔

"این درویش صفت حوض شمسی سر موی ہم بیان نکردیم کہ بسر موی اگر بیان کند یکدفتر شود"۔[۱]

فرماتے ہیں کہ ان دونوں جگہوں پر بندوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور ان دونوں جیسا مقام دہلی میں کوئی دوسرا نہیں ان دونوں مقامات پر جو لوگ دفن ہیں وہ واصلان حق اور بندگان خاص ہیں اس مقام پر دفن ہونے والا کوئی بھی شخص عذاب میں نہیں ہے

حوض شمسی اور نماز گاہ کہنہ کی عظمت و توصیف کے بعد مختلف مواقع سے اپنے وہاں پہونچنے عبادت کرنے اور وہاں وقوع پذیر ہونے والے مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے صرف ایک واقعہ ملاحظہ ہو کہتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ وہ مولانا حمید الدین اور شیخ محمود موئینہ دوز کے ساتھ حوض شمسی پر پہونچے تو وہاں سناٹا تھا ان لوگوں نے نماز ادا کی یکایک بالای حوض شمسی سے آواز آئی فرماتے ہیں کہ ہم نے جس قدر تلاش کیا کوئی نہ ملا پھر تکبیر کی آواز آئی پھر نماز پڑھنے کی لیکن نماز پڑھنے والے کو نہ دیکھا۔ (ورق ۲۷) مختلف جگہوں سے عجیب و غریب لوگ وہاں آنے لگے (مثلاً کوئی شیر پر سوار ہاتھ میں سانپ کا چابک کوئی ہاتھی پر کوئی اونٹ پر کوئی گدھے پر) کوئی آہن پوش کوئی مادر زاد برہنہ عورت مرد غرض ہر کوئی آتا غسل کرتا نماز پڑھتا اور پھر واپس چلا جاتا۔ ان میں سے چند نے ان لوگوں سے بھی ملاقات کی اور اپنے حالات بتائے۔ ایک شخص کوہ قاف سے آتا ہے اور بتاتا ہے کہ حوض شمسی اور نماز گاہ کہنہ کی صفت سے متعلق اسے خواجہ خضرؑ نے بتایا تھا اور وہ اسے دیکھنے کے شوق سے حاضر ہوا (ورق ۲۸) غرض پوری کتاب اسی قسم کے واقعات پر مشتمل ہے۔

۱۔ مفتاح الطالبین قلمی ۲۸

اسرار الاولیاء :-

اسرار الاولیاء شیخ فرید الدین گنجشکر سے منسوب ہے یعنی اس کتاب میں شیخ فرید الدین گنجشکر کے اقوال ہیں جو انکے مرید اور خلیفہ مولانا بدرالدین اسحاق نے جمع کئے ہیں -

ہندوستان میں محمد بن سام غوری کی سیاسی کامیابی نے بہت گہرے اور پائدار اثرات چھوڑے یہاں اسلامی سلطنت قائم ہونے کے بعد ابتدائی ایک صدی اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کہ اس ابتدائی صدی کی یادیں وقت گذرنے کے بعد مسلمانوں کے ذہنوں میں اور زیادہ پختہ ہوتی چلی گئیں۔ اس صدی کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ چشتی اور سہروردی سلسلے کے بعض اکابر اور برگزیدہ اولیائے کرام یا باہر سے تشریف لاتے ہیں یا اسی سرزمین میں پیدا ہوتے ہیں مسلمانوں کے تہذیبی مزاج کی تشکیل میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ مذکورہ صدی گذرجانے کے بعد بلکہ شیخ نظام الدین اولیاء کا زمانہ ختم ہوجانے کے بعد جنکی وفات تیرھویں صدی عیسوی کے اختتام سے مزید ۲۴ سال بعد واقع ہوئی تھی صورتحال عرصہ تک ایسی نظر آتی ہے کہ ہندوستان کے پڑھے لکھے مسلمان عرصۂ مذکور کے بزرگوں سے انتہائی گہرا اور والہانہ قلبی تعلق رکھتے تھے اور انکو مثالی انسان سمجھتے تھے اور انکی زندگی کے واقعات اور اخلاقی تعلیمات کو سننے کا اس قدر شوق رکھتے تھے کہ انکے مناقب سننے سے جی ہی نہیں بھرتا

تھا۔ معتقدین کی یہی ضعیف الاعتقادی تھی جس نے ایک ناگزیر صورتحال پیدا کی اور معاشرے کا یہی رجحان چالاک اور بے جھجھک قسم کے راویوں کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے جنھوں نے ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاکر جعلی قصے مشہور کئے اور انکی تدوین کرکے پڑھے لکھے عوام کا دل خوش کیا اور ساتھ ہی ایسے رسالوں کی بے تحاشا فروخت سے اپنی جیب گرم کی۔

مولانا بدرالدین اسحاق کو مذکورہ بالا ملفوظات کا جمع کنندہ یا کاتب قرار دینا ویسی ہی ستم ظریفی ہے جیسی کہ معین الدین چشتی قطب الدین بختیار کاکی اور فرید الدین گنج شکر کے سلسلے میں کی گئی مولانا بدرالدین اسحاق کے معاصرین میں سب سے زیادہ نامور شخصیت شیخ نظام الدین اولیاء کی ہے دوسرے بزرگ امیر خورد ہیں جنکے خاندانی بزرگوں سے مولانا بدرالدین اسحاق کے گہرے تعلقات تھے یعنی امیر خورد کے دادا سید علی کرمانی مولانا بدرالدین اسحاق کے دوست تھے اور وہ سید علی کرمانی سے مختلف معاملات میں مشورہ لیا کرتے تھے انکے مشورہ سے ہی مولانا بدرالدین اسحاق نے خواجہ فرید الدین گنجشکر کی وفات کے بعد انکے لڑکے بدرالدین سلیمان سے کشیدگی کی بنا پر اجودھن کی جامع مسجد میں قیام کیا تھا۔[1] سیرالاولیاء میں مذکور چند دیگر واقعات سے ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاء اور امیر خورد دونوں حضرات میں سے کسی نے بھی اپنی تصانیف میں اس بات کا اشارہ تک نہیں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرالاولیا ص ۸۱ - ۸۲

گیا کہ مولانا بدرالدین اسحاق نے شیخ فریدالدین گنجشکر کے ملفوظات جمع کئے جبکہ شیخ نظام الدین اولیاء کو بھی مؤلف اسرارالاولیا نے اپنی مجلسوں میں شرکاء کی حیثیت سے جگہ دی ہے اگر مولانا بدرالدین اسحاق نے اس عنوان کے ملفوظات جمع کئے ہوتے تو یہ ناممکن تھا کہ مذکورہ بالا دونوں نامور بزرگ خاموش رہتے اور ایسی اہم کوشش کے ذکر سے چشم پوشی اختیار کرتے ۔

اسرارالاولیاء کے بیان میں دیگر جعلی ملفوظات کی طرح مافوق الفطرت اور بعید از عقل کرامات کے قصے شروع سے آخر تک بھرے پڑے ہیں۔ یقیناً اس کتاب کا مؤلف شیخ فریدالدین گنجشکر کی زندگانی اور سوانحی حالات سے ناواقف ہے وہ شیخ فرید کو بلاد اسلامی کی سیاحت کرتا ہوا دکھاتا ہے اسکے بیان کے مطابق شیخ فرید کبھی غزنی[1] کبھی بغداد[2] کبھی سیوستان[3] کبھی شام اور کبھی دمشق[4] میں نظر آتے ہیں[5] حالانکہ اصلی واقعہ یہ ہے کہ شیخ فریدالدین گنجشکر کبھی ہندوستان سے باہر تشریف نہیں لے گئے اکثر وبیشتر صوفیاء کا یہ معمول ضرور تھا کہ وہ بلاد اسلامی کا سفر کرنا درویشی کی تعلیم کا لازمی جزء تصور کرتے تھے مگر یہ کلیہ سبھی پر نافذ نہیں ہوتا اکثر وبیشتر صوفیائے کرام ایسے بھی ہیں جو اپنے مقام یا مرکز سے باہر کہیں بھی تشریف نہیں لے گئے دوسری بات یہ ہے کہ اس جعلی مؤلف نے شیخ نظام الدین اولیاء کی فوائد الفواد کو پڑھکر

---

[1] اسرارالاولیا ص ۵۲ - ۷۳ - ۷۹
[2] ایضاً " ۱۱ - ۲۹ - ۴۴
[3] ایضاً " ۱۸
[4] ایضاً " ۴۱
[5] ایضاً " ۴۸

بہت سی حکایات کا سرقہ کیا ہے اور بعض واقعات کو اسرار الاولیاء میں شامل کر کے شیخ فرید الدین گنجشکر سے اسکو نسبت دیدی ہے اس مؤلف کے سامنے دوسری جعلی تالیفات انیس الارواح اور دلیل العارفین بھی رہی ہیں چنانچہ انکی غلطیاں جوں کی توں اسرار الاولیاء میں منتقل ہو گئی ہیں۔

اسرار الاولیاء میں ایک جگہ فرید الدین گنجشکر کو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا شریک بزم دکھایا گیا ہے یہ بات اور اس بات کی ضمن میں شیخ سعد الدین حمویہ کی وفات (۶۵۰/۱۲۵۲) کے متعلق جو واقعات تحریر میں آئے ہیں وہ سب فرضی اور غیر تاریخی ہیں[ع۱] شیخ فرید الدین گنجشکر سے ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے متعدد ایسے اولیاء اور بزرگوں کا تذکرہ کر دیا گیا ہے جو حتماً شیخ فرید الدین گنجشکر کے معاصر نہیں تھے لیعنی شیخ فرید سے پہلے کے تھے یا انکے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور اکثر بزرگوں کے ساتھ فاصلہ زمانی کے علاوہ فاصلہ مکانی بھی حائل تھا۔ اس ضمن میں اس قدر شیوخ کا حوالہ دیا گیا ہے کہ ہم انکے اسمای گرامی کی تشریح سے فی الحال صرف نظر کرتے ہیں۔

اسرار الاولیاء میں بہت سارے واقعات فوائد الفواد سے لئے گئے ہیں

اسرار الاولیاء میں ایک جگہ شیر خاں کا ذکر ہے[ع۲] جو والی ملتان تھا یہ واقعہ فوائد الفواد سے لیا گیا ہے بلکہ فوائد الفواد کے اصل بیان میں خاصی حد تک تحریف کر دی گئی ہے[ع۳]۔ غرض بے شمار

ع۱ اسرار الاولیاء ص ۱۱
ع۲ ایضاً ص ۹۹
ع۳ فوائد الفواد ص ۲۱-۲۲۰

بیانات ہیں جنکا تضاد تاریخ کی معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے پر بھی ذرا سے غور وفکر سے ہی واضح ہو جاتا ہے ۔

اسرار الاولیاء محیّر العقول اور عجائب روزگار واقعات سے بھی پُر ہے مثال کے طور پر ایک واقعہ درج ہے ۔ کہتے ہیں کہ عبداللہ خفیف نامی ایک بزرگ تھے جو چالیس سال تک رات کو نہ سوئے اور وہ خوف خدا میں اس قدر روتے تھے کہ انکے رخسار پر گوشت نہ رہا اور چڑیوں نے رخساروں میں گھونسلے بنائے تھے اور انہیں چڑیوں کے رخساروں میں آنے جانے کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔[1] اب ہم ذیل میں اسرار الاولیاء کی مختلف فصلوں کے متن کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب بائیس[22] فصلوں پر مشتمل ہے ہر فصل کا عنوان جداگانہ ہے ہر فصل کی ابتدا میں شرکاء کے نام تحریر کردیے گئے ہیں چند مشہور شرکاء کے اسم گرامی درج ذیل ہیں : بدرالدین غزنوی، جمال الدین ہانسوی، شیخ برہان الدین مولانا نظام الدین بدایونی، مولانا یحیٰی غریب، شمس دبیر، کمال الدین حاکم اجودھن، مولانا تاج الدین مولانا شمس الدین بخاری، مولانا شہاب الدین غزنوی وغیرہ وغیرہ ۔ راحت القلوب کی طرح اس کتاب میں بھی خواجہ فریدالدین گنجشکر کو مختلف مقامات کا سفر کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور انکے مشاہدات کا ذکر کیا گیا ہے ۔ کبھی وہ غزنین،[2] کبھی بغداد،[3] کبھی سیوستان[4]

---

[1] اسرار الاولیاء ص ۵۸
[2] ایضاً " ۵۲ - ۷۳ - ۸۹
[3] ایضاً " ۱۱ - ۲۹ - ۴۴
[4] ایضاً " ۱۸

کبھی جانب ملک بالا[1]، کبھی شام[2] کبھی دمشق[3] کا سفر کرتے ہوئے اور وہاں پیش آنے والے
واقعات کا بیان کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کتاب میں واقعات و اقوال کے
بیان کو مستحکم بنانے کے لئے خاص مآخذات کا ذکر کر دیا گیا ہے ان میں بیشتر ایسی
کتابیں ہیں جو نہ آج موجود ہیں اور نہ ہی ان کتابوں کا ذکر کہیں اور ملتا ہے۔ مختلف
واقعات کے بیان کے دوران خواجہ فریدالدین گنجشکر پر گریہ طاری ہوجاتا تھا بلکہ کئی بار
بیہوش ہوجانے اور کئی کئی دنوں تک اپنے آپ سے بے خبر رہنے کا ذکر ملتا ہے۔[4]

اسرار الاولیاء میں مذکور تاریخی اندراجات کا جائزہ لیا جائے تو
پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی جعلی مؤلف کی تاریخی عدم واقفیت کا ایک ثبوت ہے۔ مولانا بدرالدین اسحاق
کے بیعت و ارادت کے متعلق سیرالاولیاء میں مذکور ہے کہ وہ بغرض سفرِ بخارا، دہلی سے روانہ
ہوکر اجودھن پہونچے جہاں فریدالدین گنجشکر سے انکی ملاقات ہوئی اور بدرالدین اسحاق
ان سے متاثر ہوکر انکی خدمت میں رہنے لگے[5] خواجہ فریدالدین گنجشکر اپنے پیرومرشد
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے بعد اجودھن پہونچے اور وہاں اپنی آخری عمر گذار کر
وہیں وفات پائی[6] قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کے وقت وہ ہانسی میں مقیم تھے[7]

ع۱ اسرار الاولیاء ص ۳۷
ع۲ ایضاً " ۴۱
ع۳ ایضاً " ۴۸
ع۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اسرار الاولیاء ص ۴ - ۸ - ۱۴ - ۱۵ - ۳۲ - ۵۰ - ۶۰
ع۵ سیرالاولیا ص ۱۸۰
ع۶ ایضاً ص ۷۳ ع۷ سیرالاولیاء ص ۹۹

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات کا سال تمام تذکرہ نویسوں نے متفقہ طور پر ۶۳۳/۱۲۳۵
لکھا ہے اس لئے قیام اجودھن کا زمانہ ۶۳۳/۱۲۳۵ کے بعد کا ہی ہوگا جبکہ مؤلف
اسرارالاولیا نے ۶۳۱ میں مولانا بدرالدین اسحاق کو اجودھن میں خواجہ فریدالدین گنجشکر
سے بیعت ہوتے ہوئے دکھایا ہے[1]۔ مولف نے اس ملفوظہ کو شیخ فریدالدین گنجشکر کے
بارہ سال کے ملفوظات کا مجموعہ بنایا ہے[2]

فصل اول میں اولیاء کے اسرار عشق کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان
کو ہمیشہ عشق خدا میں مستغرق رہنا چاہیئے اسے چاہیئے کہ جب تک اسکے جسم میں جان رہے
وہ اپنے معشوق (خدا) کا ذکر کرتا رہے جب ہی وہ بلند مقام پر پہونچے گا[3]۔

فصل دوم میں متعبدوں اور صاحب حال درویشوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ متعبد وہ
ہیں جنکا ظاہر و باطن دونوں حق سے آراستہ ہو اس میں غل وغش، حسد و ریا نہ ہو
اسکی عبادت مخلوق کو دکھانے کے لئے نہیں بلکہ حق کے لئے ہو اگر ایسا نہیں ہے تو اسکی عبادت
سے کوئی فائدہ نہیں[4] پھر انکی چار قسموں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ انسان جو کچھ
اس دنیا میں کرتا ہے قیامت کے دن اسکے ہفت اندام (ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ) اسکی گواہی دینگے[5]

---

[1] اسرارالاولیا ص ۲
[2] ایضاً " ۹۴
[3] ایضاً " ۴-۵
[4] ایضاً " ۹
[5] ایضاً " ۱۰

فصل سوم میں رزق کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کا دل روزی کے سلسلے میں مطمئن ہو

اور وہ دل سے عبادتِ خدا میں مصروف ہو تو جو کچھ اسکے مقدر میں ہے وہ اسے ضرور مل

جائیگا اس میں تھوڑی سی بھی کمی نہیں ہوگی موت کی طرح رزق بھی ایسے انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے

مسلمان اگر طلب دنیا میں لگا رہتا ہے تو دنیا اس سے بھاگتی ہے اور جب طلب مولیٰ میں لگا

رہتا ہے اور دنیا سے گریز کرتا ہے تو دنیا مختلف طریقوں سے اسکے پاس آتی رہتی ہے[۱] پھر رزق

کی چار قسموں رزق مقسوم، رزق مذموم، رزق مملوک اور رزق موعود کی تفصیلات بیان کرتے ہیں

فصل چہارم توبہ کے سلسلے میں ہے، فرماتے ہیں کہ توبہ کی چھ نوعیت ہے پہلا دل اور

زبان کا توبہ، دوسرا آنکھ کا توبہ، تیسرا کان کا توبہ، چوتھا ہاتھ کا توبہ، پانچواں پاؤں

کا توبہ اور چھٹا نفس کا توبہ[۲] پھر اسکی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ خدا اور

بندے کے درمیان جو حجاب ہے وہ دل کی آلائش کی وجہ سے ہے اگر توبہ کرنے سے یہ

ہٹ جائے تو بندہ اور خدا کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہیگا[۳]

مجلس پنجم میں بزرگوں کی خدمت کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دین و دنیا کی

سعادت مشائخ اور پیروں کی خدمت کرنے میں ہے جس نے سات دن انکی خدمت کی اسکے

---

[۱] اسرار الاولیا ص ۱۵

[۲] ایضاً " ۲۱

[۳] ایضاً ۲۳

&

نامۂ اعمال میں سات سو سال کی عبادت لکھی جائیگی۔[1] پھر فرماتے ہیں کہ ایک دن اپنے پیر کی خدمت کرنا ہزار سال کی عبادت بے صدق سے بہتر ہے[2]

مجلس ششم میں تلاوت کلام پاک کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کوئی بھی عبادت تلاوت قرآن سے زیادہ افضل نہیں۔ تلاوت کرنے والے شخص کو ہر حرف کے بدلے ہزار سال کی عبادت کا ثواب ملتا ہے اور اتنی ہی بدی اسکے نامۂ سیاہ سے دور کی جاتی ہے[3] تلاوت کرنے والا خدا سے ہمکلام ہوتا ہے اور دنیا کا ہر راز اس پر ظاہر ہوجاتا ہے اسکی تلاوت سے کئی لوگ یعنی اسکی تعلیم دینے والا اس کا پڑھنے والا اور اسکا سننے والا بخشا جاتا ہے[4]

مجلس ہفتم میں مختلف واقعات اور بیانات کے ذریعہ سورۂ اخلاص کی فضیلت اور اور اہمیت نیز اسکے پڑھنے کا ثواب واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[5]

مجلس ہشتم میں خرقہ اور فقر کے سلسلے میں گفتگو ہوئی ہے فرماتے ہیں کہ خرقہ پہنا انبیاء اور اولیاء کی سنت ہے اور اسکی ابتدا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ہوتی ہے جب انہیں منجنیق میں ڈالا گیا تو جبرئیل نے یہی لباس جنت سے لاکر انکو دیا۔ پھر فرماتے ہیں کہ میرے خواجگان کے نزدیک عقیدہ ہے کہ خرقہ معراج میں رسول صلعم کو ملا اور انہوں نے حضرت علی

ع۱ اسرار الاولیا ص ۳۷
ع۲ ایضاً " ۳۸
ع۳ ایضاً ۳۱
ع۴ ایضاً ۳۳
ع۵ ایضاً ۳۴ - ۳۷

کو عنایت کیا اور یہیں سے اسکی شہرت ہوئی[1] انسان جب تک دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک نہ ہو جائے اس وقت تک اسکے لئے خرقہ پہننا مناسب نہیں[2] فقر کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ درویشی یہ ہے کہ جو کچھ اسے کسی ذریعہ سے ملے اگر دن ہے تو رات کے لئے کچھ نہ رکھے اور اگر رات ہے تو دن کے لئے ایک ذرہ بھی نہ رکھے بلکہ جو کچھ اسکے پاس ہو وہ اسی وقت اسے خرچ کر دے۔[3]

مجلس ہفتم میں گلیم اور صوف کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ یہ انبیاء اور اولیاء کا لباس ہے اسکے پہننے والے کے لئے ضروری ہے کہ اسکا ظاہر اور باطن دونوں صاف ہو وہ اہل دنیا اور غیروں کی صحبت سے پرہیز کرے، لقمہ چرب و شیریں نہ کھائے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ انبیاء اور اہل سلوک کے لباس میں خائن ہے۔[4]

مجلس دہم میں محبت حق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسکے سات سو مقام ہیں اور اس میں پہلا مقام یہ ہے کہ اس پر جو بھی مصیبت دوست کی طرف سے نازل ہو اس پر صبر کرے[5] اس سلسلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، رابعہ بصری وغیرہ کے واقعات نقل کئے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ محبت یہ ہے کہ دوست کے علاوہ جو کچھ دنیا اور آخرت میں ہے اسے دوست نہ رکھے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ میرا ذکر مومن بندہ پر غالب ہوتا ہے تو میں اس پر عاشق ہوتا ہوں[6]

ع[1] اسرار الاولیا ص ۳۹
ع[2] ایضاً " ۴۰
ع[3] ایضاً " ۴۲
ع[4] ایضاً " ۴۸
ع[5] ایضاً " ۵۱
ع[6] ایضاً " ۵۴

مجلس یازدھم میں خوف خدا اور توکل کے سلسلے میں گفتگو کی ہے ان بزرگان دین

کا ذکر کیا ہے جو خوف خدا سے ہر وقت پریشان اور گریہ وزاری کرتے رہتے تھے کیونکہ

کسی کو یہ نہیں معلوم کہ اسکی عاقبت کیسی ہوگی[1] پھر فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو خوف خدا

نہیں وہ مسلمان نہیں[2] توکل کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ عقلمند وہی ہے جو خدا کے علاوہ

کسی اور پر توکل نہیں کرتا[3]

مجلس دوازدھم میں طاقیہ (کلاہ) کے سلسلے میں بتاتے ہیں کہ اسکی دو قسمیں ہیں لاطیہ

اور ناشرہ پھر اسکی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ کلاہ خدا کے حکم سے جبرئیل نے

حضور صلعم کو بہشت سے لاکر عنایت کیا تھا حضرت ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کو ایک

ایک کلاہ عنایت کی[4] کلاہ اسے ہی استعمال کرنا چاہیئے جو اسکے شرائط اور اسکا حق ادا کرسکے

مجلس سیزدھم میں درویشی اور اسکے جزء کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

درویشی وہ تھی جو حضور صلعم نے فقر کی صورت میں اختیار کی اگر وہ درویشی قبول نہ کرتے تو اسکی

برکت دنیا میں نہ رہتی درویش صابر کی دو رکعت نماز شاکر توانگر کی سات رکعت پر شرف رکھتی ہے[5]

قیامت کے دن توانگروں سے حساب لیا جائیگا جبکہ درویشوں سے عذر ہوگا نیز اس دن ایسے

ع۱ اسرار الاولیا ص ۵۸
ع۲ ایضاً " ۵۸
ع۳ ایضاً " ۶۰
ع۴ ایضاً " ۶۳
ع۵ ایضاً " ۶۸

لوگوں کو دوزخ میں ڈالنے کا حکم ہوگا جس نے نماز، روزہ، حج اور عمل صالح تو کیا لیکن

درویشوں سے روگردانی کی اور ایسے لوگوں کو بہشت میں ڈالا جائیگا جنہوں نے گناہ تو کیا

لیکن درویشوں سے محبت سے پیش آئے ؏۱

مجلس چہاردہم میں دنیا سے محبت اور عداوت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں تین قسم

کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا کو دوست رکھتے ہیں دوسرے وہ جو دنیا کو دشمن رکھتے ہیں اور

تیسرے وہ جو دنیا کو نہ دوست رکھتے ہیں اور نہ دشمن۔ ان میں سے آخری قسم کے لوگ بہتر ہیں ؏۲ پھر

فرماتے ہیں کہ جو خدا کی اطاعت کرتا ہے دنیا اسکی خدمت کرتی ہے اور جو دنیا کی خدمت کرتا ہے

(یعنی دنیا میں لگا رہتا ہے) وہ مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے ؏۳ پھر مختلف صوفیای کرام

کے واقعات بیان کئے ہیں جنہوں نے کیا کیسے بڑے بلند مقامات حاصل کئے۔

مجلس پانزدھم میں مریدوں کے حسن عقیدہ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے فرماتے

ہیں کہ وہ مرید جو پیر کے حسن عقیدہ میں نہیں آتے وہ مرید نہیں پھر حضور صلعم اور

قطب الدین بختیار کاکی کا ایک ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے صحابی اور

مرید کو آواز دی تو نماز میں مصروفیت کی وجہ سے انہوں نے جواب نہیں دیا جب وہ نماز نفل

؏۱ اسرار الاولیا ص ۶۹

؏۲ ایضاً " ۷۱

؏۳ ایضاً " ۷۳

سے فارغ ہوکر حضور کی خدمت میں پہونچے تو آپ نے ان سے جواب نہ دینے کی وجہ بیان کر فرمایا

کہ اگر نماز نفل کی حالت میں رسول خدا تمہیں آواز دے تو تم نماز ترک کرکے جواب دو کیونکہ

جواب دینا نماز سے بھی افضل ہے جب قطب الدین بختیارؒ نے اپنے مرید کو اسی حالت میں آواز دی

تو اس نے فورًا نماز ترک کرکے جواب دیا قطب الدین بختیار کاکی کے پوچھنے پر اس شخص نے کہا کہ

جب پیر، مرید کو آواز دے تو مرید کو چاہئے کہ فورًا جواب دے ایسا کرنے سے ایک سال کی

عبادت مرید کے نام لکھی جائیگی تو جواب نہ دیکر میں اسے کیوں ضائع کروں ۔ پھر فرماتے ہیں

"پیر را قوت ذات خود می باید تا مرید گیرد و چون یکے برنیت ارادت بخدمت پیر بیاید

پیر را واجب است کہ در حسن عقیدہ او نظر کند اگر بیند کہ او در جملہ کارہا بفرمان خدای

راسخ نیست او را آہستہ جواب گوید کہ وقت تو در نیامدہ است باز گردد"[1]

مجلس شانزدہم بزرگوں کے ہاتھ چومنے کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ یہ عمل رسول خدا صلعم

اور پہلے کے پیغمبروں کی سنت ہے اسی طرح جو شخص مشائخ کا ہاتھ تعظیم کی وجہ سے چومتا ہے

وہ گناہ سے ایسا پاک ہوتا ہے جیسے اسی روز پیدا ہوا ہو۔[2] پھر فرماتے ہیں مشائخ کا

ہاتھ رسول کا ہاتھ ہے جس نے مشائخ کا ہاتھ پکڑا ایسا ہے جیسے اس نے رسول کا ہاتھ پکڑا[3]

۱۔ اسرار الاولیا ص ۷۶

۲۔ ایضاً " ۷۹

۳۔ ایضاً " ۸۰

مجلس ہفتدہم میں ایک طائفہ کے سلسلے میں بات ہوتی ہے جو یاد حق میں مستغرق ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ایک شخص جو یاد حق سے غافل ہو جاتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ جس وقت وہ یاد حق سے غافل تھا اس وقت کس سعادت سے محروم ہو گیا تو پھر وہ شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یاد حق سے غافل نہ ہو"[1] اہل تصوف کے نزدیک جس آدمی کا دل یاد حق سے خالی ہے وہ مردہ ہے زندہ نہیں۔[2]

مجلس ہشتدہم میں علماء و مشائخ کی خدمت کرنے کے سلسلے میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ "من احب العلم والعلماء لم یکتب خطیئۃ" (جو شخص علم اور اہل علم سے محبت رکھے گا اس کا کوئی گناہ نہیں لکھا جائے گا)

پھر فرماتے ہیں کہ علماء و مشائخ سے دوستی رسول خدا سے دوستی ہے اور انکی آٹھ دن کی خدمت آٹھ ہزار سال کی عبادت کے مانند ہے کیونکہ علماء میراث وران انبیاء ہیں اور مشائخ خدا کے برگزیدہ بندے جن شہروں میں علماء اور مشائخ ہوتے ہیں ان میں بلائیں کم نازل ہوتی ہیں اور اگر ان کی برکت دنیا میں نہ ہوتی تو مخلوق پر روزانہ ہزاروں بلائیں آسمان سے نازل ہوتیں۔[3]

مجلس نوزدھم میں امساک باران (بارش کی کمی) کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ یہ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے جب بارش نہ ہو تو لوگوں کو چاہیئے کہ دعاء اور عبادت کریں اور

---

[1] اسرار الاولیاء ص ۸۴

[2] ایضاً ،، ۸۵

[3] ایضاً ،، ۸۶

صدقہ دیں کہ خدا اسکی برکت سے بارش کرے ع[۱]

مجلس بستم میں کشف کرامت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ جس طرح انبیا کے لئے معجزہ ہے اسی طرح اولیاء کے لئے کرامت، لیکن کرامت کا ظاہر کرنا فرض کا ترک کرنا ہے۔ سالک جب تک سلوک کے تمام درجے طے نہ کرلے اس وقت تک کرامت کا اظہار مناسب نہیں ع[۲]

مجلس بست یکم میں پیر کی تعظیم کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہئے کہ جو کچھ اسکا پیر اس سے کہے وہ دل وجان سے اسکو قبول کرے پیر کا حق مرید پر اس قدر ہے کہ اگر ساری عمر پیر کو سر پر اٹھا کر لیجائے تو بھی اسکا حق ادا نہیں ہوتا نیز پیر کا فرمان رسول کے فرمان کے مانند ہے اس لئے جس نے پیر کا حکم مانا ایسا ہی ہے جیسے اس نے رسول کا حکم مانا۔ ع[۳]

مجلس بست دوم میں رنج، محنت و مشقت کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انسان کو تکلیف پر صبر کرنا چاہئے ایسا کرنے سے خدا اسکی تکلیف کو ختم کردیتا ہے نیز تکلیف کے ذریعہ ہی انسان گناہوں سے پاک ہوتا ہے درویشوں کا یہ معمول رہا ہے کہ اگر ان پر تکلیف نازل ہوتی تو وہ اس پر صبر کرتے اور شکرانہ ادا کرتے اور اگر تکلیف نازل نہ ہوتی تو یہ سمجھتے کہ آج دوست نے مجھے یاد نہیں کیا ع[۴]

ع۱ اسرار الاولیا ص ۸۷
ع۲ ایضاً " ۸۸
ع۳ ایضاً " ۹۱
ع۴ ایضاً " ۹۲-۹۳

راحت القلوب

راحت القلوب شیخ فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات کا دوسرا مجموعہ ہے
جس کا محرر شیخ نظام الدین اولیا کو بتایا جاتا ہے اور انکی طرف مذکورہ بالا تالیف منسوب ہے ۔

تیرھویں صدی عیسوی کے بعد اسلامی ہند کے معاشرہ میں جو فکری ماحول
وجود میں آیا اس پر گذشتہ صدی کے اولیاء کرام کے تصورات کی حکمرانی تھی لوگوں کو ان اکابر
مشائخ کی ذات سے ایسا زبردست عشق تھا اور انکے ذکر سے اس قدر محظوظ ہوتے تھے کہ
وہ ہر کتاب یا رسالہ جو الله کی نسبت سے بازار میں بکتا ہوا نظر آتا اس کو متبرک سمجھکر
ہر آدمی خرید لیتا تھا اور دیکھتے دیکھتے اسکی شہرت ہر شہر میں (اور مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے
کہ) ہر گھر میں پہونچ جاتی تھی، والہانہ عقیدتمندی اجازت نہ دیتی تھی کہ ایسی کسی کتاب کی
باتوں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے اور ان کتابوں کی عبارتوں کو ایک مورخ کی نظر سے جانچا جائے
یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستانی قرون وسطی کا معاشرہ تنقیدی معیار اور تاریخی معلومات سے
بالکل بے بہرہ تھا اصلی معاملہ صوفیائے کرام سے عشق کی حد تک تعلق اور جذباتی وابستگی
کا تھا ان کے نام سے ہر وہ قصہ اور ہر وہ کرامات جو کسی کتاب میں لکھ دی گئی اسکو عقل
کی میزان میں جانچنا ادب کے خلاف سمجھا جاتا تھا ۔

مذکورہ بالا کتاب راحت القلوب کا اسلوب اور واقعاتی بیان صاف

ظاہر کرتا ہے کہ یہ تالیف شیخ نظام الدین اولیاء کی نہیں ہو سکتی اس کے متن میں واقعات کے بیان اور افذ و اکتساب کا وہی انداز ہے جو دوسرے جعلی ملفوظات کا ہے اور اسکی عبارتوں کو سرقے کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ راحت القلوب میں اکثر و بیشتر مقامات پر شیخ نظام الدین اولیاء کی فوائد الفواد سے بیانات تراشے گئے ہیں اور انکی اس قدر تحریف کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو فوائد الفواد کا معتبر نسخہ جعل سازوں کی دسترس میں نہیں تھا یا اس کا محرر اس قدر جاہل اور بے سواد تھا کہ فوائد الفواد کا متن صحیح طور سے پڑھ نہ سکا۔ دوسری بات یہ کہ اس کتاب میں بعض ایسی تالیفات کا بھی حوالہ دیا گیا ہے جو شیخ نظام الدین اولیاء کے وقت تک موجود نہ تھی بلکہ انکے بعد لکھی گئی جیسے شرح الاسرار خواجہ ابو محمد چشتی شرح اولیاء۔ خواجہ مودود چشتی، قوت القلوب۔ خواجہ عثمان ہروانی اوراد خواجہ معین الدین چشتی و قطب الدین بختیار کاکی وغیرہ وغیرہ۔

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے مرشد شیخ فرید الدین گنجشکر سے ملاقات کے لئے تین بار اجودھن کا سفر کیا تیسرے اور آخری سفر کے موقع پر پیر نے انکو خلافت نامہ عطا فرمایا[1]۔ تینوں مسافرتوں کا حوالہ فوائد الفواد اور اسرار الاولیاء[2] میں موجود ہے ان معتبر شہادتوں کے برخلاف راحت القلوب میں شیخ نظام الدین اولیاء کی اجودھن کی مسافرت

[1] فوائد الفواد ص ۴۲

[2] سیر الاولیاء ص ۱۱۷

اور قیام کو فقط ایک بار دکھلایا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسی ایک قیام کے بعد شیخ نظام الدین اولیاء کو اپنے مرشد شیخ فریدالدین گنجشکر کی طرف سے خلافت نامہ عنایت کر دیا گیا۔

راحت القلوب میں ایک مقام پر مذکور ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء اجودھن کے دوران قیام میں ایک بار شیخ محمد ہانسوی کے پاس گئے اور وہاں سے مندرجہ ذیل رباعی

زان روی کہ بندۂ تو دانند مرا　　　　بر مردمک دیدہ نشانند مرا

لطف عامت عنایتی فرمود است　　　　ورنہ چہ کسم خلق چہ دانند مرا

لکھ کر اپنے مرشد کی خدمت میں بھیجی یہ بیان خلاف حقیقت ہے اصل بات یہ ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے وہ رباعی دہلی سے لکھ کر شیخ فریدالدین گنجشکر کو بھیجی تھی ؎۱

راحت القلوب کا مؤلف مختلف تاریخوں کے ذیل میں شیخ نظام الدین اولیاء کو اجودھن میں اپنے مرشد کی خانقاہ میں حاضری دیتا ہوا دکھاتا ہے گویا وہ ان تاریخوں میں خانقاہ کے اندر کہیں باہر سے تشریف لائے تھے اسکو یہ حقیقت نہیں معلوم کہ شیخ نظام الدین اولیاء اپنے قیام کے دوران شیخ فریدالدین گنجشکر کی خانقاہ ہی میں رہتے تھے ؎۲ اور وہ یقیناً خانقاہ میں مرسوم جملہ آداب یعنی اذکار و عبادات اور وعظ و تقریر میں پوری طرح شریک ہوتے تھے۔

راحت القلوب میں شیخ فریدالدین گنجشکر کو بلاد اسلامی کی سیاحت کرتا ہوا دکھایا گیا ہے اور ہر شہر میں مختلف مشائخ سے ملاقات کا بیان تفصیل کے ساتھ

؎۱ فوائد الفواد ص ۱۸۰
؎۲ سیر الاولیا ص ۱۱۷

نظر آتا ہے یہ سب مؤلف کے ذہن کی پیداوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ فرید الدین گنجشکر نے (جیسا کہ سابق گفتگو کے ضمن میں عرض کیا گیا) اپنی زندگی میں کبھی ہندوستان سے باہر مسافرت کے لئے قدم نہیں نکالا۔

شیخ فرید الدین گنجشکر کی زبان سے مختلف مقامات پر بعض بزرگوں کی وفات کا حوالہ دیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان میں شیر خاں والی ملتان (وفات ۶۶۳/۱۲۶۴)[۱۵] شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (وفات ۶۶۲/۱۲۶۳)[۲۲] اور شیخ سیف الدین باخرزی کی وفات کی[۱۲] تاریخیں سراسر غلط دی گئی ہیں۔[ع۱]

راحت القلوب میں ایک موقع پر ملک شام کی طرف سے سفر کرتا ہوا ایک سیاح آتا ہے شیخ فرید الدین گنجشکر کی مجلس میں حاضر ہو کر وہ انکے سامنے منگولوں کے ہاتھ سے شہر دمشق کی بربادی کا حال بیان کرتا ہے واقعہ یہ ہے کہ سیاح کی زبان سے اس حادثہ کا جو سال مذکور ہے نیز وہ سراسر غلط ہے[ع۲] منگول اس وقت تک شہر دمشق کی طرف نہیں بڑھے تھے اور بعد میں انہوں نے دمشق پر حملہ کی کوشش بھی کی تو وہ ناکام ہوئے مزید یہ کہ اس مجلس میں شیخ فرید الدین گنجشکر کی زبان سے ایک خلاف عقل واقعہ کا بھی ذکر ہے جو علم تاریخ کی صریحی ناواقفیت اور بے تحاشا تحریف

ع۱ راحت القلوب قلمی ۱۷ اور ۲۲ - اسکے علاوہ کی مجلس میں بہاء الدین زکریا کے پاس آنے ہوئے درویشوں کو شریک مجلس دکھایا گیا ہے۔

ع۲ ایضاً قلمی ۲۴

کا ایک نمونہ ہے شیخ فریدالدین گنجشکر کو مختلف حوالوں سے یہ کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے
کہ ان کے ایک معاصر نے اصفہان میں ایک صوفی کو دیکھا جسکی عمر ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال تھی اور
جو خود کو خواجہ حسن بصری کا مرید کہتا تھا۔[ع۱] حقیقت میں خواجہ فریدالدین گنجشکر سے
اس قسم کی غلط بیانی کی ہرگز امید نہیں کی جاسکتی وہ یقیناً جانتے تھے کہ حسن بصری
اسلام کی پہلی صدی ہجری کے بزرگ ہیں اور انکا عرصۂ حیات ساتویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔
اسی طرح ایک دفعہ فریدالدین گنجشکر کی زبان سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ بغداد میں ایک
صوفی سے ملے جو شیخ جنید بغدادی کے مریدوں میں سے تھے[ع۲] اور بدخشاں میں کسی دوسرے
صوفی سے ملاقات کی جو شیخ ذوالنون مصری کا مرید تھا[ع۳] اگر جعلی مولف کو تاریخ کا ذرا
سا بھی علم ہوتا تو وہ اس قسم کے من گھڑت قصے کبھی نہ لکھتا۔

راحت القلوب کے تاریخی اندراجات کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس
میں بھی بڑی بے ترتیبی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو کتاب کی تالیف کی اس
قدر جلدی تھی کہ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس نے قبل کی مجلس میں کیا تاریخ لکھی ہے۔
نیز اسے شیخ نظام الدین اولیاء کے بیعت و ارادت اور خلافت پانے کی تاریخوں کے متعلق
بھی صحیح تاریخی واقفیت نہ تھی اس نے پہلی مجلس میں نظام الدین اولیا کو اپنے مرشد کی خدمت

ع۱ راحت القلوب قلمی ۲۶
ع۲ ایضاً " قلمی ۹
ع۳ ایضاً " ۱۸

میں حاضر ہوتے اور ان سے خرقہ و کلاہ پاتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور اسکا سن ماہ رجب خمس خمسین وستمایہ (۶۵۵) لکھا ہے ایک دوسرے نسخہ میں پانزدہم ماہ رجب مذکور ہے چوبیسویں مجلس جو آخری مجلس بھی ہے اسکے منعقد ہونے کی تاریخ خمسین وستمائیہ (۶۵۰) ہے اور اسی مجلس میں نظام الدین اولیاء کو خلافت نامہ حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسکے علاوہ اندرونی مجلسوں کی تاریخوں میں بھی بڑی بے ترتیبی ہے۔ سترھویں مجلس کی تاریخ ہفدہم ماہ ذی الحجہ اور اٹھارویں مجلس میں ہشتم ماہ مذکور ہے اسی طرح بیسویں مجلس ماہ محرم میں منعقد ہوتی ہے جبکہ سن وہی ۶۵۵ ہے جو اسکے قبل کی مجلسوں کا سن ہے۔ عربی سال کا پہلا مہینہ محرم ہوتا ہے اس لئے سال کو ضرور بدل جانا چاہئیے۔ اگر ہم پہلی اور آخری مجلسوں کی تاریخوں یعنی نظام الدین اولیاء کے بیعت وارادت اور خلافت پانے کی تاریخوں سے جو فوائد الفواد اور سیرالاولیاء میں مذکور ہیں مقابلہ کریں تو یہ بات واضح ہوجائیگی کہ راحت القلوب میں مندرج تاریخیں بالکل غلط ہیں اور مؤلف کی تاریخی معلومات سے لاعلمی کا پتہ دیتی ہیں۔ نظام الدین اولیاء کی تاریخ وفات صاحب سیرالاولیاء نے ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ لکھی ہے[1] اور اسے تمام تذکرہ نویس متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ امیر خورد کرمانی (جنھوں نے نظام الدین اولیاء کے سایۂ عاطفت میں زندگی کے ابتدائی ایام گزارے تھے) لکھتے ہیں کہ " نظام الدین اولیاء کی عمر

---

[1] سیرالاولیاء ص ۱۶۵

اسی سال ہوگئی تھی [1] اگر ان کی تاریخ وفات میں سے اسی سال کم کر دیئے جائیں تو انکی تاریخ پیدائش ۶۴۵/۱۲۴۷ ہوگی۔ نظام الدین اولیاء کا بیان ہے کہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں فریدالدین گنجشکر سے بیعت کی [2] اس طرح سن بیعت ۶۶۵/ ۱۲۶۷ ہوگا نہ کہ راحت القلوب میں مذکور ۶۵۵۔ آخری مجلس کے ضمن میں جس میں نظام الدین اولیاء کے خلافت نامہ پانے کا ذکر ہے اس سلسلے میں قبل کے ملفوظ کے ضمن میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ فریدالدین گنجشکر نے نظام الدین اولیاء کو ماہ شوال ۶۶۹/ ۱۲۷۰ میں دہلی بھیج دیا تھا اور محرم ۶۷۰/۱۲۷۰ میں فریدالدین گنجشکر نے وفات پائی اور اس آخری ملاقات کے موقع سے ہی انہیں خلافت نامہ عطا کیا گیا تھا۔

راحت القلوب کا مطالعہ تحقیق کی ایک لازمی ضرورت کے تحت کیا گیا تالیف مذکور پر مختصر تبصرہ کے بعد جو اوپر کی سطروں میں پیش کیا گیا ہم اس کتاب کا مختصر خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

مجلس اول میں نظام الدین اولیاء اپنے مرشد سے بیعت کا ذکر کرتے ہیں

اسکے بعد درویشی کے متعلق گفتگو ہوتی ہے فریدالدین گنجشکر فرماتے ہیں کہ درویشی پردہ پوشی ہے خرقہ اسی کے لئے ہے جو مسلمانوں کے عیب کو چھپائے [3]۔ اور جو مال اسکے پاس ہو وہ اسے خدا

۱۔ سیرالاولیاء ص ۱۳۴

۲۔ ایضاً ص ۱۱۷

۳۔ راحت القلوب قلمی ۱

کی راہ میں خرچ کردے اہل طریقت نے زکوٰۃ کی تین قسمیں مقرر کی ہیں زکوٰۃ شریعت یعنی

دو سو درم میں سے پانچ درم صدقہ کرے طریقت یعنی دو سو درم میں سے اپنے پاس صرف پانچ درم رکھے اور

زکوٰۃ حقیقت یعنی دو سو درم میں سے کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھے پورا کا پورا تقسیم کردے[1] فرماتے ہیں کہ

" درویش کے اندر چار صفتیں لازمی ہیں پہلی یہ کہ اپنی آنکھوں کو بند کرلے تاکہ عیب بندگان نہ دیکھے دوسری یہ کہ

اپنے کان کو بہرا کرلے تاکہ ایسی باتیں نہ سنے جو سننے کے لائق نہ ہوں تیسری یہ کہ اپنی زبان کو گونگی کرلے

تاکہ ایسی باتیں نہ کہے جو کہنے کے لائق نہ ہوں چوتھی یہ کہ اپنے پاؤں کو لنگڑا کرلے تاکہ ناجائز ضرورت

سے یا بغیر ضرورت کے کہیں نہ جائے[2]

مجلس دوم میں فرماتے ہیں کہ " درویش کے پاس جو کوئی بھی آئے اسے وہ کچھ نہ کچھ

ضرور پیش کرے۔ اگر اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو آنے والے کو پانی ہی پلادے[3] اس سلسلے میں انہوں نے

قطب الدین بختیار کاکی، سیف الدین باخرزی اور دیگر بزرگان کرام کے واقعات بیان کئے ہیں

مجلس سوم میں فرماتے ہیں کہ " حضور صلعم کا ارشاد ہے " دنیا کی محبت تمام برائیوں

کی جڑ ہے اور جس نے دنیا کو چھوڑا وہ فرشتہ ہوا اور جس نے دنیا کو پکڑا وہ ہلاک ہوا "[4] پھر فرماتے

ہیں کہ " گلیم اور صوف پہننے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ لقمۂ حرام سے پرہیز کرے اور اہل دنیا سے الگ رہے

انکی مناجات پر خدا انکی حاجت جلد ہی پوری کردیتا ہے[5]

ع۱ راحت القلوب قلمی ۱ — ع۲ راحت القلوب قلمی ۳
ع۳ ایضاً " ۴ — ع۴ ایضاً " ۶
ع۵ ایضاً " ۸

مجلس چہارم میں شب معراج کے سلسلے میں گفتگو ہوتی ہے فرماتے ہیں کہ یہ نہایت باعظمت اور بابرکت رات ہے کیونکہ اس رات کو حضور صلعم کو عروج حاصل ہوا اس لئے اس رات کو جو بھی جاگ کر عبادت کریگا اسکے نامۂ اعمال میں سعادت معراج اور اسکا ثواب لکھا جائیگا۔[1] پھر اس رات کی عبادات کا ذکر کیا ہے۔ اہل سماع کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ یہ راحت دل اور اہل محبت کو جنبش دینے والا ہے[1]

مجلس پنجم میں مرید ہونے کے لئے جو شرائط ہیں، انکا ذکر کرنے کے بعد پیر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اسکو اس قدر قوت ہونی چاہئے کہ جب کوئی شخص ارادت کی نیت سے اسکے پاس آئے تو وہ ایک نگاہ میں ہی اسکے سینے سے تمام دنیاوی رنگینی نکال دے اور آئینہ کے مانند روشن کردے۔[2] اگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تو وہ مرید نہ کرے

مجلس ششم میں نماز کے متعلق بہت گفتگو کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ بیماری رحمت ہے جو اسکے گناہوں کو ختم کرتی ہے بیماری یا کسی چیز کا نقصان خدا کی طرف سے انسان کو اس بات کا احساس دلانے کے لئے ہوتا ہے کہ اس سے کسی قسم کی کوتاہی ہوئی ہے[3]

مجلس ہفتم میں کشف و کرامت کے متعلق گفتگو ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف واقعات کا بیان ہے پھر مختلف بزرگان دین کی وفات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ انکو وفات سے قبل اسکی

ع۱ راحت القلوب قلمی ۱۱
ع۲ ایضاً " ۱۲
ع۳ ایضاً " ۱۷
ع۴ ایضاً "

آگاہی ہو جاتی تھی اور وہ بخوشی اس کے لئے پہلے سے تیار رہتے ہیں۔

مجلس ہشتم سلوک کے سلسلے میں شیخ فرماتے ہیں کہ "درویشوں کا طریقہ تحمل ہے اگر کوئی شخص ان پر ظلم کرے بلکہ ننگی تلوار انکی گردن پر رکھے یا مارے تو بھی اسے تحمل سے کام لینا چاہئے ایسے شخص کے لئے بھی بددعا کرنا مناسب نہیں [1] پھر ورد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتلاتے ہیں کہ اگر کسی سے ورد یا وظیفہ فوت ہو جاتے تو یہ اسکے لئے موت سے بھی بڑھکر ہوتا ہے صاحب ورد کے لئے لازم ہے کہ وہ کسی نہ کسی وقت اسے ضرور پڑھ لے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اسکی بلا صاحب ورد کے علاوہ اہل شہر پر بھی نازل ہو سکتی ہے [2] پھر بزرگان دین سے بیعت کرنے کی اہمیت بتلاتا ہے اور اس سلسلے میں خواجہ عثمان ہروانی کے ایک مرید کا واقعہ نقل کیا ہے جو گنہگار ہونے کے باوجود عذاب قبر سے محفوظ رہا [3]۔

مجلس نہم میں رمضان کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس ماہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو شیطان کے شر سے بچانے کے لئے اسے لوہے کی زنجیر میں جکڑ دیتے ہیں [4] پھر کشف و کرامت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ جمال الدین اوچی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ بظاہر گھر پر موجود ہوتے اور حج کے موقع سے لوگ انہیں حج کرتے ہوئے دیکھتے یہی نہیں بلکہ آپ اوچ میں کبھی نماز نہ پڑھتے بوقت نماز غائب ہو جاتے اور خانہ کعبہ میں نماز ادا فرماتے" [5]

مجلس دہم میں فرماتے ہیں کہ جو شخص دوستی حق کا دعوی کرے اور اس کے دل میں محبت دنیاوی ہو وہ کاذب ہے" [6] پھر فرماتے ہیں کہ رحمت الٰہی ان تین وقتوں میں نازل ہوتی ہے حالت سماع

---

1. راحت القلوب قلمی ۲۳
2. ایضاً " ۲۴
3. ایضاً " ۲۵
4. ایضاً " ۲۸
5. ایضاً " ۳۰

حالت طعام خوردن (جب طاعت الٰہی کے لئے قوت حاصل کرنے کی نیت سے کھایا جائے) اور حالت ماجرا اور درویشوں کے صفا کرتے وقت[1]

مجلس یازدہم کی ابتدا میں کچھ ایسے واقعات بیان کئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشائخ چشت کے یہاں کسی بادشاہ یا امراء کے دیئے ہوئے مال و دولت اور جائداد کا لینا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان بزرگوں نے ہمیشہ اس سے پرہیز کیا پھر کرامت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ یہ پست حوصلہ لوگوں کا کام ہے اور اس سے نفس کو تکبر پیدا ہوتا ہے[2] شیخ سعد الدین حموی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "جس نے ایک کرامت ظاہر کی گویا اس نے ایک فرض ترک کر دیا"[3]

مجلس دوازدہم میں حضرت عمر بن الخطاب کی بزرگی اور عدل کے کئی واقعات بیان کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے خرقہ میں بخیہ کر رہے تھے آپکی پشت آفتاب کی طرف تھی جو اسکی حرارت سے گرم ہو گئی آپ نے ایک قہر آلودہ نگاہ آفتاب پر ڈالی تو بحکم خدا فرشتوں نے آفتاب سے نور لے لیا تاریکی چھا گئی پھر آپ کے معاف کرنے کے بعد ہی آفتاب کو روشنی ملی[4]

مجلس سیزدہم میں ترک دنیا کے سلسلے میں گفتگو ہوتی ہے ایک بزرگ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "انہوں نے کہا کہ اگر مجھے پوری دنیا دیدی جائے اور یہ بھی کہہ دیا جائے کہ

---

1. راحت القلوب قلمی ٣٢
2. ایضاً ٣٤
3. ایضاً ٣٥
4. ایضاً ٣٦

اسکا حساب نہیں لیا جائیگا اور اسکے قبول نہ کرنے پر دوزخ میں ڈال دیا جائیگا تو میں دوزخ میں جانا قبول کرلونگا لیکن دنیا نہ لونگا کیونکہ دنیا مبغوضہ خدا ہے اور خدا اسکو دشمن رکھتا ہے[1]

علم و عقل کا موازنہ کرتے ہوئے علم پر عقل کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا کی انسان پر دو منت ہے ظاہری اور باطنی، منت ظاہری یہ ہے کہ اسنے اصلاح کے لئے پیغمبر بھیجے اور منت باطنی عقل ہے کہ بغیر عقل کے علم سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔[2]

مجلس چہاردہم میں علم و فضل کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ تمام عبادتوں سے افضل ہے" معرفت کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "جسکو اپنی معرفت نہیں ہوتی وہ دوسروں کے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن جب خدا سے محبت ہو جاتی ہے تو کسی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا"[3]

مجلس پانزدہم میں ترک دنیا کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "جب خدا نے اس دنیا کو بنایا اسکے بعد سے اسکی طرف آنکھ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا حضرت علی کا ارشاد ہے کہ مومنوں کو درازی امل متابعت دنیا اور ہوای نفس سے ڈرنا چاہیئے"[4] فرماتے ہیں کہ جس کے اندر تین چیزیں نہ ہوں وہ زاہد نہیں پہلی چیز دنیا کا جاننا اور اس سے ہاتھ اٹھا لینا دوسری طاعت مولی کرنا اور آداب کی رعایت رکھنا اور تیسری آخرت کی آرزو کرنا اور اسکو طلب کرنا"[5] پھر داڑھی رکھنے، جماعت سے نماز ادا کرنے اور سورہ یس کی تلاوت کے فوائد بیان کئے ہیں[6] اور ترک قربانی ترک نماز اور ترک زکوٰۃ کے نقصانات[7]

ع ۱-۲ راحت القلوب قلمی ۳۷
ع ۳ ایضاً " ۳۹
ع ۴ ایضاً ۴۰
ع ۵ ایضاً ۴۱
ع ۶ ایضاً ۴۲-۴۳
ع ۷ ایضاً ۴۳

مجلس شانزدھم میں ماہ ذی الحجہ کی فضیلت کا بیان ہے اور اس ماہ میں مختلف

دنوں اور اوقات میں کی جانے والی عبادت اور اسکے ثواب کا ذکر ہے[1]

مجلس ہفدہم میں مذہب امام اعظم ابو حنیفہ، امام شافعی، امام حنبل اور امام مالک

کے متعلق گفتگو کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ان میں سے افضل مذہب امام اعظم ابو حنیفہ کا ہے لیکن مسلمانوں

کو چاہیئے کہ ان میں سے کسی پر شک نہ کرے اگر اس نے شک کیا تو وہ اہل سنت وجماعت میں نہیں

پھر شجرہ کی اہمیت بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر مرید کو اپنے پیر کا شجرہ جاننا فرض ہے[2] پھر مختلف پریشانیوں

سے بچنے کے لئے اوراد کا ذکر ہے۔

مجلس ہجدہم میں درود کی فضیلت آیت الکرسی کی اہمیت اور ان دونوں کے پڑھنے

سے حاصل ہونے والے فوائد کا بیان ہے[3]

مجلس نوزدھم میں مختلف مقاصد اور پریشانیوں سے بچنے کے لئے دعاؤں کا ذکر ہے

پھر نظام الدین اولیاء کی طرف مخاطب ہوکر فرماتے ہیں کہ ترغیب تمھاری کمالیت کے واسطے ہے کیونکہ پیر کو

چاہئے کہ وہ مرید کو اس وقت تک نہ چھوڑے جب تک اسے تمام آلائشوں سے پاک نہ کردے

مجلس بستم و مجلس بست یکم میں عشرہ مبشرہ کی فضیلت بیان کی ہے عاشورہ کے مختصر واقعات

بیان کرنے کے بعد ان دنوں میں کی جانے والی عبادت اور اسکے طریقے کا ذکر کیا ہے نیز اسکی اہمیت

کا ذکر ہے[5]

۱۔ راحت القلوب قلمی ۴۸
۲۔ ایضاً " ۴۹
۳۔ ایضاً " ۵۳ - ۵۶
۴۔ ایضاً " ۶۰
۵۔ ایضاً " ۶۳ - ۶۴

مجلس بست دوم میں ماہ صفر میں نازل ہونے والی بلاؤں اور پھر ان بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لئے دعاؤں کا ذکر ہے پھر مختلف واقعات کا بیان ہے جو اس ماہ میں رونما ہوئے ع[۱]

مجلس بست سوم میں مجاہدہ کا ذکر ہے پھر مختلف بزرگان دین مثلاً بایزید بسطامی خواجہ یوسف چشتی، شاہ شجاع کرمانی، ذوالنون مصری وغیرہ کے مجاہدوں کا ذکر کرنے کے بعد خود اپنے متعلق فرماتے ہیں:-

"سی سال دعاگو در عالم مجاہدہ بود نہ روز دانستم نہ شب ایستادہ چون بوقت نماز در آمدی نمازی گزاردم باز در عالم مشغول شدم" ع[۲]

مجلس بست چہارم میں نظام الدین اولیا کے خلعت خاص پانے اور ولایت ہند انکے سپرد کئے جانے کا ذکر ہے شیخ فریدالدین گنجشکر فرماتے ہیں کہ مجھے یہ چیزیں صرف اس وجہ سے دے رہا ہوں کہ تم میری وفات کے وقت موجود نہیں رہو گے۔ پھر حضور صلعم کی وفات کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"از برای کسی کہ جملہ عالم آفریدہ و مملکت خود بروی او آشکارا کرد او را از میان عالم بردند من و تو کیستم کہ دم حیات زنیم پس ما نیز خود را درمیان رفتگان دانیم ما زاد و راحلہ را تدبیر کنیم و در غفلت گفتگو نہ پردازیم باشد کہ فردای قیامت شرمندہ نیارم" ع[۳]

ع۱ راحت القلوب قلمی ۶۷-۶۸

ع۲ الفاً " ۷۲

ع۳ الفاً " ۷۳

شیخ فرید الدین گنجشکر سے منسوب مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ کچھ اور بھی رسالے

منسوب ہیں جسکی صحت مشکوک ہے ۔ ذیل میں ان کتابوں کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے ۔

گنج اسرار :- یہ رسالہ سولہ [16] اوراق پر مشتمل ہے ابتدا یہ ہے ۔

"این رسالہ در بیان شرح معرفت دل و ماہیت آن در قلم آوردہ"

رسالہ طالبان راہ سلوک کی تربیت کے لئے لکھا گیا ہے اور چار فصلوں پر مشتمل ہے

اول :- در معرفت صنع دل دوم :- در پاس انفاس سوم شرح ماہیت دل اور

چہارم در اظہار وحدانیت و آفرینش مہتر آدم صلوات اللہ علیہ اسکے فصل دوم میں ذکر خفی

اور ذکر جلی کی تعلیم دی گئی ہے اور طاعت ظاہر اور طاعت باطن کے فرق کو بھی واضح

کیا گیا ہے ۔

رسالہ تحفہ :- یہ رسالہ کچھ فرق کے ساتھ مختلف ناموں سے مختلف

کتب خانوں میں موجود ہے مجموعہ در تصوف کے نام سے جو نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں

ہے اسکی ابتدا اس طرح ہوتی ہے

"این رسالہ .... در معالجہ سلوک و مواعظ اہل سلوک بدان

اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین کہ حکایات حکماء و کفایات بلغاء و صلحاء رحمۃ اللہ علیہم

جمیع بسیار و بے شمار اما اصول کلمات در تصانیف مولفات بیشتر مکتوبست

جمع کردہ شد"

یہ کتاب بیس فصلوں پر مشتمل ہے اس میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ہر فصل میں چار چیزوں کے فوائد یا چار چیزوں کے نقصانات بیان کئے گئے ہیں مثلاً ابتدا میں ہے چهار چیز مردم را به چهار چیز رساند زہد سوی تقوی قناعت سوی غنا صبر سوی محبوب کوشش سوی مطلوب یا چهار چیز تن را ضعیف کند یعنی یکی کثرت مباشرۃ دوم غم بسیار سوم خوردن آب نہار چہارم خوردن ترشی بسیار وغیرہ وغیرہ آخر میں یہ دو ابیات ہیں۔

منم مشتاق آں رویم کہ ہر دم یاد می آید اگر ویرانی بینم دلم فریاد می آید

صحبت یاران بد عزیز حاصل دار البقا است بلکہ دم دیدار دوست ہر دو جہاں را بہا الست

رسالہ بندگی

کتب خانہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ مخطوطات میں اسی انداز کا ایک رسالہ "بندگی" کے نام سے موجود ہے رسالہ بندگی کی ابتدا میں تو وہی چار کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال میں موجود رسالہ مجموعہ تصوف اور رسالہ تحفہ کے سلسلے میں عرض کیا گیا لیکن فصل چہاردہم کے بعد وہ ترتیب باقی نہیں رہتی بلکہ اسکے بعد پانچ آٹھ، دس باتوں کی اچھائیوں یا برائیوں کا ذکر ہے مثلاً فصل پانزدہم میں ہے

گفتہ اند کہ ہفت چیز از ہفت کس نیکوست یکی شرم نیکوست از زنان نیکوتر

دوم توبہ نیکوست اما از جوانان نیکوتر سوم زہد نیکوست اما از عالمان نیکوتر

چہارم سخاوت نیکوست اما از توانگران نیکوتر پنجم ضیافت نیکوست اما از خوبرویان

نیکوتر ششم وفا نیکوست اما از دوستان نیکوتر ہفتم عدل نیکوست اما از شاہان نیکوتر

پھر فرماتے ہیں "گفتہ اند" ہر زنی را کہ شرم نیست چون دیگی است کہ درون نمک نیست

و ہر جوانی را کہ توبہ نیست چون درختیست کہ در وی ثمر نیست و ہر توانگریرا کہ

سخاوت نیست چون جوئیست کہ اندرون او آب نیست و ہر خوبروئی را کہ ضیافت

نیست چون صورتیست کہ اندرون او جان نیست و ہر سلطانیرا کہ عدل نیست چون

ابریست کہ در وی باران نیست" - یہ رسالہ اسی قسم کی بیس فصلوں پر مشتمل ہے -

رسالہ وجودیہ :— اس رسالہ کی ابتدا میں حضرت علی کا یہ قول

درج ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" (جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا تو یا اس نے

اپنے رب کو پہچان لیا) پھر انسانی وجود کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان کو

چار عناصر مٹی، ہوا، آگ اور پانی سے پیدا کیا - اسکے بعد یہ بتانے کی کوشش

کی گئی ہے کہ انسانی جسم ایک کائنات کے مانند ہے جس طرح کائنات میں بہت ساری

چیزیں ہیں اسی طرح انسانی جسم بھی بہت ساری چیزوں کا مجموعہ ہے بلکہ یہ

کائنات اصغر ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب رسالہ وجودیہ عشقیہ کے باب دوم میں بھی بالکل یہی باتیں ملتی ہیں کچھ فرق ضرور ہے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی سے منسوب رسالہ وجودیہ عشقیہ کے باب دوم میں کچھ اضافے کے بعد اسے خواجہ فریدالدین گنج شکر کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے انسانی جسم اور کائنات کی مماثلت کے سلسلے میں جو باتیں بتائی گئی ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

جس طرح خدا نے سات بروج بنائے ہیں بالکل اسی طرح انسان کے وجود میں بھی موجود ہے مثلاً حمل = گوش ثور = گردہ جوزا = دستہا سرطان = پستان اسد = سینہ میزان = ناف عقرب = جگر قوس = ران وغیرہ

جس طرح آسمان میں سات ستارے گردش کرتے ہیں اسی طرح انسانی وجود میں بھی ظاہر ہیں مثلاً دل = خورشید مشتری = جگر قمر = سس زہرہ = گردہ مریخ = سپرز زحل = دماغ اور عطارد = زہرہ

جس طرح سال میں تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں بالکل اسی طرح انسانی جسم میں بھی تین سو ساٹھ گوشت کے ٹکڑے اور اتنی ہی ہڈیاں ہیں نیز جس طرح دنیا میں چار فصلیں ہیں اسی طرح انسانی جسم میں بھی ہیں مثلاً بہار = طفلی

تابستان = جوانی   خزان = پیری   زمستان = کوزہ پشتی

خدا نے اپنی قدرت سے زندہ خاک سے نباتات پیدا کیا اور زندہ نباتات سے حیوان پیدا کئے اور حیوان سے انسان کامل کو پیدا کیا ۔

قاضی حمید الدین ناگوری کی چند تالیفات کا ذکر اصلی آثار کے ضمن میں کیا جا چکا ہے لیکن کچھ ایسی بھی تالیفات ہیں جسے بعد کے کسی عقیدتمند نے لکھ کر انکے نام منسوب کردی ہیں ذیل میں ان تالیفات کا ذکر کیا جا رہا ہے ۔

رسالہ عشقیہ[ع۱] **یا مفتاح الطالب**[ع۲] :— یہ رسالہ اڑتالیس (۴۸) اوراق پر مشتمل ہے اس رسالے میں عشق کی تین قسموں عشق جاودانی، عشق معنوی اور عشق نوری کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں نیز اس سلسلے میں ایسے مباحث پیش کئے گئے ہیں جو صوفیائے کرام کو عزیز ہوتے ہیں اس کتاب میں مختلف جگہوں پر حمید الدین ناگوری کے بہت بعد کے ایک خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (وفات ۷۹۱/ ۱۳۸۸) کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں مثلاً :

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را   (ورق ۲۳)

ع۱ مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
ع۲ مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق (ورق ۴۴)

برو از خانہ گردوں بدر و نان مطلب کین سیہ کاسہ بآخر بکشد مہماں را
(ورق ۸۵)

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما
(ورق ۱۶۶) ع۱

مکتوبات قاضی حمید الدین ناگوری[ع۲] : یہ سات اوراق پر مشتمل ہے کرم خوردہ ہے پڑھنے میں خاصی دقت ہوتی ہے اسکے جعلی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس خط میں قاضی حمید الدین ناگوری کے بہت بعد کے ایک مشہور صوفی بزرگ سید محمد گیسو دراز (وفات ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء) کے اقوال بھی درج ہیں ذیل میں اس خط کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے جسے بقول مؤلف نور محمد فرید کی فرمائش پر لکھا گیا ہے اس خط میں تمہید کے بعد فقر کے متعلق حدیث درج ہے ایسے بھی اقوال ہیں جن کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ یہ حدیث نہیں مثلاً "الفقر فخری"[ع۳] پھر فرماتے ہیں کہ حضور صلعم نے امت کو فقراء اور مساکین سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے کیونکہ وہ قیامت کے دن مقرب بارگاہ خداوندی اور امت کے لئے مددگار ہونگے۔ پھر دغدغہ نفس اور وسوسہ شیطانی سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ارشاد خداوندی اور حدیث کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

ع۱ رسالہ عشقیہ قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری
ع۲ مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ
ع۳ [illegible] موضوع احادیث کی پہچان ص ۱۰۲

حضور صلعم بھی ہمیشہ نفس کی بدی سے پناہ مانگتے رہتے تھے جب کبھی وہ جہاد سے

واپس آتے تو فرماتے " میں چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آیا -

کیونکہ نفس سے جہاد بڑا جہاد ہے اس سلسلے میں ایک شعر بھی درج ہے -

گرت مار سیہ در آستین است ٭ از نفسے کہ با تو ہمنشین است

شیطانی شر سے محفوظ رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تک کسی کا دل روشن نہیں

ہوگا اسکو وسوسہ شیطانی سے واقفیت نہ ہوگی - حضور سے کسی نے سوال کیا کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ

دل میں اسلام کا نور ہے تو آپ نے فرمایا " فریبی دنیا سے دور ہونے، سرای سرمدی کی طرف

رجوع کرنے، اور موت سے قبل موت کو یاد کرنے سے" خدا کو ہر وقت یاد کرتے رہنے کی

تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ "تم نے دنیا میں مجھ کو فراموش کر دیا تو آج

میں نے تم کو فراموش کر دیا"۔ اس لئے خدا کو ہر وقت یاد کرتے رہنا چاہئے -

مکتوب دوم

مکتوب دوم شیخ میراں جیو کے نام ہے یہ خط نا مکمل ہے ابتدا میں چند سطریں

ہیں جس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ خط میں کیا بیان کرنا چاہتے ہیں آخر کا یہ جملہ غور

طلب ہے - "کاغذ تمام شد و خیال باقی است"۔

کتابیات

(١) اخبار الاخیار - شیخ عبدالحق محدث دہلوی کتب خانہ رحیمیہ دیوبند ١٣٣٢ھ

(٢) آداب الحرب والشجاعۃ - فخر مدبر مبارکشاہ لاہور ١٣٤٦ شمسی

(٣) اسرار الاولیا ملفوظات شیخ فریدالدین گنجشکر نولکشور کانپور ١٩٢٧ء

(٤) اعمال متفرقہ از رسالہ انیس الفقراء - معین الدین چشتی قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(٥) انوار العارفین حافظ محمد حسن نولکشور لکھنؤ ١٨٧٦ء

(٦) انیس الارواح ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی نولکشور لکھنؤ ١٨٩٠ء

(٧) آئین اکبری شیخ ابوالفضل نولکشور لکھنؤ ١٨٨٢ء

(٨) بحر الحقائق خواجہ معین الدین چشتی قلمی مملوکہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند

(٩) تاریخ فخرالدین مبارکشاہ - اڈیٹر ایڈورڈ ڈینیسن روس رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ١٩٢٧ء

(١٠) تاریخ فرشتہ ملا محمد قاسم ہندوشاہ نولکشور (ب ت)

(١١) تاریخ فیروز شاہی - ضیاء الدین برنی بتصحیح عبدالرشید شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ١٩٥٧ء

(١٢) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار - نواب صدیق حسن خاں قنوجی (ب ت)

(۱۳) جوامع الحکایات ۔ سدیدالدین محمد عوفی بتصحیح دکتر امیر بانو مصفا و دکتر مظاہر مصفا انتشارات بنیاد فرہنگ ایران تہران ۱۳۵۳ شمسی

(۱۴) چچ نامہ ۔ علی بن حامد کوفی بتصحیح اقل العباد عمر بن محمد داؤد پوتہ مطبعہ لطیفی دہلی ۱۹۳۹ء

(۱۵) خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور لاہوری نولکشور کانپور ۱۹۱۴ء

(۱۶) خیر المجالس ملفوظات نصیرالدین چراغ دہلی بتصحیح خلیق احمد نظامی شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (ب ت)

(۱۷) دلیل العارفین ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی نولکشور لکھنو ۱۸۹۰ء

(۱۸) دیوان غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی بنگرانی مسلم احمد نظامی خواجہ پریس دہلی (ب ت)

(۱۹) دیوان معین الدین خواجہ معین الدین چشتی قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۲۰) راحت القلوب ملفوظات شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی " "

(۲۱) رسالہ اصول الطریقہ شیخ حمید الدین ناگوری قلمی " "

(۲۲) رسالہ بندگی شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی " "

(۲۳) رسالہ تحفہ شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

(۲۴) رسالہ حمید الدین ناگوری قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۲۵) رسالہ در بیان ارواح خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(۲۶) رسالہ در بیان رگہا کہ در وجود آدمی است ۔ خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(۲۷) رسالہ در وجود آدمی ۔ خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(٢٨)	رسالہ عشقیہ	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(٢٩)	رسالہ فی السماع	شیخ حمید الدین ناگوری	قلمی	" "
(٣٠)	رسالہ معرفت کسب نفس	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	" "
(٣١)	رسالہ وجودیہ	شیخ فرید الدین گنجشکر	قلمی	" "
(٣٢)	رسالہ وجودیہ عشقیہ	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	" "
(٣٣)	روضۃ اقطاب	محمد بلاق بن شیخ احمد خالدی	قلمی	" "
(٣٤)	ریاض النور	اجیر الدین محمد	مطبع نظامی	کانپور ١٢٩٨ھ
(٣٥)	سرور الصدور	شیخ حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(٣٦)	سفینۃ الاولیا	محمد دارا شکوہ	مطبع مدرسہ آگرہ	١٨٥٣ء
(٣٧)	سلسلہ عالیہ	عنایت حسین	مطبع فیض	میرٹھ (ب ت)
(٣٨)	سیر الاقطاب	حضرت الہدایہ چشتی	نولکشور	لکھنو ١٩١٣ء
(٣٩)	سیر الاولیا	سید بن مبارک علوی کرمانی	مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان	لاہور ١٩٧٨ء
(٤٠)	سیر العارفین	جمالی دہلوی	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(٤١)	شجرۃ الانوار یہ فخریہ	رحیم بخش	قلمی	" "
(٤٢)	شرح اربعین	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	" "

(۴۳) طبقات اکبری — خواجہ نظام الدین احمد بتصحیح بی۔ ڈے — ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۲۷ء

(۴۴) طبقات ناصری — منہاج الدین جوزجانی بتصحیح کپتان ولیم ناکولس — کالج پریس ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۶۴ء

(۴۵) طوالع الشموس — قاضی حمید الدین ناگوری — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۴۶) فتوح السلاطین — مولانا عصامی بتصحیح ڈاکٹر آغا مہدی حسن — ایجوکیشنل پریس آگرہ ۱۹۳۸ء

(۴۷) فوائد السالکین — ملفوظات شیخ قطب الدین بختیار کاکی — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۴۸) فوائد الفواد — ملفوظات شیخ نظام الدین اولیا — نولکشور — لکھنو ۱۹۰۸ء

(۴۹) کرامات اولیا — نظام الدین احمد — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۵۰) گنج اسرار — شیخ فرید الدین گنج شکر — قلمی — " "

(۵۱) گنج تواریخ — عبد الغفور خان — نولکشور — اودھ ۱۸۷۵ء

(۵۲) مجالس العشاق — تسلیم سہسوانی — نولکشور — ۱۸۷۰ء

(۵۳) مجموعہ در تصوف — شیخ فرید الدین گنج شکر — قلمی — مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

(۵۴) مراۃ الاسرار — عبد الرحمن بن عبد الرسول — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۵۵) مراتب راہ شریعت — شیخ حمید الدین ناگوری — قلمی — " "

(۵۶) مفتاح التواریخ — منشی دالنتو رای سلیم — نولکشور — کانپور ۱۸۶۷ء

(۵۷) مکتوبات شیخ حمید الدین ناگوری — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۵۸)	مکتوبات	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال	
(۵۹)	مکتوبات	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی	
(۶۰)	منتخب التواریخ	عبد القادر بدایونی بتصحیح احمد علی	کالج پریس	کلکتہ	۱۸۶۹ء
(۶۱)	مونس الارواح	جہاں آرا بیگم	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی	
(۶۲)	نسخہ فردوسیہ	مجہول المولف	قلمی	"	"
(۶۳)	نفحات الانس من حضرات القدس	مولانا عبد الرحمن جامی باہتمام ولیم ناسولیس	مطبع لیسی	کلکتہ	۱۸۵۸ء

کتب عربی

(۶۴)	نزہۃ الخواطر	عبد الحی بن فخر الدین الحسنی	دائرۃ المعارف العثمانیہ	حیدرآباد	۱۹۴۷ء

کتب اردو

(۶۵)	آب کوثر	شیخ محمد اکرام	ادارہ ثقافت اسلامیہ	لاہور	۱۹۸۲ء
(۶۶)	ادب نامہ ایران	مرزا مقبول بیگ بدخشانی	یونیورسٹی بک ایجنسی اتحاد پریس	لاہور	(ب ت)
(۶۷)	بزم صوفیہ	صباح الدین عبد الرحمن	دار المصنفین	اعظم گڑھ	۱۹۷۱ء
(۶۸)	بزم مملوکیہ	صباح الدین عبد الرحمن	مطبع معارف	اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء
(۶۹)	تاریخ اولیاء	محسن فاروقی	آستانہ بک ڈپو	دہلی	۱۹۵۵ء
(۷۰)	تاریخ دعوت و عزیمت	سید ابو الحسن علی ندوی	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام	لکھنؤ	۱۹۷۲ء

(۷۱) تاریخ مشائخ چشت — خلیق احمد نظامی — ندوۃ المصنفین — دہلی ۱۹۵۳ء

(۷۲) تذکرہ اولیای ہند و پاک — ولی حسن ٹونکی — عثمانیہ بک ڈپو — حیدرآباد (ب ت)

(۷۳) تذکرہ صوفیای سندھ — اعجاز الحق قدسی — اردو اکیڈمی — کراچی

(۷۴) تذکرہ مشائخ (قدیم) — اسلام الحق — اسلامی دار المطالعہ — سہارنپور ۱۳۹۸ھ

(۷۵) سفرنامہ ابن بطوطہ — مترجم رئیس احمد جعفری — نفیس اکیڈمی — کراچی ۱۹۶۱ء

(۷۶) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات — خلیق احمد نظامی — ادارہ ادبیات — دہلی ۱۹۸۱ء

(۷۷) عدد السنین والحساب — محمد ابرار حسن فاروقی — مسلم ایجوکیشنل پریس — علیگڑھ (ب ت)

(۷۸) عوارف المعارف۔ شیخ شہاب الدین سہروردی — مترجم سید رشید احمد — شیخ غلام علی اینڈ پبلشرز — لاہور ۱۹۶۴ء

(۷۹) فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان۔ مسعود عالم قاسمی — مرکزی مکتبہ اسلامی — دہلی ۱۹۸۷ء

(۸۰) مراۃ الانساب — ضیاء الدین احمد علوی — مطبع رحیمی — جیسور ۱۹۱۷ء

(۸۱) مسالک السالکین — محمد عبد الستار سہرامی — مفید عام پریس — آگرہ (ب ت)

(۸۲) تعین الارواح — خادم حسن زبیری — اخبار برقی پریس — آگرہ (ب ت)

کتب انگریزی

(83) K. A. Nizami — Life and time of Shaikh Farideuddin Ganga Shakr, Aligarh

(84) Mohammad Habib — Politics and Society during the Early Medieval Period Ed by K. A. Nizami, Peoples Publishing House, New Delhi. 1974

(85) Mumtaz Ali Khan, Some important Persian Prose writings of the Thirteenth Century A.D in India, Aligarh 1970

۳۷۵

(86) Syed Athar Abbas Rizvi History of Sufism in India
Munshi Ram Manoharlal Publishers N. Delhi - 1978

کتابیات

(۱) اخبار الاخیار۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کتب خانہ رحیمیہ دیوبند ۱۳۳۲ھ

(۲) آداب الحرب والشجاعہ۔ فخر مدبر مبارکشاہ لاہور ۱۳۴۶ شمسی

(۳) اسرار الاولیا ملفوظات شیخ فریدالدین گنجشکر نولکشور کانپور ۱۹۱۷ء

(۴) اعمال متفرقہ از رسالہ پاس انفاس۔ معین الدین چشتی قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۵) انوار العارفین حافظ محمد حسن نولکشور لکھنو ۱۸۷۶ء

(۶) انیس الارواح ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی نولکشور لکھنو ۱۸۹۰ء

(۷) آئین اکبری شیخ ابوالفضل نولکشور لکھنو ۱۸۸۲ء

(۸) بحر الحقائق خواجہ معین الدین چشتی قلمی مملوکہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند

(۹) تاریخ فخرالدین مبارکشاہ۔ اقل العباد ادورد ڈینیسون روس رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۲۷ء

(۱۰) تاریخ فرشتہ ملا محمد قاسم ہندوشاہ نولکشور (ب ت)

(۱۱) تاریخ فیروز شاہی۔ ضیاء الدین برنی بتصحیح عبدالرشید شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۱۹۵۷ء

(۱۲) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار۔ نواب صدیق حسن خان قنوجی (ب ت)

(۱۳) جوامع الحکایات ۔ سدیدالدین محمد عوفی بتصحیح دکتر امیر بانو مصفا و دکتر مظاہر مصفا انتشارات بنیاد فرہنگ ایران تہران ۱۳۵۳ شمسی

(۱۴) چچ نامہ ۔ علی بن حامد کوفی بتصحیح اقل العباد عمر بن محمد داؤد پوتہ مطبعہ لطیفی دہلی ۱۹۳۹ء

(۱۵) خزینۃ الاصفیا مفتی غلام سرور لاہوری نولکشور کانپور ۱۹۱۴ء

(۱۶) خیر المجالس ملفوظات نصیر الدین چراغ دہلی بتصحیح خلیق احمد نظامی شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (ب ت)

(۱۷) دلیل العارفین ملفوظات خواجہ معین الدین چشتی نولکشور لکھنو ۱۸۹۰ء

(۱۸) دیوان غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی بنگرانی مسلم احمد نظامی خواجہ پریس دہلی (ب ت)

(۱۹) دیوان معین الدین خواجہ معین الدین چشتی قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۲۰) راحت القلوب ملفوظات شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی " "

(۲۱) رسالہ اصول الطریقہ شیخ حمید الدین ناگوری قلمی " "

(۲۲) رسالہ بندگی شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی " "

(۲۳) رسالہ تحفہ شیخ فرید الدین گنجشکر قلمی مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

(۲۴) رسالہ حمید الدین ناگوری قلمی مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۲۵) رسالہ در بیان ارواح خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(۲۶) رسالہ در بیان رگہا کہ در وجود آدمی است ۔ خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(۲۷) رسالہ در وجود آدمی ۔ خواجہ معین الدین چشتی قلمی " "

(۲۸)	رسالہ عشقیہ	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(۲۹)	رسالہ فی السماع	شیخ حمید الدین ناگوری	قلمی	" "
(۳۰)	رسالہ معرفت کسب نفس	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	" "
(۳۱)	رسالہ وجودیہ	شیخ فرید الدین گنجشکر	قلمی	" "
(۳۲)	رسالہ وجودیہ عشقیہ	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	" "
(۳۳)	روضۃ الاقطاب	محمد بلاق بن شیخ احمد خالدی	قلمی	" "
(۳۴)	ریاض النور	اجیر الدین محمد	مطبع نظامی	کانپور ۱۲۹۸ھ
(۳۵)	سرور الصدور	شیخ حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(۳۶)	سفینۃ الاولیا	محمد دارا شکوہ	مطبع مدرسہ آگرہ	۱۸۵۳ء
(۳۷)	سلسلہ عالیہ	عنایت حسین	مطبع فیض	میرٹھ (ب ت)
(۳۸)	سیر الاقطاب	حضرت الہدایہ چشتی	نولکشور	لکھنو ۱۹۱۳ء
(۳۹)	سیر الاولیا	سید بن مبارک علوی کرمانی	مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان	لاہور ۱۹۷۸ء
(۴۰)	سیر العارفین	جمالی دہلوی	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی
(۴۱)	شجرۃ الانواریہ فخریہ	رحیم بخش	قلمی	" "
(۴۲)	شرح اربعین	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	" "

(٤٣) طبقات اکبری — خواجہ نظام الدین احمد بتصحیح بی۔ ڈے — ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۲۷ء

(٤٤) طبقات ناصری — منہاج الدین جوزجانی بتصحیح کپتان ولیم ناسولس کالج پریس ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۶۴ء

(٤٥) طوالع الشموس — قاضی حمید الدین ناگوری — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(٤٦) فتوح السلاطین — مولانا عصامی بتصحیح ڈاکٹر آغا مہدی حسن — ایجوکیشنل پریس آگرہ ۱۹۳۸ء

(٤٧) فوائد السالکین — ملفوظات شیخ قطب الدین بختیار کاکی — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(٤٨) فوائد الفواد — ملفوظات شیخ نظام الدین اولیا — نولکشور — لکھنو ۱۹۰۸ء

(٤٩) کرامات اولیا — نظام الدین احمد — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(٥٠) گنج اسرار — شیخ فرید الدین گنجشکر — قلمی — " "

(٥١) گنج تواریخ — عبد الغفور خان — نولکشور — اودھ ۱۸۷۵ء

(٥٢) مجالس العشاق — تسلیم سہسوانی — نولکشور — ۱۸۷۰ء

(٥٣) مجموعہ در تصوف — شیخ فرید الدین گنجشکر — قلمی — مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

(٥٤) مراۃ الاسرار — عبد الرحمن بن عبد الرسول — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(٥٥) مراتب راہ شریعت — شیخ حمید الدین ناگوری — قلمی — " "

(٥٦) مفتاح التواریخ — منشی دالنتو رای سلیم — نولکشور — کانپور ۱۸۶۷ء

(٥٧) مکتوبات شیخ حمید الدین ناگوری — قلمی — مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی

(۵۸)	مکتوبات	قاضی حمید الدین ناگوری	قلمی	مملوکہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال	
(۵۹)	مکتوبات	خواجہ معین الدین چشتی	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی	
(۶۰)	منتخب التواریخ	عبد القادر بدایونی بتصحیح احمد علی	کالج پریس	کلکتہ	۱۸۶۹ء
(۶۱)	مونس الارواح	جہاں آرا بیگم	قلمی	مملوکہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی	
(۶۲)	نسخہ فردوسیہ	مجہول المؤلف	قلمی	"	"
(۶۳)	نفحات الانس من حضرات القدس	مولانا عبد الرحمن جامی باہتمام ولیم ناسولیس	مطبع لیسی	کلکتہ	۱۸۵۸ء

کتب عربی

(۶۴)	نزہۃ الخواطر	عبد الحی بن فخر الدین الحسنی	دائرۃ المعارف العثمانیہ	حیدرآباد	۱۹۴۷ء

کتب اردو

(۶۵)	آب کوثر	شیخ محمد اکرام	ادارہ ثقافت اسلامیہ	لاہور	۱۹۸۲ء
(۶۶)	ادب نامۂ ایران	مرزا مقبول بیگ بدخشانی	یونیورسٹی بک ایجنسی اتحاد پریس	لاہور	(ب ت)
(۶۷)	بزم صوفیہ	صباح الدین عبد الرحمن	دار المصنفین	اعظم گڑھ	۱۹۷۱ء
(۶۸)	بزم مملوکیہ	صباح الدین عبد الرحمن	مطبع معارف	اعظم گڑھ	۱۹۸۱ء
(۶۹)	تاریخ اولیاء	محسن فاروقی	آستانہ بک ڈپو	دہلی	۱۹۵۵ء
(۷۰)	تاریخ دعوت و عزیمت	سید ابو الحسن علی ندوی	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام	لکھنؤ	۱۹۷۲ء

(۷۱) تاریخ مشائخ چشت — خلیق احمد نظامی — ندوۃ المصنفین — دہلی ۱۹۵۳ء

(۷۲) تذکرہ اولیائے ہند و پاک — ولی حسن ٹونکی — عثمانیہ بک ڈپو — حیدرآباد (ب ت)

(۷۳) تذکرہ صوفیائے سندھ — اعجاز الحق قدسی — اردو اکیڈمی — کراچی

(۷۴) تذکرہ مشائخ (قدیم) — اسلام الحق — اسلامی دار المطالعہ — سہارنپور ۱۳۹۸ھ

(۷۵) سفرنامہ ابن بطوطہ — مترجم رئیس احمد جعفری — نفیس اکیڈمی — کراچی ۱۹۶۱ء

(۷۶) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات — خلیق احمد نظامی — ادارہ ادبیات دہلی — ۱۹۸۱ء

(۷۷) عدد السنین والحساب — محمد ابرار حسن فاروقی — مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڑھ (ب ت)

(۷۸) عوارف المعارف۔ شیخ شہاب الدین سہروردی مترجم سید رشید احمد — شیخ غلام علی اینڈ پبلیشرز لاہور ۱۹۶۲ء

(۷۹) فتنۂ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان۔ مسعود عالم قاسمی — مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۷ء

(۸۰) مراۃ الانساب — ضیاء الدین احمد علوی — مطبع رحیمی — جیسور ۱۹۱۷ء

(۸۱) مسالک السالکین — محمد عبد الستار سہرامی — مفید عام پریس — آگرہ (ب ت)

(۸۲) تعین الارواح — خادم حسن زبیری — اخبار برقی پریس — آگرہ (ب ت)

کتب انگریزی

(83) K. A. Nizami Life and time of Shaikh Farideddin Ganje Shakr Aligarh

(84) Mohammad Habib – Politics and Society during the Early Medieval Period Ed by K. A. Nizami Peoples Publishing House, New Delhi. 1974

(85) Mumtaz Ali Khan, Some important Persian Prose writings of the Thirteenth Century A.D in India Aligarh 1970

۳۷۵

(86) Syed Athar Abbas Rizvi History of Sufism in India
Munshi Ram Manoharlal Publishers N. Delhi - 1978